سرما/بہار ۱۹۹۴ ۱۵

آج

ترتیب: اجمل کمال

خصوصی شمارہ: فارسی کہانیاں

صادق ہدایت — بابا مقدم — بزرگ علوی — جلال آلِ احمد
غلام حسین ساعدی — جمال میر صادقی — غلام حسین نظری
اسماعیل فصیح — فریدون تنکابنی — سیمین دانشور — ابراہیم گلستان
نادر ابراہیمی — محسن دامادی — محمود دولت آبادی
نسیم خاکسار — امین فقیری — منیرو روانی پور — فریدہ رازی

آج کی کتابیں

Scanned with CamScanner

آج

جنوری - جون ۱۹۹۳

مینیجنگ ایڈیٹر

زینت حسام

اہتمام

آج کی کتابیں

بی ۱۳۰، سیکٹر ۱۱ بی، نارتھ کراچی ٹاؤن شپ، کراچی ۷۵۸۵۰

فون: ۸۱۱۳۳۷۳

طباعت

ایجوکیشنل پریس

پاکستان چوک، کراچی

Scanned with CamScanner

تیئس کہانیوں کے اردو ترجموں پر مشتمل یہ انتخاب جدید فارسی کہانیوں کے لیے مخصوص پہلا شمارہ ہے۔ اس طرح کے چار یا زیادہ شمارے مناسب وقفوں کے ساتھ شائع کیے جائیں گے۔ اس سلسلے کا مقصد اردو میں فارسی کے مختصر فکشن کا ایسا انتخاب تیار کرنا ہے جسے کسی حد تک نمائندہ کہا جا سکے۔

فارسی زبان میں مختصر افسانے کی صنف کا آغاز بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں ہوا تھا۔ اس وقت سے لے کر اب تک اس صنف نے نمایاں ترقی کی ہے اور عمدہ کہانیوں کا ایک قابلِ قدر ذخیرہ عالمی ادب میں ایران کی باوقار نمائندگی کے لیے موجود ہے۔ مختصر افسانے کا ارتقا فارسی اور اردو زبانوں میں کم و بیش متوازی خطوط پر ہوا ہے اور ان کہانیوں کے بہت سے عناصر ۔۔اور ان میں جھلکتے ہوئے ایرانی معاشرے کے خدوخال بھی۔۔ اردو فکشن کے پڑھنے والوں کو مانوس محسوس ہوں گے۔ تاہم ان کہانیوں کے کرداروں اور واقعات کی جڑیں ایرانی عوام کے منفرد تجربات میں بہت گہری ہیں جنھوں نے ایرانی فکشن کو ایک مخصوص رنگ اور خوشبو عطا کی ہے۔ ایک نمایاں اور معنی خیز فرق یہ بھی ہے کہ ہمارے معاشرے کے برخلاف ایرانی معاشرے میں ادب اور ادیبوں کا کردار بہت اہم رہا ہے، اور یہ فرق ایرانی ادیبوں کے گہرے کمٹ منٹ کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔

اس انتخاب میں اٹھارہ ایرانی ادیبوں کی لکھی ہوئی کہانیاں شامل کی گئی ہیں۔ ان میں سے کئی ادیب، مثلاً صادق ہدایت، بزرگ علوی، جلال آلِ احمد، غلام حسین ساعدی، سیمین دانشور وغیرہ، تفصیلی مطالعے کے مستحق ہیں اور یہ مطالعہ ہمارے منصوبے میں شامل ہے۔ بہت سے اہم ادیب، کئی محدودات کے باعث، موجودہ شمارے میں شامل نہیں کیے جا سکے۔ انقلاب کے بعد اُبھرنے والے ادیبوں پر بھی موجودہ شمارے میں زیادہ توجہ نہیں دی جا سکی۔ ہم اس سلسلے کے آئندہ خصوصی شماروں میں اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کریں گے۔

اس شمارے کی ترتیب کے دوران فارسی کہانیوں کے متن اور دوسری متعلقہ مطبوعات کی فراہمی میں خاصی دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ ڈاکٹر محمد عمر میمن، ڈاکٹر یونس حسنی، رفیق احمد نقش، محمد اطہر مسعود، سروش عرفانی، مظفر علی سید، محمد مہدی خرمی، پروفیسر مائیکل ہلمن، اور سب سے بڑھ کر پروفیسر چودھری محمد نعیم کا پُرخلوص تعاون اس سلسلے میں بہت کارآمد ثابت ہوا۔

اس شمارے کا بہترین حصہ منفرد افسانہ نگار اور اردو اور فارسی کے عالم جناب نیر مسعود کے کیے ہوئے آٹھ ترجموں پر مشتمل ہے۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں سے گہری واقفیت، لفظوں اور ان کے تہ در تہ معانی کا تخلیقی احساس اور افسانے کے فن پر غیر معمولی گرفت، ان خصوصیات کی یکجائی نے ان ترجموں کو نہایت کامیاب بنا دیا ہے۔ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ فارسی کہانیوں کے اس سے بہتر ترجمے اردو زبان میں اس سے پہلے نہیں ہوئے، اور ان ترجموں کو شائع کرنا "آج" کے لیے بڑا اعزاز ہے۔ فارسی کہانی کے بارے میں نیر صاحب کا مختصر تعارفی مضمون بھی اس شمارے میں شامل ہے جس سے آپ کو ان کہانیوں کے مطالعے کے لیے ایک تناظر فراہم ہو سکے گا۔ صادق ہدایت کی منتخب کہانیوں کے ترجمے بذلِ حق محمود صاحب نے کیے تھے۔ ان ترجموں کا مجموعہ "سگ آوارہ" اب دستیاب نہیں ہے۔ ہم نے ان کے کیے ہوئے عمدہ ترجموں میں سے دو موجودہ شمارے میں شامل کیے ہیں۔

میرے اپنے کیے ہوئے ترجموں کے سلسلے میں ایک وضاحت ضروری ہے۔ یہ ترجمے اگرچہ اصل فارسی متن کو بنیاد بنا کر کیے گئے ہیں، تاہم ان کے انگریزی ترجموں کو بھی پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ فارسی زبان سے کافی واقفیت نہ رکھنے کے باعث میں نے ایسی کسی کہانی پر طبع آزمائی کی جرأت نہیں کی جس کا انگریزی ترجمہ دستیاب نہ ہو۔

اجمل کمال

Scanned with CamScanner

صادق هدایت
(۱۹۰۳-۱۹۵۱)

بزرگ علوی
(پ ۱۹۰۴)

جلال آل احمد
(۱۹۲۳-۱۹۶۹)

غلام حسین ساعدی
(۱۹۳۵-۱۹۸۵)

جمال میرصادقی
(پ ۱۹۳۳)

سیمین دانشور
(پ ۱۹۲۱)

نادر ابراهیمی
(پ ۱۹۳۶)

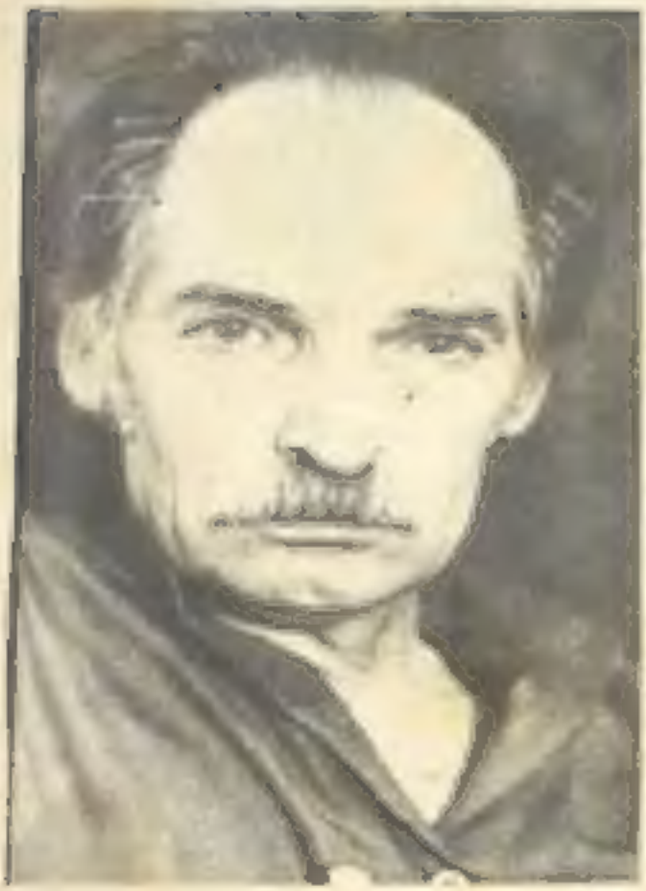

محمود دولت آبادی
(پ ۱۹۴۰)

منیرو روانی پور
(پ ۱۹۵۴)

ترتیب

صادق ہدایت

۹

سگِ آوارہ

۱۶

داشِ آکل

بابا مقدم

۲۷

مُردہ سانپ

بزرگ علوی

۳۸

سیسے کا سپاہی

۵۲

میرزا

جلال آلِ احمد

۷۵

جشنِ مسرت

Scanned with CamScanner

غلام حسین ساعدی
۸۹
رونے والی

۱۰۴
عزادارانِ بیل

جمال میر صادقی
۱۲۰
کنکریٹ کے انباروں کے اِدھر

غلام حسین نظری
۱۲۶
سایہ وش

اسماعیل فصیح
۱۲۹
خواب

۱۳۴
ولادت

۱۴۳
عشق

فریدون تنکابنی
۱۵۵
چم چڑ

سیمین دانشور
۱۶۶
کیدالخائنین

ابراہیم گلستان
۱۸۳
عصمت کا سفر

نادر ابراہیمی
۱۸۸
مقدس یادگار

محسن دامادی
۱۹۹
آقائے ماضی کے عجائب خواب

محمود دولت آبادی
۲۰۹
ادبار

Scanned with CamScanner

نسیم خاکسار

۲۲۲

رُت کا سفر

بین فقیری

۲۲۸

تین اُداس سائی

منیرؔو روانی پور

۲۳۵

لمبی رات

فریدہ رازی

۲۴۴

بلی کا خون

○ ○ ○

نیر مسعود

۲۴۹

فارسی کہانی ایک مختصر تعارف

○ ○ ○

۲۵۳

لکھنے والوں کا تعارف

Scanned with CamScanner

صادق ہدایت

فارسی سے ترجمہ: بدلِ حق محمود

سگِ آوارہ

ورامین کے چوک میں نانبائی، قصاب اور بساطی کی چند دکانیں، ایک حمام اور دو قہوہ خانے تھے۔ ان سے صرف خورد و نوش کا سامان اور روزمرہ کے استعمال کی عام اشیا ہی دستیاب ہو سکتی تھیں۔ چوک کی زمین دھوپ میں تپ رہی تھی اور اس پر بسنے والے لوگ میں جھلس رہے تھے۔ انسان، حیوان، پرندے، سب چلنے پھرنے اور کام کرنے سے معذور تھے اور شام کی ہوا کے پہلے جھونکے اور رات کے سائے کا بے تابی سے انتظار کر رہے تھے۔ آسمان پر ہلکا ہلکا غبار چھایا ہوا تھا اور سڑک پر دھول اڑاتی ہوئی گاڑیوں کی آمد و رفت سے فضا برابر کثیف ہو رہی تھی۔

ایک گوشے میں چنار کا بوڑھا درخت تھا جس کا تنا اندر سے کھوکھلا ہو چکا تھا اور باہر سے گل سڑ رہا تھا، مگر اس کے باوجود وہ اپنی مڑی ہوئی قدیمی شاخیں پھیلائے اپنا توازن برقرار رکھے ہوئے تھا۔ اس کے خاک آلود اور داغ دار پتوں کے سائے میں لکڑی کا ایک پرانا تختہ پڑا تھا۔ اس پر دو نوعمر لڑکے بیٹھے شیر برنج اور کدو بیچ رہے تھے۔ قہوہ خانے کے سامنے ایک گندی نالی تھی جس کا گدلا پانی کوڑے کرکٹ اور غلاظت میں سے بڑی زحمت سے راستا بناتا آہستہ آہستہ بہہ رہا تھا۔

ذرا فاصلے پر ورامین کا مشہور تاریخی برج تھا۔ چوک سے اس کا صرف نیم تنا اور مخروطی سر ہی نظر آتا تھا۔ اس کی کئی اینٹیں اکھڑ چکی تھیں اور درزوں میں چڑیوں نے گھونسلے بنا رکھے تھے۔ وہ بھی اس شدید گرمی میں خاموش بیٹھی اونگھ رہی تھیں۔ چاروں طرف مکمل سکوت طاری تھا۔ صرف کبھی کبھی ایک کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دیتی تھی۔

یہ کتا اسکاٹ ہنڈ کے کتوں کی نسل سے تھا۔ اس کا منہ خاکستری تھا۔ پیروں پر سیاہ داغ

تھے۔ کیچڑ میں دوڑنے پھرنے سے اس پر غلاظت جم گئی تھی۔ بڑے بڑے کان، لمبی دُم، میلے لیکن گھنگھریالے بال اور چمکتی ہوئی سیاہ آنکھیں جو اس کی پشم آلود کھوپڑی میں دھنسی ہوئی تھیں۔ یہ آنکھیں حیرت انگیز طور پر انسانی آنکھوں سے مشابہ تھیں۔ ان میں ایک پُراسرار پیغام تھا جسے سمجھنا مشکل تھا مگر جو اس کی پتلیوں پر گویا نقش ہو کر رہ گیا تھا۔ ان میں محض رنگ اور چمک ہی نہ تھی، کوئی اور شے بھی تھی جو اس چیز کے مانند تھی جو کسی زخمی ہرن کی آنکھوں میں ہوتی ہے۔ یہ آنکھیں انسانی آنکھوں سے مشابہ ہی نہ تھیں، ان کے مساوی بھی تھیں۔ ان میں بھی وہی انسانی روح جھلک رہی تھی، درد و زجر اور خوف و ہراس کی ایک حزن انگیز کیفیت جو بازاری کتے کی آنکھوں اور محروم انسان کی آنکھوں میں مماثلت پیدا کرتی ہے۔

کسی نے اس کی ان غمناک اور ملتجی نگاہوں کا پیغام پڑھنے کی کوشش نہ کی تھی۔ جب وہ نانبائی کی دکان پر جاتا تو نانبائی کا چھوکرا ڈنڈا لے کر اس کے پیچھے پڑ جاتا۔ گوشت کی دکان کا رخ کرتا تو قصاب کا لڑکا اس پر روڑے برساتا۔ جب کبھی وہ کسی موٹر کار کے سائے میں پناہ لیتا تو شوفر کا بھاری بھر کم جوتا اس کی کمر توڑ ڈالتا۔ جب سب لوگ اسے مار مار کر تھک جاتے تو شیر برنج والا اپنی جگہ سے اٹھتا اور اس بے زبان جانور کو آزار پہنچانے میں ایک مخصوص لذت محسوس کرتا۔ وہ بے چارہ اس زد و کوب کی تاب نہ لا کر نالہ بلند کرتا تو کدو والا ایک فلک شگاف قہقہہ لگا کر کہتا: "جی صاحب! بگڑتے کیوں ہو؟ اب بھی تسلی نہیں ہوئی تو لو، یہ اور لو۔"

ان لوگوں کا خیال تھا کہ یہ ظلم و ستم محض خدا کی رضا کے لیے ہے۔ مذہب نے کتے کو نجس قرار دیا تھا، پیغمبر نے اس پر لعنت بھیجی تھی اور اللہ کے یہ نیک بندے اسے ستا کر گویا ثواب دارین حاصل کیا کرتے تھے۔ ابھی ابھی شیر برنج والے کو جو یہ کار ثواب سرانجام دینے کا خیال آیا تو وہ ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گیا اور لاتوں اور پتھروں سے اسے نیم جان کر دیا۔ بے بس جانور نالی پیٹ سونگھتا ہوا اپنے آپ کو اس پکی سڑک کی طرف گھسیٹ کر لے گیا جو برج تک چلی گئی تھی، اور دور کھیتوں کے پاس ایک نالی میں گر کر جان بچائی۔

نالی میں گلی سڑی سبزیوں، کوڑے کرکٹ، پھٹے پرانے نم کشیدہ جوتوں اور ردی اور مردہ کیڑے مکوڑوں کی ملی جلی بو پھیل رہی تھی۔ کتے نے اس غلیظ پانی میں ڈبکی لگا کر سر پیروں پر رکھ لیا اور زبان باہر نکال کر (خواب اور بیداری کی ملی جلی کیفیت میں ان کھیتوں کو تکنے لگا) جو اس کی نیم وا آنکھوں کے سامنے حد نظر تک پھیلے ہوئے تھے۔ وہ اکثر اسی نالی میں پناہ لیا کرتا تھا اور جب بھی ان لہلہاتے ہوئے کھیتوں کو دیکھتا اسے ایک بھولا بسرا زمانہ یاد آ جاتا تھا۔ اس کا جی چاہتا ان کھیتوں میں جا کر اچھلے کودے اور زمین پر لوٹے، مگر اس وقت لوگوں سے پٹنے اور پتھر کھانے کے بعد اس کا انگ انگ دکھ رہا ہوتا اور وہ اپنی یہ خواہش بھی پوری نہ کر سکتا۔

ہاں، اس کتے کی بھی خواہشیں، تمنائیں اور آرزوئیں تھیں۔ مثلاً اسے اپنے مالک کی تلاش تھی جس کے ہاں وہ کبھی رہتا تھا، جس کے گھر کی وہ رکھوالی کرتا تھا، جس کے بچوں کے ساتھ وہ کھیلا کود کرتا تھا، جس کی گاڑی میں بیٹھ کر وہ شام کو سیر کے لیے جایا کرتا تھا، جو اسے وقت پر پیار کرتا تھا، وقت پر غذا دیتا تھا اور وقت پر سلا دیتا تھا۔ لیکن یہ بہت پہلے کا ذکر ہے۔ یہاں ورین میں تو وہ ڈرتے ڈرتے غلاظت کے ڈھیر پر جاتا اور وہاں پھینکی ہوئی ہڈیاں اور سوکھی روٹی کے ٹکڑے ڈھونڈا کرتا۔ دن بھر لوگوں سے مار کھاتا اور بھونکتا رہتا۔ بھونکنا اس کا ہتھیار تھا۔ جب ظلم و تشدد حد سے گزر جاتا تو وہ احتجاج کے طور پر بھونکنے لگتا۔

پہلے وہ تن درست، دلیر اور مہذب تھا، مگر اب خارش زدہ، غلیظ اور ڈرپوک ہو گیا تھا۔ کہیں قریب کوئی پتا سرکتا یا اپنے ہی بھونکنے کی آواز سنائی دیتی تو اس کے بدن پر کپکپی طاری ہو جاتی۔ اس میں اتنی ہمت نہ رہی تھی کہ خود شکار کر کے اپنی خوراک حاصل کرے۔ وہ غلاظت کے ڈھیر پر جانے کا عادی ہو گیا تھا۔ قصاب، نانبائی اور قہوہ خانے والوں سے مایوس ہو کر وہ سیدھا وہیں جاتا بلکہ یوں کہیے کہ بھوک اسے کھینچ کر وہاں لے جاتی۔

اسے اس حال کو پہنچے دو سال گزر گئے تھے۔ اس تمام مدت میں اسے ایک وقت بھی پیٹ بھر خوراک میسر نہ ہوئی تھی۔ ایک رات بھی وہ چین کی نیند نہ سو سکا تھا۔ ایک آدمی بھی ایسا نہیں ملا تھا جس نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا ہو۔ اگرچہ ورین کے لوگ بھی اس کے مالک سے بظاہر مشابہ تھے، تاہم ان کے حساسات، جذبات اور اخلاق و آداب اس کے مالک سے بہت مختلف تھے۔ اس کا مالک اس کی زبان سمجھتا تھا، اس کے ساتھ نرمی سے پیش آتا تھا، بیماری میں اس کا علاج اور خطرے میں اس کی مدد کرتا تھا۔ مگر یہ لوگ اس کی جان کے دشمن تھے۔ اسے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اب وہ ایک اجنبی اور ناسازگار دنیا میں آ پھنسا ہے۔

یہاں جو بُوئیں اس کے سونگھنے میں آتی تھیں ان میں سب سے زیادہ ناگوار شیر برنج کی بُو تھی۔ یہ سفید مائع اس کی ماں کے دودھ سے ملتی جلتی تھی۔ اس کی بُو سونگھ کر اسے سخت بے چینی محسوس ہوتی تھی، کیوں کہ اسے دیکھ کر وہ سماں اس کی نظروں کے سامنے پھر جاتا تھا جب وہ بچہ تھا اور اپنی ماں کی چھاتی سے لگ کر اپنا ہی گاڑھا اور سفید اور بُودار دودھ پیا کرتا تھا۔ اس کا ایک بھائی بھی تھا، دونوں اپنی ماں کی چھاتی سے لگ کر اپنا ہی گاڑھا، سفید اور بُودار دودھ پیا کرتے تھے۔ ان کی ماں ان کو دودھ پلاتے ہوئے ان کی پشم کو پیار سے زبان سے چاٹ کر صاف کیا کرتی تھی۔ جب وہ شیر مست ہو جاتے تو ان کے منہ خود بخود ماں کی چھاتیوں سے لگ جاتے، آنکھیں بند ہونے لگتیں اور وہ اپنے ننھے پاؤں ماں کی چھاتی پر پھیرتے ہوئے مزے سے سو جاتے۔

ان کے مالک نے گھر سے باہر باڑے میں ان کے لیے ایک سگ خانہ بنوایا تھا۔ وہ کس قدر نرم، گرم اور آرام دہ تھا۔ اس کے اندر گھاس بچھی ہوئی تھی۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ اس میں رہتے

تھے۔ دوپہر کو وہ اپنی ماں کے ساتھ دھوپ میں کھیلا کرتے۔ ان کی ماں جھاڑیوں کے پاس ایک طرف سمٹ کر کے بیٹھ جاتی، وہ دونوں دوڑتے ہوئے آتے، پیچھے سے اس کی گردن اور ٹانگ دبوچ لیتے، پھر وہ ماں سے گتھم گتھا ہو جاتے اور گھنٹوں باغیچے کی نرم گھاس پر لوٹتے رہتے۔

شام کو انھیں ایک اور ساتھی مل جاتا، ان کے مالک کا لڑکا۔ وہ اسکول میں پڑھتا تھا۔ جب وہ گھر آتا تو وہ اس کا بستہ دبوچ لیتے۔ وہ ان کے آگے آگے دوڑتا اور یہ اس کے پیچھے پیچھے بھاگتے اور آخر اس کا دامن دانتوں میں دبوچ لیتے۔ وہ بہت اچھا تھا۔ ان کو بہت چاہتا تھا، اپنے ہاتھ سے انھیں بسکٹ اور ٹافیاں کھلاتا تھا۔ چند سال ایسے ہی گزر گئے۔ پھر ایک دن اس کی ماں اور بھائی ایک ساتھ کہیں غائب ہو گئے۔ وہ انھیں ڈھونڈتا رہا مگر کچھ پتا نہ چلا۔ اب وہ اپنے مالکوں کے ساتھ گھر میں اکیلا رہ گیا تھا۔ وہ ان میں سے ہر ایک کی بو پا لیتا۔ قدموں کی آواز سن کر ہی جان لیتا کہ کون ہے۔ جب یہ لوگ کھانے کی میز پر بیٹھتے تو وہ کمرے میں چکر کاٹتا رہتا۔ اس کی مالکہ اپنے شوہر کی مخالفت کے باوجود اسے وہیں کچھ کھانے کو دے دیا کرتی، لیکن گھر کے بوڑھے ملازم کو یہ بہت ناگوار گزرتا۔ وہ جلدی سے کمرے میں آتا اور اسے آواز دیتا: "پات! پات!" وہ یہ آواز سنتے ہی کھانے کے کمرے سے نکل جاتا اور باہر باغیچے میں چلا آتا۔ بوڑھا نوکر سگ خانے کے سامنے رکھے ہوئے المونیم کے برتنوں میں اس کا راتب ڈال دیتا اور وہ مزے سے قسم قسم کی لذیذ غذائیں کھایا کرتا۔

پات کی بدمستی اس کی بدبختی کا باعث بنی۔ اس کا مالک اسے تنہا باہر نکلنے اور کسی کتیا کے پیچھے جانے کی اجازت نہیں دیتا تھا اور وہ کئی سال سے اپنی شہوت کو دبائے ہوئے تھا۔ خزاں کی ایک صبح اس کے مالک کے دوست آئے۔ وہ انھیں خوب پہچانتا تھا۔ وہ اکثر اس کے مالک کے ساتھ موٹر میں بیٹھ کر سیر کو جایا کرتے تھے۔ اس روز بھی وہ لوگ موٹر میں بیٹھ گئے۔ اس کے مالک نے سیٹی بجائی اور وہ دوڑتا ہوا آیا اور اپنے مالک کے پہلو میں اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ وہ اکثر اپنے مالک کے ساتھ موٹر میں بیٹھ کر سیر کو جایا کرتا اور اطمینان سے اپنے مالک کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھا رہتا تھا۔ مگر اس شام وہ سست ہو رہا تھا اور سخت بے چینی محسوس کر رہا تھا۔

ان کی گاڑی مختلف سڑکوں پر سے ہوتی ہوئی آخر میں ورامین کے چوک میں آ کر رکی۔ سب لوگ نیچے اترے اور اسی پگڈنڈی پر سے ہوتے ہوئے برج کی طرف بڑھے۔ پات بھی ان کے پیچھے پیچھے تھا۔ سڑک کے ایک طرف جو باغ ہے، اس کے پاس پہنچ کر اسے ایک کتیا کی بو آئی۔ وہ رک گیا اور کچھ دیر یہ بو سونگھتا رہا، پھر ایک گندی نالی میں سے گزر کر باغ میں داخل ہو گیا۔ اسے دور سے اپنے مالک کی آواز سنائی دی۔ "پات! پات!" اس آواز کو سن کر اسے ایک نہایت ناگوار احساس ہوا۔ اسے اپنا وہ فرض یاد آ گیا جس کو ادا کرنا اب اس کے لیے لازمی ہو گیا تھا، مگر اس وقت اس کے طبعی حساسات بیدار ہو رہے تھے اور اس کے جسم پر غلبہ پا رہے تھے۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اپنے مالک کی آواز سنی ان سنی کر دے اور اسی بو کے ساتھ پڑا رہے۔ وہ اسی بو کے ساتھ نالی ہی میں

Scanned with CamScanner

پڑا رہا۔ شام کے وقت بستی کے لوگوں نے اسے دیکھا اور پتھر اور روڑے مار مار کر اسے نالی سے باہر نکال دیا۔

اس وقت وہ بہت تھکا ہوا تھا۔ اس کا بدن ٹوٹ رہا تھا اور ایک عجیب خنودگی سی اس پر طاری تھی۔ وہ نالی سے نکلتے ہی اپنے مالک کی تلاش میں گیا اور اس کی بُو سونگھتا ہوا بُرج کے کھنڈر تک پہنچ گیا۔ لیکن اس کا مالک وہاں نہیں تھا۔ وہ واپس چوک میں آیا۔ یہاں اس کے مالک کی بُو شیر برنج، گوشت، کدو، قہوے اور دوسری اشیا کی بُو میں مل کر گم ہو گئی تھی۔ کیا اس کا مالک اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا؟ وہ اپنے مالک کے بغیر، اپنے آقا کے بغیر کیوں کر رہ سکتا تھا؟

وہ دیر تک ورمین کے گلی کوچوں کے چکر کاٹتا رہا اور پھر جب رات ہو گئی تو تھک ہار کر پھر اسی نالی کے پاس گیا جس میں سے اب اس کی مادہ کی بُو آ رہی تھی۔ اس نے نالی کے راستے پھر باغ میں جانے کی کوشش کی، مگر اب لوگوں نے پتھروں سے نالی کا منہ بند کر دیا تھا۔ وہ وہیں بیٹھ گیا اور اپنے پنجوں سے پتھروں کو ہٹانے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔ آخر مایوس ہو کر اس نے ایک دردناک نالہ بلند کیا اور سر پیروں پر رکھ کر اونگھنے لگا۔

آدھی رات کے وقت اپنے ہی نالے کی آواز سن کر وہ پھر جاگ اٹھا۔ اسے سخت بھوک لگ رہی تھی۔ وہ اٹھا اور پھر گلی کوچوں میں آوارہ پھرنے لگا۔ گھروں میں سے لذیذ غذاؤں کی بھینی بھینی بُوئیں آ رہی تھیں۔ اس وقت پہلی بار محسوس ہوا کہ وہ ایک پردیسی ہے اور اجنبیوں کے ملک میں پہنچ گیا ہے۔ اب اسے یہیں رہنا ہے۔ اسے چاہیے کہ یہیں اپنی روزی تلاش کرے۔ وہ چوک میں پہنچا۔ نانبائی کی دکان کھلی تھی، اس میں سے خمیر کی بُو آ رہی تھی۔ نانبائی دکان کے باہر کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک تازہ روٹی تھی۔ اس نے پاٹ کو چمکارا۔ پاٹ نے ایک بار حیرت سے اسے دیکھا۔ نانبائی نے روٹی سے ایک لقمہ توڑ کر اس کے سامنے پھینکا۔ پاٹ نے لقمہ کھا لیا اور دُم ہلانے لگا۔ نانبائی نے روٹی دکان کے پھٹے پر رکھ دی اور ڈرتے ڈرتے پاٹ کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ پھر جب اسے اطمینان ہو گیا کہ پاٹ اسے کاٹے گا نہیں تو دونوں ہاتھوں سے اس کا پٹا اتار لیا۔

پاٹ کو فرحت اور راحت کا شدید احساس ہوا۔ اسے یوں لگا جیسے اب وہ اپنے تمام فرائض اور قیود سے آزاد ہو گیا ہے۔ اب وہ بہ آسانی اپنے مالک کی آواز سنی ان سنی کر سکتا ہے۔ اس نے ایک بار نانبائی کو دیکھا اور قریب جا کر اس کا پیر چاٹنا چاہا، لیکن نانبائی نے نہایت بے رحمی سے اسے لات ماردی اور چشمے پر اپنے ہاتھ دھونے کے لیے چلا گیا۔

پاٹ اب بھی اپنے پٹے کو پہچانتا تھا۔ وہ پٹا اب بساطی کی دکان کے سامنے لٹکا ہوا تھا۔ نانبائی نے یہ پٹا اتارنے کے لیے اس پر ترس کھایا تھا۔ لیکن اب اس کی گردن میں کوئی پٹا نہ تھا اس لیے کوئی اس پر ترس نہ کھاتا تھا۔ اُس روز سے لے کر آج تک اسے ہڈیوں اور پتھروں کے سوا کچھ کھانے کو نہیں ملا تھا۔ اسے محسوس ہوتا تھا جیسے اب وہ ایک ایسی دنیا میں پہنچ گیا ہے جہاں نہ اسے

اپنی کچھ خبر ہے اور کسی کو اس کی کچھ پروا ہے۔ یہاں سب لوگ اس کی جان کے دشمن تھے اور اسے دکھ میں دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔

پہلے چند روز تو نہایت سختی سے گزرے، لیکن پھر وہ اس زندگی کا کچھ کچھ عادی ہو گیا۔ اب اسے معلوم ہو گیا تھا کہ چوک کے دائیں گوشے میں ایک جگہ ہے جہاں کوڑا کرکٹ اور بچا کھچا کھانا پھینکا جاتا ہے۔ غلاظت کے اس ڈھیر میں اسے ہڈیاں، چھیچھڑے، چربی، مچھلی کی سری، مکڑے کی دُم اور کچھ اور چیزیں جن کی بُو وہ اب تک نہیں پہچان سکا تھا، مل جاتی تھیں۔ یوں وہ اب بھی کبھی کبھی قصاب اور نانبائی کی دکان پر جاتا تھا مگر وہاں سے ردو کوب کے سوا کچھ حاصل نہ ہوتا تھا۔

اس کے لیے سب سے تکلیف دہ امر یہ تھا کہ وہ طبعی طور پر کسی کی محبت اور ہم دردی کا محتاج ہونے کے باوجود اس سے یک سر محروم تھا۔ درد و زجر سے بھری ہوئی اس زندگی میں اسے کسی دوست اور ہم درد کی ضرورت اور بھی شدت سے محسوس ہوتی تھی۔ اس کی حالت ایک ایسے معصوم بچے کی سی تھی جسے مار پیٹ اور ڈانٹ ڈپٹ کے سوا کچھ نہ ملتا ہو۔ اس کی نگاہوں میں ایک التجا تھی۔ وہ محبت کا بھکاری تھا۔ اس وقت کوئی بھی اس سے پیار کرتا تو وہ اس پر جان بھی نثار کر دیتا۔ وہ ایسے مالک کا طالب تھا جسے اپنا پیار دے سکے، جس سے وفا کر سکے، لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی کو اس کے پیار اور وفا کی ضرورت نہ تھی۔ وہ سب کو عجز و انکسار سے دیکھتا تھا لیکن اسے سب کی نگاہوں میں بغض و کینہ نظر آتا تھا۔ وہ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے جو حرکت بھی کرتا تھا وہ ان کے غیظ و غضب کو اور بھی بھڑکا دیتی تھی۔

یہاں گندی نالی میں اونگھتے سوتے اس نے دو تین مرتبہ نالہ بلند کیا اور پھر اچانک جاگ اٹھا۔ کباب کی بُو آ رہی تھی اور بھوک سے اس کا دم نکلا جا رہا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے نالی میں سے باہر نکلا اور ڈرتا ڈرتا چوک کی طرف گیا۔ اسی وقت ایک کار شور مچاتی اور دُھول اڑاتی چوک میں آن کر رکی۔ ایک آدمی باہر نکلا۔ اس کی نگاہ پات پر پڑی۔ وہ پات کے قریب آیا اور اس کی پیٹھ تھپکائی۔ یہ آدمی اس کا مالک نہ تھا۔ اسے دھوکا نہ ہوا تھا، وہ اپنے مالک کی بُو پا لیتا تھا۔ پھر اس شخص نے اسے چھوا کیوں کر گوارا کر لیا؟ اب تو اس کی گردن میں پٹا بھی نہیں۔

وہ غور سے اس شخص کو دیکھتا رہا۔ کیا واقعی یہ اس کا مالک نہ تھا؟ کیا واقعی اس کو دھوکا نہیں ہوا تھا؟ وہ شخص بڑھا اور دوبارہ اس کی پیٹھ تھپکائی۔ پات بے اختیار اس کے پیچھے ہو لیا۔ وہ شخص نانبائی کی دکان میں جا کر بیٹھ گیا۔ پات اس دکان کو خوب پہچانتا تھا۔ اس میں سے قسم قسم کے پکوانوں کی بُو آ رہی تھی۔ دکان کا پیش خدمت اس شخص کے لیے روٹی، کباب، انڈے، لسی اور دوسری غذائیں لایا۔ اجنبی نے روٹی کے لقمے لسی میں بھگو کر پات کے سامنے ڈال دیے۔ پات ایک لمحے کے لیے رکا، پھر جلدی سے جھپٹا اور لقمے اٹھا کر کھانے لگا۔ روٹی کے ٹکڑے کھاتے کھاتے وہ بار بار اپنے محسن کی طرف دیکھتا تھا جیسے اس کا شکریہ ادا کر رہا ہو۔ اسے حیرت ہو رہی تھی۔ کیا وہ جاگ

رہا تھا یا خواب دیکھ رہا تھا۔ اسے پیٹ بھر خوراک کیسے مل گئی؟ کیا اسے اپنا مالک، اپنا آقا مل گیا تھا؟

اجنبی کھانا کھا کر اٹھا اور برج کی طرف بڑھا۔ پات بھی اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ برج کے پاس وہ شخص کچھ دیر رکا اور پھر کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر سے ہوتا ہوا اس جگہ پہنچا جہاں ایک پرانا کھنڈر تھا۔ پات کا مالک بھی اس روز یہاں تک آیا تھا۔ کیا یہ آدم زاد بھی ان کھنڈروں میں اپنی مادہ کو تلاش کرتے ہیں؟ اجنبی کھنڈر کے اندر چلا گیا۔ پات ایک بوسیدہ دیوار کے سائے میں اس کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ شخص باہر نکلا اور ایک دوسرے راستے سے چوک میں واپس آیا۔ پات بھی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ چوک میں پہنچ کر وہ شخص مڑا، پات کی پیٹھ تھپکائی اور اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ پات گاڑی کے پائیدان کے پاس کھڑا دُم ہلاتا رہا۔ اسے موٹر پر چڑھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ موٹر چلی اور دھُول اڑاتی ہوئی بڑی سڑک کی طرف بڑھی۔ پات اس کے پیچھے پیچھے بھاگنے لگا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اپنے اس نئے مالک کو بھی کھو دے۔

اس وقت اس کے قویٰ مضمحل ہو رہے تھے، لیکن پھر بھی وہ نہایت تیزی سے کار کا پیچھا کر رہا تھا۔ ایک مرتبہ وہ کار تک پہنچ گیا، لیکن کار کی رفتار تیز تھی، وہ پیچھے رہ گیا۔ اب موٹر آبادی سے دور نکل آئی تھی اور ایک دشت میں سے گزر رہی تھی۔ پات بھی اس کے پیچھے تھا۔ اس کی سانس پھُول رہی تھی، اعصاب جواب دے رہے تھے، زبان باہر نکلی ہوئی تھی، آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اب معمولی سی جنبش بھی نہیں کر سکتا۔ وہ مایوس ہو گیا۔ رکا، دم لیا، اپنے آپ کو گھسیٹتا ہوا سڑک کے کنارے پہنچا اور ایک نالی میں گر گیا۔ اس کے پیٹ میں شدید درد ہو رہا تھا۔ اس نے اپنا پیٹ نالی کے پانی پر رکھ دیا۔ اس کا دماغ پھٹا جا رہا تھا، حواس مختل ہو رہے تھے۔ وہ نالی کی کیچڑ میں بُری طرح پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ پھر اس جسم اکڑنے لگا۔ اس کی ٹانگیں بے حس ہو گئیں اور سارے جسم پر ٹھنڈا پسینا آ گیا۔ خنکی کا یہ احساس کس قدر لطیف تھا۔

شام کے وقت تین کوّے پات کے سر پر منڈلا رہے تھے۔ انھوں نے دور سے پات کی لُو پائی تھی۔ وہ پھڑپھڑاتے ہوئے زمین پر اترتے، پات کو دیکھتے، اور جب انھیں یقین ہو جاتا کہ پات کی جان پوری طرح نہیں نکلی تو ڈر جاتے اور پھر پات کے سر پر منڈلانے لگتے۔ وہ پات کی اُن سیاہ آنکھوں کو نکالنے کے لیے آئے تھے جو حیرت انگیز طور پر انسانی آنکھوں سے مشابہ تھیں۔

○○

(فارسی عنوان: "سنگِ ولگرد")

صادق ہدایت

فارسی سے ترجمہ: بذل حق محمود

۱۰

داش آکل

شیراز میں سب لوگ جانتے تھے کہ داش آکل اور کاکا رستم ایک دوسرے کے جانی دشمن ہیں۔ ایک روز داش آکل دو میل کے قہوہ خانے میں، جہاں وہ ایک مدت سے آیا کرتا تھا، ایک بنچ پر چوکڑی مارے بیٹھا تھا۔ اس کے پہلو میں پنجرہ رکھا تھا جس پر سرخ غلاف چڑھا ہوا تھا۔ وہ اپنی سرانگشت سے پانی کے پیالے میں برف گھول رہا تھا۔ ناگاہ کاکا رستم دروازے سے داخل ہوا، ایک حقارت بھری نگاہ داش آکل پر ڈالی اور سامنے والے بنچ پر بیٹھ گیا۔ پھر قہوہ چی کے چھوکرے کی طرف منہ کیا اور بولا:

"بب بچے، ایک چچ چائے تو لاؤ ذرا!"

داش آکل نے قہوہ چی کے چھوکرے پر ایک پرمعنی نگاہ ڈالی۔ وہ چینی کے گلاس دھو رہا تھا۔ اس نے کاکا رستم کی بات سنی ان سنی کر دی، تانبے کے جھینکے سے گلاس نکال کر پانی کی بالٹی میں ڈال دیے اور پھر انہیں ایک ایک کر کے نہایت احتیاط سے خشک کرنے لگا۔ شیشے کے گلاسوں میں کپڑے کے پھرنے سے غژغژ کی آواز پیدا ہوئی۔

کاکا رستم اس بے اعتنائی سے بھڑک اٹھا اور دوبارہ آواز دی:

"ابے کیا بب بہرہ ہے؟ میں تت تجھ سے کہہ رہا ہوں۔"

قہوہ چی کے چھوکرے نے شرارت سے مسکرا کر داش آکل کی طرف دیکھا۔ کاکا رستم دانت پیستے ہوئے بولا:

"ارے واہ، قق قربان جاؤں، وہ جو بڑھ بڑھ کر باتیں بناتے ہیں، اگر غنڈے ہیں تو آج

Scanned with CamScanner

رات آئیں، دو دو ہاتھ کر لیں۔"

داش آکل نے جو اسی طرح پیالے میں برف گھول رہا تھا اور زیر چشم یہ صورت حال دیکھ رہا تھا، کچھ اس گستاخی سے قہقہہ لگایا کہ اس کی حنا بستہ مونچھوں تلے اس کے سفید، محکم دانت چمک اٹھے۔ اس نے کہا:

"بے غیرت، رجز پڑھی جانے تو تمہیں معلوم ہو گا کہ رستم صولت اور آفندی پیر کون ہے!"

سب لوگ ہنس پڑے، کاکا رستم کی لکنت پر نہیں، کیوں کہ سب جانتے تھے وہ ہکلاتا ہے، بلکہ اس لیے کہ داش آکل شہر میں سفید پیشانی کے بیل کی طرح پہچانا جاتا تھا اور کوئی غنڈا ایسا نہ تھا جس نے اس کی مار کا مزہ نہ چکھا ہو۔ رات کو جب وہ ملا اسحٰق یہودی کے گھر میں دو آتشہ شراب کی بوتل چڑھا کر محلہ سردزک کے سرے پر کھڑا ہو جاتا تو کاکا رستم کیا، اس کا باپ بھی ادھر آ نکلتا تو یہ اس کی ٹانگیں توڑ ڈالتا۔ خود کاکا رستم بھی جانتا تھا کہ اس کا اور داش آکل کا کوئی جوڑ نہیں۔

وہ دو مرتبہ اس کے ہاتھوں زخم کھا چکا تھا اور تین چار مرتبہ اس نے اسے گرا لیا تھا بلکہ اس کے سینے پر سوار ہو گیا تھا۔

بدقسمتی سے چند دن پہلے کاکا رستم میدان خالی دیکھ کر کھل کھیلا تھا۔ داش آکل بھی جل معلق کی طرح اس کے سر ہو گیا تھا۔ اس نے گالیوں کی بوچھاڑ کرتے ہوئے کہا تھا:

"کاکا، چوڑیاں پہن کر گھر میں بیٹھا کرو۔ معلوم ہوتا ہے ان دنوں افیون کچھ زیادہ ہی کھانے لگے ہو جو اس طرح کھل کھیلے ہو۔ یہ بھی کوئی مردانگی ہے؟ میں کہتا ہوں ان بے غیرتیوں اور کمینگیوں سے باز آ جاؤ۔ شرم نہیں آتی؟ یہ بھی ایک قسم کی گداگری ہی ہے کہ رات کو لوگوں کو رستے میں روک لیتے ہو۔ خدا کی قسم، اگر اب پھر تم نے بدمعاشی کی تو تمہاری مونچھیں جلا ڈالوں گا یا اس چھرے سے دو ٹکڑے کر دوں گا۔"

اس وقت کاکا رستم دُم دبا کر بھاگ گیا تھا، مگر اس کے بعد اس کے دل میں داش آکل کے خلاف بغض و کینہ بھر گیا اور اب وہ موقعے کی تلاش میں تھا کہ کسی طرح اس ہتک کا بدلہ لے۔

داش آکل کو شہر کے سب لوگ چاہتے تھے۔ اگرچہ وہ محلہ سردزک پر قبضہ جمائے بیٹھا تھا لیکن اسے عورتوں اور بچوں سے کوئی کام نہ تھا، بلکہ وہ تو محلے والوں سے بڑی مہربانی سے پیش آتا تھا۔ اگر کوئی شامت کا مارا کسی عورت کو چھیڑ بیٹھتا یا کسی سے سینہ زوری کرتا تو داش آکل سے جان سلامت نہ لے جا سکتا تھا۔ اکثر دیکھا گیا کہ داش آکل غریبوں کی دست گیری کرتا ہے، سخاوت کرتا ہے؛ اور تو اور، لوگوں کا بوجھ اٹھا کر ان کے گھر تک پہنچا آتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ کسی کی بالادستی تسلیم کرنے پر آمادہ نہ تھا، خصوصاً کاکا رستم کی بالادستی جو ہر روز تین مثقال افیون کھاتا تھا اور ہر ہر قسم کے دعوے کرتا تھا۔

Scanned with CamScanner

یہاں قہوہ خانے میں کاکا رستم کو جو ذلت اٹھانی پڑی اس کی وجہ سے وہ آگ بگولا ہو رہا تھا اور اپنی مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا۔ اس وقت اگر کوئی چھری سے اس کی رگیں کاٹتا تو خون کا ایک قطرہ نہ نکلتا۔ کچھ دیر بعد ہنسی کا دورہ ختم ہو گیا۔ سب لوگ خاموش ہوئے۔ صرف ایک قہوہ چی کا چھوکرا تھا جو اُدھڑے ہوئے رنگ کی کالر والی قمیص، شب کلاہ اور اون کی شلوار پہنے، دل پر ہاتھ رکھے ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو رہا تھا اور لوگ اسے مستاد دیکھ کر پھر ہنسنے لگے تھے۔

کاکا رستم آپے سے باہر ہو گیا۔ اس نے شیشے کی شکردانی اٹھائی اور قہوہ چی کے چھوکرے کے سر پر ماری۔ مگر شکردانی جا کر سماور کو لگی، سماور، چائے دانی کے ساتھ زمین پر گرا اور پیالیاں ٹوٹ گئیں۔ کاکا رستم اٹھ کھڑا ہوا اور اپنی لال بھبھوکا صورت لیے قہوہ خانے سے باہر نکل گیا۔

قہوہ چی نے نہایت پریشانی کے عالم میں سماور کو سیدھا کیا اور بولا:

"رستم کا اسلحہ تو دیکھو! بے چارہ بھلا چنگا کر غریبوں پر ٹوٹتا تھا۔"

اگرچہ قہوہ چی اس وقت غصے میں تھا لیکن چونکہ اس کی بات میں رستم کی طرف اشارہ تھا اس لیے اب پہلے سے بھی زیادہ زور سے قہقہے بلند ہوئے۔ قہوہ چی چھوکرے کی شرارت سے برہم ہو کر اس کو مارنے لگا۔ لیکن داش آکل نے مسکرا کر جیب سے ایک تھیلی نکالی اور میز پر رکھ دی۔ قہوہ چی نے تھیلی اٹھائی اور مسکرا دیا۔ اس اثنا میں ایک شخص مخمل کی صدری، ڈھیلے پائنچوں کی شلوار اور چھوٹا سا نمدی کلاہ پہنے ہانپتا ہوا قہوہ خانے میں وارد ہوا۔ چاروں طرف نگاہ دوڑائی، داش آکل کے سامنے جا کر سلام کیا اور بولا:

"حاجی صمد چل بسا۔"

داش آکل نے سر اٹھا کر کہا: "انا للہ وانا الیہ راجعون۔"

"پر وہ وصیت کر گیا۔۔۔"

"تو جا کر مردہ خوروں کو خبر کرو۔ میں تو مُردہ خور نہیں ہوں۔"

"وہ تمھیں اپنا وصی اور وکیل مقرر کر گیا ہے۔"

داش آکل جیسے خواب سے جاگ اٹھا۔ اس نے اس شخص کو سر سے لے کر پیر تک دیکھا۔ اپنے ماتھے پر ہاتھ پھیرا۔ اس کا تُرکی کلاہ پیچھے ہٹ گیا اور اس کی دو رنگی پیشانی نظر آنے لگی جس کا آدھا حصہ سورج کی گرمی سے سیاہ ہو گیا تھا اور آدھا ٹوپی کے اندر رہنے کی وجہ سے سفید تھا۔ پھر اس نے سر کو جھٹکا دیا، اپنی پائپ نکالی، اس پر تمباکو رکھا اور انگوٹھے سے دبا کر آگ سلگائی اور پھر بولا:

"اللہ بخشے! مگر یہ حاجی نے اچھا کام نہیں کیا۔ مجھے خواہ مخواہ الجھا لیا۔ خیر، تم جاؤ۔ میں بھی تمھارے پیچھے آتا ہوں۔"

یہ شخص حاجی صمد کا ملازم تھا۔ وہ جلدی جلدی قہوہ خانے سے باہر چلا گیا۔

داش آکل نے پیشانی پر بل ڈالے اور پائپ سے یوں ہی دھواں نکالنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے

Scanned with CamScanner

قہوہ خانے کی مسرت آفریں فضا پر غم انگیز گھٹائیں چھا گئی ہوں۔ پھر داش آکل نے پائپ میں سے رکھ نکالی، بشیروں کا دستبرد قہوہ چی کے چھوکرے کے سپرد کیا اور قہوہ خانے سے باہر چلا گیا۔

جب داش آکل حاجی صمد کے بیرون خانے میں وارد ہوا، ختم دیا جا چکا تھا اور اب چند قاری اور جزوہ کش پیسے کے معاملے میں بحث کر رہے تھے۔ وہ کچھ دیر حوض کے پاس کھڑا رہا۔ پھر اسے ایک بڑے کمرے میں لے گئے جس کی کھڑکیاں باہر کی طرف کھلتی تھیں۔ حاجی صمد کی بیگم پردے کے پیچھے آئی۔ داش آکل رسمی سلام علیک کے بعد قالین پر بیٹھ گیا اور بولا:

"آپ کا سایہ سلامت رہے، بچوں کی عمر دراز ہو!"

بیگم نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا:

"جس رات حاجی کی حالت خراب ہوئی، اس نے امام جمعہ کو اپنے بالیں پر بلایا اور سب کے سامنے تمہیں پناہ وکیل اور ولی نامزد کیا۔ بے شک تم حاجی کے گہرے دوست تھے۔"

"ہاں، ہم پانچ سال پہلے کازرون میں ملے تھے۔"

"اللہ بخشے حاجی ہمیشہ کہا کرتا تھا شہر میں کوئی مرد ہے تو وہ داش آکل ہے۔"

"خانم، میں اپنی آزادی کو سب سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں، لیکن اب مرحوم نے مجھے پابند کر دیا ہے تو میں دل و جان سے یہ فرض ادا کروں گا۔"

اس کے بعد اس نے ذرا سر موڑا تو دوسرے پردے کے پیچھے لڑکی کو دیکھا۔ لڑکی کا چہرہ تمتمارہا تھا اور اس کی آنکھوں میں ایک عجیب کشش تھی۔ ایک ثانیے کے لیے ان کی نظریں ملیں لیکن پھر لڑکی شرما گئی، پردہ گرایا اور پیچھے چلی گئی۔ یہ لڑکی حسین تھی؟ شاید! بہرحال اس کی نگاہیں کام کر چکی تھیں، اور اب داش آکل کا حال دگرگوں ہو رہا تھا۔ اس نے سر جھکا لیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

یہ لڑکی جس کا نام مرجان تھا، حاجی صمد کی بیٹی تھی۔ وہ داش آکل کو دیکھنے آئی تھی جس کا شہر میں اس قدر شہرہ تھا۔

داش آکل اس دن کے بعد حاجی کے کام میں مشغول ہو گیا۔ ایک دلال، محلے کے دو آدمیوں اور ایک منشی کی مدد سے اس نے سب معاملات درست کر لیے۔ جو سامان غیر ضروری تھا اسے گودام میں رکھ کر سر بہ مہر کر دیا۔ جو کچھ بیچنے کے قابل تھا بیچ ڈالا۔ جائداد کے کاغذات درست کیے، کرایہ وصول کیا۔

یہ سب کام اس نے دو دن دو رات کی مسلسل کاوش سے ختم کر لیا۔ تیسری رات وہ تھکا ہارا سید حاج عریب کے چوک کے پاس سے گزر کر گھر کی طرف جا رہا تھا کہ راستے میں اسے امام قلی چنگر مل گیا۔ اس نے کہا: "پرسوں رات سے کاکا رستم تمہاری راہ دیکھ رہا ہے۔ کل رات کہہ رہا تھا، یارو! اس نے ہمیں خوب چکر دیا، شیخ کو دیکھ کر اپنا قول بھول گیا۔"

داش آکل نے اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا:
"کوئی فکر نہیں!"

داش آکل کو خوب یاد تھا کہ تین دن پہلے قہوہ خانے میں کاکا رستم نے للکارا تھا، مگر وہ اپنے حریف کو پہچانتا تھا اور خوب جانتا تھا کہ کاکا رستم امام قلی سے مل کر اسے بھڑکانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس نے اس بات کو کوئی اہمیت نہ دی اور اپنی راہ لی۔ راستے میں اس کے تمام ہوش و حواس مرجان کی طرف متوجہ تھے۔ وہ اس کی صورت کو اپنی نظروں سے ہٹانے کی بہتیری کوشش کرتا تھا مگر وہ اور بھی نمایاں ہو کر اس کی نظروں میں پھرنے لگتی تھی۔

داش آکل سینتیس سال کا تنومند لیکن بدصورت شخص تھا۔ جو شخص پہلی دفعہ اس کی صورت دیکھتا سخت بیزار ہوتا۔ لیکن اگر وہ مجلس میں بیٹھ کر داش آکل کی زندگی کی وہ حکایتیں سنتا جو لوگوں کی زبان پر تھیں تو ناممکن تھا کہ وہ اس کی شخصیت سے متاثر نہ ہوتا۔ شکل و صورت سے وہ نجیب و باوقار لگتا تھا: سیاہ آنکھیں، سیاہ ابرو، بڑے بڑے رخسار، باریک ناک، سیاہ داڑھی اور مونچھیں تھیں، لیکن چہرے کے زخموں کے ان نشانوں نے جو اس کے چہرے پر بائیں سے دائیں جانب پڑے ہوئے تھے، اس کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ اس کے چہرے کے حسین نقوش کو گوشت کے ان دھبوں نے بہت بری طرح مسخ کر دیا تھا۔ سب سے بدتر زخم وہ نشان تھا جس نے اس کی بائیں آنکھ کے کونے کو ذرا نیچے ڈھلکا دیا تھا۔

اس کا باپ فارس کا ایک بہت بڑا زمیندار تھا اور جب مرا تو اپنی ساری جائداد اپنے اکلوتے بیٹے کے نام کر گیا۔ مگر داش آکل شروع ہی سے لاابالی، آزادی پسند، سخی اور فراخ دل تھا۔ وہ روپے پیسے کو کوئی اہمیت نہ دیتا تھا اور نہایت مردانگی، آزادی اور بزرگ منشی سے زندگی بسر کرتا تھا۔ زندگی کے جھمیلوں سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس نے اپنی تمام مال و دولت بیوہ عورتوں اور ناداروں کی دستگیری کے لیے وقف کر دی تھی۔ لیکن اسے دو آتشہ شراب کی لت پڑ گئی تھی اور وہ شراب پی کر سڑکوں اور چوراہوں پر نعرے لگاتا پھرتا تھا یا بسا وقت اپنے چند خاص دوستوں کی مجلس میں گزار دیتا تھا جو اس کے بڑے مداح تھے۔

داش آکل کے سب معائب و محاسن بس یہیں تک محدود تھے، لیکن زیادہ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اب تک عشق و عاشقی نے اس کی بھرپور زندگی میں کوئی رخنہ پیدا نہیں کیا تھا۔ کئی مرتبہ اس کے دوستوں نے نہایت محرمانہ قسم کی مجلسیں بھی برپا کیں، مگر اس نے اپنا دامن بچائے رکھا۔ البتہ اب جس دن سے وہ حاجی صمد کا وکیل اور وصی بنا تھا، اور اس نے مرجان کو دیکھا تھا، اس کی زندگی کا رنگ بالکل پلٹ گیا تھا۔ ایک طرف حاجی صمد کی وصیت نے اسے پابند کر دیا تھا اور وہ اپنے آپ کو مرحوم کا مسئول تصور کرنے لگا تھا۔ دوسری طرف اس کے دل میں مرجان کے عشق کی آگ بھڑک اٹھی تھی، لیکن وہ اپنے فرائض کو سب پر مقدم جاننے لگا تھا۔ وہ شخص جس نے دولت کو لات مار دی

Scanned with CamScanner

تھی اور اپنی جائداد نہایت لاابالیانہ انداز میں گنوا دی تھی، وہ اب ہر صبح جلدی اٹھ بیٹھتا تھا اور اس فکر میں رہتا تھا کہ حاجی کی جائداد کی آمدنی کس طرح بڑھائی جائے۔ وہ حاجی کے بال بچوں کو ایک چھوٹے سے گھر میں لے گیا تھا اور اُن کا اپنا مکان کرائے پر دے دیا تھا۔ بچوں کے لیے معلم رکھ دیا تھا جو گھر پر آکر درس دیتا تھا۔ اور وہ صبح شام حاجی کی املاک اور اراضی کی دیکھ بھال میں مشغول رہتا تھا۔

اب داش آکل نے شب گردی اور شمشیر بازی بھی چھوڑ دی تھی۔ اب وہ اپنے دوستوں سے زیادہ ربط نہ رکھتا تھا اور نہ پہلے سے جوش وخروش سے ان سے ملتا تھا۔ لیکن شہر کے سب غنڈے جو اس سے ہم چشمی رکھتے تھے، اُن لوگوں کے کہنے پر جن کے ہاتھ حاجی کا مال و دولت نہ لگ سکا تھا، داش آکل کی بُرائیاں کرنے رہتے اور اس کا ذکر لوگوں کی مجلسوں اور قہوہ خانوں میں عام ہو گیا۔ قہوہ خانہ پاچنار میں اکثر داش آکل کو لتاڑا جاتا اور ایسی باتیں سننے میں آتیں کہ:

داش آکل کی بات کرتے ہو؟ اس کی تو راس ٹھیک پڑی ہے۔ کتوں کی طرح گداگری کرتا پھرتا ہے۔ حاجی کے گھر میں خدا جانے کون سی نُو پالی کہ اس کے چکر کاٹتا رہتا ہے اور اب محلہ سردزک میں پہنچتا ہے تو اس کا دم نکل جاتا ہے۔

کاکا رستم کے سینے پر بھی سانپ لوٹ رہا تھا۔ وہ ہکلاتے ہوئے کہتا:

بوڑھی گھوڑی لال لگام! یارو، حاجی صمد کی لڑکی پر عاشق ہو گیا ہے۔ اب اس نے اپنا چھُرا غلاف میں کر لیا ہے اور لوگوں کی آنکھوں میں دھُوں جھونکتا پھرتا ہے۔ خدا جانے کیا جھوٹ سچ ملا کر حاجی کا وصی اور وکیل بن گیا ہے اور اب اس کی جائداد پر قبضہ جمائے بیٹھا ہے۔ خدا اس کو سمجھے!'

اب شہر میں داش آکل کا طوطی نہیں بولتا تھا، نہ لوگ قہوہ خانوں میں بیٹھ کر اس کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتے تھے۔ وہ جہاں بھی جاتا لوگ سر جوڑ کر بیٹھ جاتے اور آپس میں سرگوشی کرنے لگتے اور اس کی ذات پر جملے کرتے۔ داش آکل بھی الگ تھلگ گوشے میں بیٹھا یہ سب باتیں سنتا رہتا لیکن کسی کا گلہ نہ کرتا۔ بلکہ وہ ان کی بکواس کو کوئی اہمیت ہی نہ دیتا تھا۔ عشق اس کے رگ و پے میں اس حد تک سرایت کر چکا تھا کہ اسے مرجان کے سوا کسی چیز کا ہوش نہ تھا۔

رات کو وہ سخت پریشانی کے عالم میں شراب کے جام پہ جام چڑھائے جاتا۔ اس نے اپنا دل بہلانے کے لیے ایک طوطا خرید لیا تھا، اس کے پنجرے کے پاس جا بیٹھتا اور اس سے اپنے دل کا درد بیان کرتا۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر وہ مرجان کا رشتہ مانگتا تو حاجی کی بیوی اسے ضرور قبول کر لیتی، مگر وہ خود گھر بار اور بیوی بچوں کا پابند نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس کی زندگی آزادی سے گزر رہی تھی اور اب بھی وہ آزاد ہی رہنا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ اس کا خیال تھا کہ جو لڑکی اس کی سرپرستی اور بزرگ داشت میں ہو اس سے شادی کا خیال دل میں لانا پرلے درجے کی نمک حرامی اور احسان ناشناسی ہے۔ وہ ہر رات آئینے میں اپنی صورت دیکھتا، چہرے کے زخموں کے نشانات اور پپوٹے کو ڈھلکے

ہوئے گوشۂ چشم پر نظر ڈالتا اور نہایت گلوگیر آواز میں اونچا اونچا کہتا:

شاید وہ مجھے پسند نہ کرے اور اپنے لیے کوئی خوب صورت اور نوجوان شوہر چاہتی ہو۔ نہیں، یہ مردانگی نہیں۔ وہ چودہ برس کی ہے اور میری عمر چالیس کے لگ بھگ ہو چلی ہے۔ لیکن کیا کروں! یہ عشق مجھے مارے ڈالتا ہے۔ مرجان او مرجان! تو نے مجھے ہلاک کر دیا۔ مرجان، میں کس سے کہوں تیرے عشق نے مجھے ہلاک کر دیا۔ مرجان، میں کس سے کہوں، تیرے عشق نے مجھے مار ڈالا!

اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے اور وہ جام پہ جام چڑھائے جاتا اور اسی پریشانی میں نیند اس پر غلبہ پا لیتی۔

لیکن رات کے وقت جب شیراز۔ یہ پُرپیچ گلی کوچوں، دل کشا باغوں اور ارغوانی شرابوں کا شہر۔ نیند کی آغوش میں چلا جاتا اور سیاہ آسمان پر سہمے ننھے ستارے چشمکیں کرنے لگتے اور مرجان اپنے گلگوں رخسار لیے داش آکل کے بستر پر سانس لینے لگتی، تو اس وقت داش آکل فدائی داش آکل۔ اپنے تمام تر احساسات وجذبات اور ہوا وہوس کے ساتھ بلا کسی جھجک اور شرم کے، آداب ورسوم نے اس دل سے جو معاشرے نے اس کے گرد وپیش بن رکھا تھا، باہر نکل آتا اور نہایت آزادی اور بے تکلفی سے مرجان کو اپنی تنگ آغوش میں بھینچ لیتا، اس کے دل کی دھڑکن کو سنتا، اس کے آتشیں لبوں کے لمس کو محسوس کرتا، اس کے نرم ونازک جسم کو پیار سے چھوتا اور اس کے تمتماتے ہوئے رخساروں پر اپنے غیرفانی عشق کی مُہریں ثبت کر دیتا۔

لیکن پھر جب یہ سہانا سپنا ٹوٹ جاتا اور اس کی آنکھ کھلتی تو وہ اپنے آپ کو گالیاں دینے لگتا، اپنی زندگی پر لعنت بھیجتا، دیوانوں کی مانند اپنے کمرے کے چکر کاٹتا رہتا، زیرِ لب بڑبڑاتا رہتا اور باقی وقت مرجان کے عشق کو اپنے دل ودماغ سے محو کر کے حاجی کے کاروبار کی دیکھ بھال میں گزار دیتا۔

اسی طرح سات برس گزر گئے۔ داش آکل نے حاجی کے بال بچوں کی خدمت وپرورش میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ اگر کوئی بچہ بیمار پڑ جاتا تو شفیق ماں کی طرح رات رات بھر جاگ کر اس کی تیمارداری کیا کرتا۔ اسے ان بچوں سے محبت ہو گئی تھی لیکن مرجان سے اس کے عشق کی کچھ اور ہی شدت تھی۔ شاید یہ مرجان ہی کا عشق تھا جس نے آزاد منش داش آکل کو اس حد تک رام اور مطیع کر لیا تھا۔ اس عرصے میں حاجی کے تمام بچے ہوش سنبھال چکے تھے۔

ہونی ہو کر رہتی ہے: مرجان کے لیے ایک شوہر پیدا ہو گیا، اور وہ بھی ایسا شوہر جو خود داش آکل سے زیادہ بوڑھا اور بدصورت تھا۔ لیکن اس واقعے سے داش آکل کے ماتھے پر بل تک نہ آیا، بلکہ اس نے نہایت صبر واستقلال سے کام لیا اور بڑے جوش وخروش کے ساتھ جہیز کی تیاری میں مشغول ہو گیا اور شادی کی رات کے لیے عظیم الشان جشن کا اہتمام کرنے لگا۔ وہ حاجی کے کنبے کو پھر ان کے اپنے گھر میں لے آیا اور وہی بڑا کمرہ جس کی کھڑکیاں باہر کی طرف کھلتی تھیں اس نے

Scanned with CamScanner

مہمانوں کے استقبال کے لیے معین کیا اور شہر سے بڑے بڑے افسروں، تاجروں اور معزز لوگوں کو اس جشن میں شرکت کی دعوت دی۔

اس روز شام کے پانچ بجے جب یہ بڑا کمرہ مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور لوگ بیش قیمت کرسیوں پر بیٹھے تھے اور دسترخوان پر شیرینی اور میوے کے خوانچے سجے ہوئے تھے، داش آکل اپنی اُسی قدیم بازاری وضع قطع میں، بال اوپر بڑھائے، لمبی آستین کی جیکٹ، کشمیری شال، سیاہ ٹول کی شلوار اور آبادہ کے بنے ہوئے کپڑوں کے ہلکے جوتے اور نور کی ٹوپی پہنے اندر آیا۔ اس کے پیچھے تین اور آدمی ہاتھ میں دفتر اور پوتھیاں لیے وارد ہوئے۔ سب مہمان داش آکل کو اس حالت میں دیکھ کر حیران رہ گئے۔ داش آکل جلدی سے امام جمعہ کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا اور بولا:

آقائے امام! اللہ بخشے حاجی صمد وصیت کر گیا تھا اور میں اسی وصیت کے مطابق سات سال تک اپنا فرض ادا کرتا رہا ہوں۔ سب سے چھوٹا بچہ جو حاجی کی موت کے وقت پانچ سال کا تھا اب بارھویں سال میں ہے۔ یہ حاجی کی ملکیت کا حساب کتاب ہے۔" اس نے ان تین آدمیوں کی طرف اشارہ کیا جو پیچھے کھڑے تھے۔ "آج تک جو کچھ خرچ ہوا ہے، شادی کے اخراجات سمیت، وہ میں نے اپنی جیب سے ادا کیا ہے۔ اب میں اپنا مختار ہوں اور وہ اپنے مختار ہیں۔ آپ مجھے اس فرض سے سبکدوش کر دیں۔"

یہاں پہنچ کر اس کی آواز بھرا گئی، اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے اور وہ کچھ مزید کہے سنے بغیر سر جھکائے دروازے سے باہر نکل آیا اور گلی میں پہنچ کر اطمینان کا سانس لیا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا اب وہ آزاد ہو گیا ہے، وہ بارِ گراں جو حاجی صمد اس کے کندھوں پر ڈال گیا تھا اتر گیا ہے۔ لیکن اس وقت وہ دل شکستہ اور مجروح تھا اور دیوانہ وار قدم بڑھا رہا تھا۔ راستے میں اس نے یہودی شراب فروش ملا اسحٰق کا گھر پہچان لیا اور اینٹ کی سیڑھیوں پر سے گزر کر اس کے بوسیدہ اور دُودزدہ صحن میں پہنچا جس کے اردگرد چھوٹی چھوٹی کثیف کوٹھریاں تھیں۔ ان کوٹھریوں کی کھڑکیاں بھڑوں کے چھتے کے سوراخوں کی مانند تھیں۔ سامنے حوض کے متعفن پانی کی سطح پر سبز کائی جمی ہوئی تھی اور گلے سڑے پشوں کی بدبو فضا میں پھیل رہی تھی۔ ملا اسحٰق اپنی پھٹی پرانی میلی کچیلی ٹوپی پہنے، بکرے کی سی داڑھی پر ہاتھ پھیرتا، نفرت بھری نظروں سے دیکھتا ہوا آگے بڑھا اور نہایت تصنع سے ہنسنے لگا۔

داش آکل نے اسی مدحوشی کے عالم میں کہا: "پیارے، قربان جاؤں، ایک اچھی سی بوتل لا دے۔ میرا حلق سوکھ رہا ہے، ذرا تر کروں۔"

ملا اسحٰق نے سر ہلایا اور سیڑھیوں میں سے ہو کر تہ خانے میں اتر گیا اور پھر چند لمحوں بعد ایک بوتل لیے اوپر آیا۔ داش آکل نے تیزی سے بوتل اس کے ہاتھ سے چھین لی، اس کی گردن دیوار پر مار کر منہ توڑا، ابھی اس نے آدھی بوتل نہ پی تھی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس

نے بڑی کھانسی روکی، ہاتھ کی پشت سے منہ صاف کیا۔ ملا اسحٰق کا زرد رُو، میلا کچیلا، پھولے ہوئے پیٹ، کھلے ہوئے منہ اور لٹکے ہوئے ہونٹوں والا لڑکا گھور گھور کر اسے دیکھ رہا تھا۔ داش آکل نے صحن کے طاقچے میں رکھے ہوئے نمک دان سے ایک چٹکی بھری اور منہ میں ڈال لی۔

ملا اسحٰق آگے بڑھا، داش آکل کے کندھے پر ہاتھ مارا اور پھر اس کے لباس کو دیکھ کر بولا:

"یہ تم نے کیا پہن رکھا ہے؟ یہ جیکٹ پرانی ہو گئی ہے۔ اگر تمھیں ضرورت نہ ہو تو میں خرید لوں گا۔"

داش آکل نہایت افسردگی سے مسکرایا، پیسے جیب میں سے نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھے اور گھر سے باہر نکل آیا۔ سورج ڈوب رہا تھا۔ گلیوں میں دوپہر کی بارش کا پانی بہہ رہا تھا اور فضا میں پھول پتوں اور نارنگیوں کی بُو پھیل رہی تھی۔

مرجان کے سرخ رخسار، سیاہ آنکھیں، گھنی پلکیں، گھنگھریالے بال پیشانی پر بکھرے ہوئے، ایک مبہم اور دھندلے نقش کی صورت میں داش آکل کی آنکھوں میں پھر رہے تھے۔ وہ اپنی زندگی کے گزرے ہوئے لمحوں کو یاد کر رہا تھا۔ پرانی یادیں ایک ایک کر کے اس کے سامنے سے گزر رہی تھیں۔ وہ سیر و تفریح کے اُن لمحات کو یاد کر رہا تھا جو اس نے اپنے دوستوں کی معیت میں شیخ سعدی اور باباکوہی کے مزار پر گزارے تھے۔ وہ کبھی ہنس دیتا تھا اور کبھی سنجیدہ ہو جاتا تھا، لیکن یہ امر مسلم تھا کہ وہ اپنے گھر سے اکتا چکا تھا۔ یہ اکتاہٹ اس کی برداشت سے باہر تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس کا دل اُچاٹ ہو گیا ہو اور وہ چاہتا ہو کہیں دور چلا جائے۔ اسے خیال آیا آج بھی شراب پی کر اپنے طوطے سے اپنے دل کا درد بیان کرے۔ زندگی اسے سراسر بےہودہ، پوچ، پست اور بےمعنی نظر آ رہی تھی۔ اسے ایک شعر یاد آگیا اور وہ بےاختیار ہو کر گنگنانے لگا:

بہ شب نشینی زندانیان برم حسرت

کہ نقلِ مجلسشان دانہ ہای زنجیر است

پھر اسے ایک اور شعر یاد آیا اور وہ بلند آواز میں گانے لگا:

دلم دیوانہ شد ای عاقلان آرید زنجیری

کہ نبود چارہ ی دیوانہ جز زنجیر تدبیری

یہ شعر اس نے ایک نہایت دردناک اور پُرسوز لے میں پڑھا، لیکن پھر اس کی ہمت جواب دے گئی، یا شاید خیال کسی اور طرف چلا گیا، کہ وہ ایک دم خاموش ہو گیا۔

اب تاریکی پھیل چکی تھی۔ داش آکل محلہ سردزک کے سرے پر کھڑا تھا۔ آج سے بہت پہلے جب اس کا دل زندہ اور دماغ روشن تھا، وہ اسی میدان گاہ میں گشت کیا کرتا تھا اور کسی کی ہمت نہ تھی کہ اس محلے میں قدم رکھے۔ وہ بلا ارادہ ایک گھر کے سنگی تھڑے پر بیٹھ گیا، اپنی پائپ نکال

Scanned with CamScanner

کر سلائی ورپینے لگا۔ اسے یوں نظر آیا کہ یہ جگہ پہلے سے زیادہ ویران ہو گئی ہے، لوگ بالکل بدل گئے ہیں، جس طرح وہ خود بدل چکا تھا۔ اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھانے لگا اور سر میں درد ہونے لگا۔ ناگہاں ایک تاریک سایہ نمایاں ہو جو دور سے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جب یہ سایہ اس کے قریب پہنچا تو بولا: "ع غ غنڈے کو اندھیری رات ہی بھ بھ بھاتی ہے۔"

داش آکل نے کاکا رستم کو پہچان لیا اور تھڑے پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنی کمر پر ہاتھ رکھ کر زمین پر تھوکا اور بولا:

"اب بے بے غیرت! تو اپنے آپ کو غنڈا سمجھتا ہے؟ چلو بھر پانی میں ڈوب مر!"

کاکا رستم نے مسخر آمیز قہقہہ لگایا اور اس کے سامنے آ کر بولا:

"وہ ر زمانہ ل ل لد گیا۔ اب اس ع ع علاقے میں ت ت تیری ایک بھی چ چ چلے گی! آ آ آج حاجی کے گو گو گھر میں ش ش شادی ہے پر ت ت تجھے کسی نے اندر ن ن نہیں۔۔۔"

داش آکل نے اس کی بات کاٹ دی۔

"خدا نے تیری خصلت پہچان کر ہی تجھے نصف زبان عطا کی تھی، آج سے بھی گدی سے کھینچ لیتا ہوں۔" اس نے اپنے خنجر پر ہاتھ ڈالا، اسے غلاف سے نکالا۔ کاکا رستم نے بھی جلدی سے خنجر ہاتھ میں لے لیا۔ داش آکل نے خنجر زمین پر گاڑ دیا اور اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر سیدھا کھڑا ہو گیا اور بولا:

"ہے کوئی غنڈا جو اسے زمین سے باہر نکالے!"

کاکا رستم نے ناگہاں اس پر وار کیا مگر داش آکل نے ایک ایسا ہاتھ مارا کہ خنجر کاکا رستم کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر جا گرا۔ ان کی آواز سن کر کچھ راہ گیر جمع ہو گئے مگر کسی کو آگے آنے یا انھیں چھڑانے کی جرأت نہ ہوئی۔

داش آکل نے قہقہہ لگا کر کہا: "جاؤ جاؤ بھائی اپنی راہ لو، مگر اس دفعہ ہوشیار رہنا۔ میں چاہتا ہوں آج ہی رات ہمارا حساب پاک ہو جائے۔"

کاکا رستم مٹھیاں بھینچے سامنے آیا اور دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے اور آدھے گھنٹے تک زمین پر لوٹتے رہے۔ ان کے جسم پسینے میں شرابور ہو گئے تھے لیکن ابھی تک کسی کو فتح نصیب نہ ہو رہی تھی۔ اس کش مکش کے دوران میں داش آکل کا سر نہایت سختی سے سڑک کی پٹری سے ٹکرایا اور چکرا گیا۔ کاکا رستم بھی جان لینے کے ارادے سے گھونسے مار رہا تھا۔ اس میں مقابلے کی تاب نہ رہی تھی۔ اس حالت میں اس کی نظر داش آکل کے خنجر پر پڑی جو اس کی دسترس میں تھا۔ اس نے اپنے پورے زور اور توانائی کے ساتھ اسے زمین میں سے کھینچا اور داش آکل کے پہلو میں گھونپ دیا۔ دونوں کے ہاتھ جواب دے گئے۔

تماشائی دوڑ کر آگے بڑھے اور بڑی مشکل سے داش آکل کو زمین پر سے اٹھایا۔ اس کے پہلو

Scanned with CamScanner

سے خون کے قطرے بہہ کر زمین پر گر رہے تھے۔ اس نے اپنا ہاتھ گھاؤ پر رکھ لیا اور دیوار کے ساتھ ساتھ چند قدم چلا، لیکن پھر گر پڑا۔ لوگ اسے اٹھا کر گھر لے گئے۔

اگلی صبح جب داش آکل کے زخمی ہونے کی خبر حاجی صمد کے گھر پہنچی تو حاجی کا بڑا لڑکا خان اس کی احوال پرسی کے لیے گیا۔ جب وہ داش آکل کے سرہانے پہنچا تو دیکھا کہ وہ بستر پر لیٹا ہے، اس کا رنگ اڑا ہوا ہے، منہ سے خون آلود جھاگ بہہ رہی ہے، آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی ہے اور وہ بڑی مشکل سے سانس لے رہا ہے۔

داش آکل نے غشی اور کرب کے عالم میں بھی اسے پہچان لیا اور لرزتی ہوئی سہمی آواز میں بولا:

"دنیا میں --- بس یہی طوطا --- میرے پاس تھا۔ اسے اپنی جان --- جان --- طوطا --- اسے دے دینا --- اسے!"

پھر وہ خاموش ہو گیا۔ خان نے اپنا ریشمی رومال نکال کر اس کی آنکھوں سے آنسو پونچھے، لیکن داش آکل کی حالت بگڑ گئی اور ایک گھنٹے بعد وہ چل بسا۔

شیراز میں سب نے اس کی موت پر آنسو بہائے۔ خان طوطا اٹھا کر گھر لے آیا۔

اسی روز عصر کے وقت جب مرجان طوطے کا پنجرہ سامنے رکھے اس کے پروبال کی رنگ ریزی، مڑی ہوئی چونچ اور پھٹی پھٹی آنکھوں کو گھور رہی تھی، طوطا بازاری لہجے میں چلّایا:

"مرجان! مرجان! تو نے مجھے مار دیا! میں کس سے کہوں --- مرجان --- تیرے عشق نے --- مجھے مار ڈالا!"

مرجان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

○○

(فارسی عنوان: "داش آکل")

بابا مقدّم

فارسی سے ترجمہ: نیّر مسعود

مُردہ سانپ

گھنی شاخوں اور ہری پتّیوں کی چھتری والا دارزعفران واحد درخت تھا جو کُرستان کے تخت آب و شیون کے علاقے میں نظر آتا تھا۔ کچھ دن ہوئے مجھے شوق پیدا ہوا کہ دارزعفران کو قریب سے جا کر دیکھا جائے۔ تخت آب میں خیمہ لگانے کے پہلے ہی دن میں نے ایک کُرستانی سے اس درخت کا نام پوچھ لیا۔ اس سرزمین کے حدِ نگاہ تک پھیلے ہوئے پست و بلند میں یہ درخت پہچان میں آنے والا تنہا پیڑ تھا جو ایک لمبے ٹیلے پر تنا کھڑا تھا، جیسے کوئی تماشا گر خود حیرت سے اپنی جگہ پر جم کر رہ گیا ہو۔ راتوں کو جب اندھیرا اترنے لگتا تو سیاہ پڑتے ہوئے سُرخ اُفق کے پیش منظر میں درخت ایک دو گھنٹے تک کسی اساطیری ہیولے کی طرح نظر آتا رہتا، اور رات کی سیاہی جتنی بڑھتی جاتی اور ستارے جتنے روشن ہوتے جاتے، وہ تاریکی میں ڈوبتا اور گھلتا جاتا۔ تاریکی نیچے کی گھاٹیوں سے اُٹھتی ہوئی آتی اور درخت کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی۔

تیسرے دن میں نے درخت کے نزدیک جانے کا فیصلہ کیا۔ مغرب کے وقت میں نے چھڑی اٹھائی اور چل کھڑا ہوا۔ سیّد احمد، میرا خانساماں، بھی ہمراہ تھا۔ وہ کوئی پچیس سال کا ہوگا۔ اس کے بھولے بھالے گول زرد چہرے پر مُہاسوں کی کثرت تھی اور اس کی اداس صورت میں کیلی نمایاں چیز اس کی دھنسی ہوئی سوئی سوئی آنکھیں تھیں۔

سورج کی چمک اب آنکھوں کو چبھ نہیں رہی تھی۔ کسی پیتل کے تھال کی طرح وہ دور کی پہاڑیوں سے تھوڑا اوپر فضا میں معلّق تھا۔ اس کے اوپر آسمان میں لگے ہوئے چھدرے بادل کا رنگ کالا پڑتا جا رہا تھا۔ اُس کی نچلی گوٹ البتہ ابھی سرخ تھی۔ میرے سامنے پھیلی ہوئی زمین پر نالیاں ندیوں کی

سی ہوئی تھیں اور اس پر ابھرے ہوئے ٹیلے مل کر سمندر سے ابھری ہوئی بڑی بڑی مچھلیوں کی پشتوں کی طرح معلوم ہو رہے تھے۔

بیچے کی گھاٹیوں میں سائے گہرے ہو رہے تھے اور بلندی کی ماہی پشت زمین پر ہر طرف بکھری ہوئی کرپی کی جھاڑیاں اور پتھروں کی سلیں دھوپ میں چمک رہی تھیں۔ یوں تو دن بھر بھی یہ علاقہ ویران اور خاموش رہتا تھا لیکن غروب کے وقت اس کا سناٹا پُر اسرار، وہم انگیز اور ڈراؤنا سا ہو جاتا تھا۔ نیچے سامنے والی گھاٹی سے ایک بنجارا اوپر جا رہا تھا اور اس سے کچھ آگے بڑھ کر کئی اور بنجارے ایک اور پہاڑی کی کمر پر چل رہے تھے۔ ایک کنارے کے چھوٹے سے ہموار قطعے پر کئی سیاہ خیمے دکھائی دے رہے تھے۔ ان میں سے ایک کے اندر سے دھواں اوپر جا رہا تھا۔ ایک اور خیمے کے سامنے رہ رہ کر شعلے بھڑک رہے تھے۔

ہم ڈھلانوں سے اترتے ہوئے سایہ دار میدان میں پہنچ گئے اور تڑخی ہوئی زمین پر مشکل سے پیر جما کر ایک تودے میں سے اوپر چڑھتے ہوئے ٹیلوں کی روشن پٹی تک آ گئے۔ سورج نیچے اترتا جا رہا تھا جیسے کسی طلائی تختے کی زنجیر کو آہستہ آہستہ ڈھیل دی جا رہی ہو۔ جتنی دیر ہم گھاٹیوں میں چلتے، درزعفران نگاہوں سے اوجھل رہتا۔ ٹیلوں کے اوپر جا کر ہم اس کو دوبارہ دیکھتے اور پھر راستا اس کی جانب موڑ لیتے۔

ہم درخت کے قریب پہنچ گئے تھے۔ اوپر سے وہ چھتری کی طرح تھا، اور زمین کے پاس ہی اس کے تنے سے کئی شاخیں پھوٹی تھیں جو اوپر اٹھ کر تیلیوں کی طرح درخت کی چھتری کو سنبھالے ہوئے تھیں۔ سورج ڈھل چکا تھا اور اب اپنے کنویں میں آخری غوطہ لگانے کو تھا۔ اس کی پھیکی نارنجی روشنی درخت کی چھتری اور تنے کی شاخوں سے چھنتی ہوئی زمین پر پڑ رہی تھی اور اس روشنی میں درخت کے نیچے کی ہموار زمین پر پڑے ہوئے سنگ پاروں کی پرچھائیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ خود درخت کی پرچھائیں اس کے پاس کی زمین پر واضح تھی مگر آگے بڑھ کر دھندلی ہوتی گئی تھی۔ میں اور سیند درخت کی پرچھائیں پر چلتے ہوئے زمین کے روشن دھبوں کے نزدیک پہنچ رہے تھے۔ درخت کی شاخوں پر سیکڑوں چھوٹی چھوٹی چڑیاں بول رہی تھیں۔

سیند نے زور سے ہانک لگائی۔ چونک چڑیاں بھرا مار کر اڑیں اور درخت کے اوپر اوپر چھتر کی طرح گھومنے لگیں۔ سورج کی ایک قاش غائب ہو چکی تھی اور بقیہ حصے کو آسانی سے نظر بھر کر دیکھا جا سکتا تھا۔ اب اس کا رنگ سرخ تھا جیسے پگھلا ہوا لوہا ٹھنڈا ہو چلا ہو۔ اس کے اوپر لگا ہوا چھدرا بادل پورا سیاہ ہو گیا تھا۔ درزعفران کے دوسری سمت تیز ڈھال کی صورت میں تڑخی ہوئی زمین ایک گھاٹی تک چلی گئی تھی۔ گھاٹی کے جھٹ پٹے میں کچھ بنجارے چلتے پھرتے نظر آ رہے تھے۔ ہوا کے ساتھ کسی بچے کی آواز رہ رہ کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ میں اور سیند درخت کے نیچے تھے۔ میں درخت کی چٹخی کھال پر ہاتھ پھیر رہا تھا اور سیند مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر گھوم گھوم کر درخت کو

Scanned with CamScanner

دیکھ رہا تھا۔ اچانک اس کی ڈری ڈری آواز بلند ہوئی:

"ارے، سانپ!"

میں یک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ سید نے ہاتھ سے ایک شاخ کی طرف اشارہ کیا۔

شاخ میں ایک سانپ لٹکا ہوا تھا۔

لیکن مرا ہوا، سید پھر بولا، "گڈریوں نے پھن کچل کر ڈال میں لٹکا دیا ہے۔"

شاخ کی جنبش کے ساتھ اُس کے دونوں طرف لٹکا ہوا سانپ کا بدن بھی دھیرے دھیرے ہل رہا تھا۔ پھن کچلے جانے کی وجہ سے اس کا منہ کھل گیا تھا۔ سرخ رنگ کا گوشت منہ سے باہر نکل آیا تھا؛ ہی میں کہیں اُس کی آنکھیں بھی مل گئی تھیں اور اب ان کا پتا نہیں چلتا تھا۔ اس کی کمر بھی پھٹ گئی تھی؛ پتھر یا لاٹھی کا زخم تھا۔ سفید پیٹ پر کالی اور زرد چتیاں تھیں۔ باقی بدن پر سفید اور راکھی رنگ کے چھوٹے چھوٹے سفنے تھے۔ پتلا لمبا سانپ تھا اور اس کی گردن پر نقطے نقطے تھے جیسے گلوبند لپٹا ہوا ہو۔

سید، جو آگے بڑھ کر اسے دیکھ رہا تھا، بولا:

مادہ ہے؛ گردن دیکھیے کتنی پتلی ہے۔ ان سانپوں کو مارنا نہیں چاہیے۔ جو مارتا ہے، ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے میں نے یہ سانپ دیکھے ہیں کسی سے بولتے نہیں۔ اب دیکھ لیجیے گا، جس نے بھی اسے مارا ہے پائی پائی کو محتاج، جنگل بیابان کی خاک چھانتا، در در بھٹکتا پھرے گا، جیسے میں پورے پانچ سال سے بھٹک رہا ہوں، اور ابھی پتا نہیں کہاں کہاں کا پانی لکھا ہے۔

سورج کی بچی کھچی قاش بھی دور کے پہاڑوں کی اوٹ میں جا چھپی۔ گھاٹیاں تاریک ہو گئیں اور صرف ان کے حاشیوں اور ٹیلوں کی بلندی پر لالی باقی رہ گئی۔ اُس کالے بادل کی گوٹ اب کسی جھاڑی کی طرح معلوم ہو رہی تھی جس میں آگ لگ گئی ہو۔ چڑیاں اب بھی درخت کے اوپر اوپر چکر کاٹ رہی تھیں اور شاخ پر مُردہ سانپ آہستہ آہستہ ہل رہا تھا۔ دور پر سفید دھبوں کے سے ہمارے خیمے بہ مشکل نظر آ رہے تھے۔ ہم درخت سے کچھ دور ہو گئے تو چڑیاں دھیرے دھیرے دو تین چکر کاٹ کر پھر درخت پر بیٹھ گئیں۔ ہم گھاٹی میں پہنچے تھے کہ اُن کی چہچہاہٹ سنائی دی اور سید نے اپنی کہانی شروع کی:

o o o

کس کو یقین آ سکتا تھا کہ مجھے باورچی گیری کرنا پڑے گی۔ میرے ابا بیوپاری تھے۔ خرم آباد میں سب اُن کو جانتے پہچانتے تھے۔ اب بھی، اتنے برس بعد بھی، وہاں اُن کا نام لیجیے تو سب سوداگروں کو یاد آ جائے۔ کنبے میں بس میں تھا اور میری ماں اور مجھ سے بڑی ایک بہن جو بیاہ کر سسرال کی ہو گئی تھی۔ میں ابھی چھوٹا تھا۔ اسکول میں پڑھتا تھا۔ میرے ابا تہران سے مال لا کر بیچتے تھے۔ اچھا بھلا کاروبار تھا۔ بہت سے لوگ تو ہم سے جلتے تھے۔ میری ماں دھیمے مزاج کی بے زبان

عورت تھی۔ بچپن ہی سے میں دیکھتا تھا کہ اُس کے دل میں کچھ ہے جو وہ کسی کو بتاتی نہیں۔ دن میں دو بار وہ اس کوٹھری کے اندر ضرور جاتی تھی جو ہمارے مکان کے بڑے کمرے کے پیچھے تھی۔ وہاں جا کر وہ اندر سے دروازہ بند کر لیتی اور کچھ دیر تک وہیں رہتی تھی۔ مجھ کو اس نے وہاں جانے سے منع کر رکھا تھا۔ کہتی تھی بچوں کو اندھیری جگہوں پر نہ جانا چاہیے۔ میں خود ہی اندھیرے سے ڈرتا تھا اس لیے میرا کبھی وہاں جانے کو جی بھی نہیں چاہتا تھا۔ مجھ کو صرف اتنا پتا تھا کہ اس کوٹھری میں میرے ماں باپ کے کپڑوں کے دو پرانے صندوق ہیں اور ایک بکس، ایک سماور اور کچھ اور سامان۔

ایک دن میں نے ڈرتے ڈرتے دروازے کی بھری میں سے کوٹھری کے اندر جھانکا بھی تو مجھے سامنے کے طاقچے میں رکھے سماور کی چمک نظر آئی، بس۔ غرض وہ کوٹھری مجھے ایک اندھیری اور ڈراونی جگہ معلوم ہوتی تھی اور مجھ کو اس کے اندر قدم رکھنے کی ذرا بھی خواہش نہ ہوتی تھی۔

جاڑوں کی ایک رات کی بات ہے، میں اسکول کا کام کرتے کرتے تھک کر کرسی* کے نیچے جا لیٹا اور سو گیا۔ ابا ابھی آئے نہیں تھے اور ہم نے بھی کھانا نہیں کھایا تھا۔ معمول یہ تھا کہ ابا کے آنے کے بعد سب ساتھ بیٹھ کر کھاتے تھے۔ شاید بھوک ہی کی وجہ سے میری آنکھ کھل گئی۔ باہر نکلا کہ ماں سے کھانا مانگوں۔ اچانک میں نے دیکھا کہ کرسی کے اوپر ایک سانپ کنڈلی مارے بیٹھا ہے۔ طاقچے میں جلتے ہوئے چراغ کی روشنی کرسی پر پڑ رہی تھی۔ پہلے تو مجھے خیال ہوا کہ کوئی رسی وسی ہے لیکن جب اُس نے پھن اٹھا کر میری طرف دیکھا تو میں ایک چیخ مار کر پھر کرسی کے نیچے گھس گیا۔ ماں کمرے سے باہر تھی، میری آواز سن کر آ گئی۔ اس نے مجھے کرسی کے نیچے سے کھینچ کر نکالا۔ میں نے جب اس کو ساری بات بتائی اور قسم کھا کر کہا کہ میں نے اپنی آنکھوں سے کرسی پر سانپ دیکھا ہے تو وہ مجھ کو بہلانے لگی کہ میں نے خواب دیکھا ہوگا ورنہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن مجھے اپنی آنکھوں پر بھروسا تھا۔ مجھ کو یقین تھا کہ میں نے کرسی پر سانپ دیکھا ہے۔ خلاصہ یہ کہ اُس رات میں بڑی بے چین نیند سویا۔ دوسرے دن اسکول جاتے ہوئے میرے دل میں سانپ دیکھنے کی دہشت سمائی ہوئی تھی۔ کلاس میں بھی سارے وقت میری آنکھوں کے سامنے وہی منظر تھا کہ سانپ کنڈلی مارے ہوئے ہے اور پھن اٹھا کر مجھے دیکھ رہا ہے۔

چھٹی کے بعد مجھ کو گھر جاتے ڈر لگ رہا تھا۔ دیر تک گلی کوچوں میں مٹر گشتی کرتا رہا۔ تھک گیا تو ایک مکان کی چبوترہ پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد میں نے دیکھا کہ ماں گھبرائی ہوئی مجھ کو گلیوں میں ڈھونڈھتی پھر رہی ہے۔ وہ بہت پریشان تھی؛ کہتی جاتی تھی کہ سارے شہر کی خاک چھان ڈالی ہے۔

---

*کرسی: ایران کا بڑا سا اونچا تخت جس پر اُس سے بہت بڑی پوشش ڈال دی جاتی ہے۔ جاڑوں میں گھر والے اسی پوشش اور تخت کے نیچے سوتے ہیں۔ برقی حرارت کے رواج سے پہلے گھروں میں کرسی کا سامان عام تھا۔ (مترجم۔)

مجھے دیکھتے ہی لپک کر آئی اور اس آوارہ گردی کا سبب پوچھنے لگی۔ میں نے صاف کہہ دیا کہ گھر میں جو سانپ نکلا تھا، اس سے مجھ کو ڈر لگ رہا ہے اور اب میری وہاں جانے کی ہمت نہیں ہو رہی ہے۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر تھپکنے لگی اور بولی:

"بیٹے، ڈرو نہیں۔ آؤ، گھر چلیں۔ تم نے کچھ اور دیکھا ہوگا، نیند میں تو تھے۔ اور پھر سانپ سے ڈرنا کیا! اگر تھا بھی تو ہمارے ہی یہاں کا سانپ تھا۔ وہ گھریلو سانپ تھا۔ گھریلو سانپ کسی کو ستاتا نہیں۔ سب گھروں میں سانپ کا ایک ایک جوڑا تو ہونا ہی چاہیے۔"

پھر اُس نے مجھے لے جا کر بازار سے گیہوں کی کھیلیں اور بتاشے دلوائے۔ ہم ساتھ ساتھ گھر لوٹے۔ راستے میں اس نے مجھے تاکید کی کہ سانپ والی بات کسی کو نہ بتاؤں۔ میں نے بھی وعدہ کر لیا۔

اس قصّے کو کئی دن گزر گئے اور سانپ والی بات میرے لیے ویسی ہی ہو کر رہ گئی جیسے آدمی کسی پُرانے زخم کی دُکھن کا عادی ہو جائے۔ مگر اس کے بعد سے میں کبھی گھر میں یا کمرے میں اکیلا نہیں رہتا تھا۔ ہمیشہ ماں کے پہلو سے لگا رہتا اور اُسی کے ساتھ مکان میں اِدھر اُدھر آتا جاتا تھا۔ تہ خانے اور خاص کر کوٹھری کا تو رُخ بھی نہ کرتا تھا۔ میں کھٹک گیا تھا کہ جو بھی ہے وہ اسی اندھیری کوٹھری میں ہے جس کا دروازہ ہمیشہ بند رہتا ہے اور صرف ماں اس کے اندر جاتی ہے۔

آخر ایک رات ماں مجھ سے کہنے لگی:

"بیٹے، تمھیں ایک بات بتانا ہے۔ اب تم سیانے ہو گئے ہو اور ضرور ہے کہ تم بھی وہ بھید جان لو اور کسی اور کو نہ بتاؤ۔"

میرا دل بولنے لگا کہ بات اُسی سانپ کی ہے۔ میرا چہرہ فق ہو گیا اور بدن تھرتھرانے لگا۔ ماں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور پھر بولی:

"آخر تو تمھیں پتا چلنا ہی ہے، اسی گھر میں جو رہتے ہو؛ اور کسی نہ کسی دن وہ تمھیں دکھائی دے جائیں گے۔"

میں ماں سے چمٹا ہوا کھڑا سن رہا تھا، لیکن میرا جی چاہا کہ اس کے پاس سے بھاگ کھڑا ہوں۔ مجھے ماں سے بھی ڈر لگنے لگا تھا، جیسے اس نے خود اپنے پاس کہیں سانپ چھپا رکھے ہوں۔ وہ مجھ پر جھکی ہوئی بول رہی تھی اور اس کی گرم سانس مجھے اپنے چہرے پر محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں میرا ہاتھ پسینے سے تر ہو گیا اور مجھے چکر آنے لگا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ میری ماں کے کپڑوں میں سے ابھی ابھی کوئی سانپ سرسراتا ہوا نکلے گا اور سیدھا مجھ پر لپکے گا۔

ماں کہہ رہی تھی:

"لال، آخر تو تم اُن کو دیکھو ہی گے۔ اب اُن سے دوستی کرنا سیکھو۔ وہ تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ جانتے ہو، زیادہ تر مکانوں میں گھریلو سانپ ہوتے ہیں مگر کوئی کسی کو بتاتا

نہیں۔ ہمارا نصیبہ انھیں کے دم سے ہے۔ وہ ہمارے گھر کی حفاظت کرتے ہیں۔ اسی کوٹھری میں رہتے ہیں۔ دو ہیں۔ نہیں میں کا ایک تھا جسے تم نے اس رات کرسی پر دیکھا تھا۔ دوسرا بچہ کرسی کے اس طرف تھا، تمھیں دکھائی نہیں دیا۔ تم چیخ پڑے اور میں آئی تو وہ چلے گئے۔ انھیں شاید خود بھی پتا ہے کہ تم ان سے ڈرتے ہو۔ اسی لیے تو وہ تمھارے سامنے آتے نہیں۔"

ماں کی باتیں سن کر میں ڈر سے کانپنے لگا، منھ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ لیکن بھاگ کر جاتا کہاں۔ اکیلے میں ڈر لگتا تھا۔ کچھ بھی ہو، میں کم سے کم وہاں اپنی ماں کے ساتھ تو تھا۔

بہت کہہ سن کر آخر ماں نے مجھے راضی کر لیا کہ اس کے ساتھ چلوں اور سانپوں سے کچھ کچھ آشنائی پیدا کروں۔ میں دونوں مٹھیوں میں اس کے دامن کو جکڑے ہوئے تھا اور وہ مجھے آہستہ آہستہ آگے بڑھا رہی تھی۔ اس نے کوٹھری کے دروازے کی کنڈی کھولی تو میں نے اس کے لباس میں منھ چھپا لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ ماں نے ایک کنارے ہو کر میرا چہرہ کوٹھری کی طرف گھما دیا۔ دروازے کے کھلے ہوئے پٹ سے آتی ہوئی مدھم روشنی کی چادر سی کوٹھری کے فرش پر پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا تھا اور انگلیوں کے بیچ سے دیکھ رہا تھا۔ اس روشنی میں مجھے دو سانپوں کے چھوٹے چھوٹے خوب صورت سر دکھائی دیے۔ دونوں نے منھ اوپر اٹھا لیے تھے اور ہم کو ٹک ٹک دیکھ رہے تھے۔

ماں کہہ رہی تھی:

'یہ داہنی طرف والا وہی ہے جو تمھیں دکھائی دیا تھا۔ یہ ہمیں ذرا بھی پریشان نہیں کرتے۔ گھر میں ہر طرف آتے جاتے ہیں۔ برسوں سے ہمارے ساتھ ہیں۔ تمھیں بھی ان سے ڈرنا نہیں چاہیے۔ دیکھو نا، کیسے تمھیں دیکھ دیکھ کے حیران ہو رہے ہیں۔ اگر میں ساتھ نہ ہوتی تو دونوں بھاگ کر چھپ گئے ہوتے۔ یہ لوگوں کے سامنے بالکل نہیں آتے ہیں، لیکن تم تو گھر ہی کے ہو۔ اب بڑے ہو رہے ہو۔ چاہیے کہ انھیں اچھی طرح پہچان لو اور یہ بھی تم سے ہل جائیں۔ ہمارا نصیبہ انھیں کے دم سے ہے۔ اور دیکھو بیٹے، کہیں ایسا نہ ہو کسی کے سامنے منھ سے یہ بات نکال بیٹھو کہ ہمارے یہاں سانپ ہیں؛ کسی کو بھی ان کے ٹھکانے کا پتا نہ دینا۔ اپنے ابا کو بھی نہیں۔ بہن کو بھی نہ بتانا۔ وہ خود جانتے ہیں مگر کسی سے کہتے نہیں۔'

پھر وہ آہستہ سے کوٹھری میں داخل ہوئی اور میں اکیلا دروازے پر کھڑا رہ گیا۔ میں دیوار سے لگا ہوا کانپ رہا تھا۔ ماں سانپوں کے قریب پہنچی تو وہ دھیرے دھیرے رینگتے ہوئے آگے بڑھے۔ دونوں ایک ایک طرف سے اس کی پنڈلیوں میں لپٹ گئے اور اس کی جوتیوں اور شلوار کے پائنچوں پر سر رگڑنے لگے۔ ماں ان سے باتیں کر رہی تھی، جیسے لوگ پالتو پرندوں اور جانوروں سے باتیں کرتے ہیں۔ زمین پر پانی کا برتن اور کھانے کا کچھ سامان تھا۔ تھوڑی دیر بعد ماں باہر نکل آئی اور کہنے لگی:

Scanned with CamScanner

"دیکھا بیٹے، کیسے اچھے اور غریب سانپ ہیں! اب تم ان کے عادی ہو جاؤ گے۔ انھوں نے بھی تم کو پہچان لیا ہے اور اب تم سے بھاگا نہیں کریں گے۔ اگر کسی دن ان کے پاس جاؤ اور انھیں پریشان نہ کرو تو وہ اسی طرح تمھارے بھی لپٹیں گے اور تمھارے پیروں پر سر رکھ دیں گے۔"

ماں نے کہہ تو دیا تھا کہ سانپ میرے دوست بن گئے ہیں لیکن میں خود کو اس پر کبھی تیار نہ کر سکا کہ کوٹھری میں جاؤں اور ان کو دیکھوں۔ اُن کا اس گھر میں ہونا میرے لیے مستقل عذاب تھا۔ میں ہر وقت سہما سہما رہتا تھا۔ ذرا سی آواز پر میرا دل بیٹھنے لگتا۔ مجھے وہم ہو گیا تھا کہ ایک نہ ایک دن سانپ مجھ کو ڈس لیں گے۔ مجھے دکھائی دینے لگتا کہ ڈسے جانے کے بعد میرا بدن پھول گیا ہے اور میں تکلیف سے بلبلا رہا ہوں۔ اسی لیے میں کسی بھی وقت گھر میں اکیلا نہیں رہتا تھا۔ کوئی رات ایسی نہ جاتی تھی کہ میں ابّا اور ماں کے بغیر چین کی نیند سو سکوں۔ اکثر سوتے سے چونک کر اٹھ بیٹھتا اور اپنے بستر کو غور سے دیکھنے لگتا۔

ہمارے کمرے کی چھت لکڑی کی تھی۔ چھت پر کڑیاں ڈال کر ان پر نرکل اور لکڑی کی چھیلن بچھائی گئی تھی۔ اُن زمانے میں میرا ایک کھیل یہ بھی تھا کہ چت لیٹ جاتا اور چھت کی کڑیوں کو دونوں جانب سے گن کرتا تھا۔ میں ساری کڑیوں کو اُن کے رنگوں، اُن کی موٹائی پتلائی، اُن کے رخنوں اور گانٹھوں سمیت پہچانتا تھا۔ ایک زمستانی رات جب ہم کھانا کھا چکے تھے، میں اپنی جگہ پر لیٹا چھت کو دیکھ رہا تھا۔ اپنے اسکول اور کلاس کے بارے میں سوچتا ہوا میں کڑیوں کو ایک ایک، اور دو دو، اور کبھی ایک ایک چھوڑ کر گن رہا تھا۔ اسی میں ایک بار جب میں بیچ کی کڑیوں کی جوڑی پر پہنچا تو دیکھا کہ ایک کڑی میں کوئی چیز لٹکی ہوئی دھیرے دھیرے ہل رہی ہے۔ یہ نئی چیز تھی جسے میں نے اب تک نہیں دیکھا تھا۔ پہلے تو مجھے خیال ہوا کہ نرکل یا چھیلن اپنی جگہ سے باہر لٹک پڑی ہے، لیکن فوراً پتا چل گیا کہ انھیں میں کا ایک سانپ ہے جو چھت پر پہنچ گیا ہے۔ ایک گز سے زیادہ اُس کا بدن چھت سے لٹکا ہوا تھا اور وہ نیچے دیکھ رہا تھا۔ میں اچھل کر کھڑا ہو گیا اور کمرے کے ایک کونے میں جا چھپا۔ میری زبان بند ہو کر رہ گئی تھی۔ ابّا اور اماں نے بھی سانپ کو دیکھ لیا تھا اور اب حیران ہو کر ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے، لیکن کچھ بولے نہیں۔ آخر ابّا اٹھ کر آئے اور ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ میں ڈر کے مارے کرسی کے نیچے گھس گیا اور وہیں مجھے نیند آ گئی۔

کچھ دن بعد ابّا نے ایک اچھا سا مکان مول لے لیا اور ہم اسباب سمیت وہاں چلے گئے۔ میں بہت خوش تھا اور سمجھ رہا تھا اب ہمیں سانپوں کی علت سے چھٹکارا مل جائے گا اور مجھے کوٹھری، اور تہہ خانے، اور کمروں کی چھتوں، اور اپنے بستر، اور گھر کے کسی بھی حصے سے ڈر نہیں لگے گا، اور میں بے کھٹکے ہر جگہ جا سکوں گا اور راتوں کو آرام سے سویا کروں گا۔ لیکن میرا خیال غلط تھا۔ جلد ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ سانپوں کا وہی سا جوڑا ہم سے پہلے ہی اس گھر میں پہنچ چکا ہے۔ اب پھر ماں کا

Scanned with CamScanner

کام اُن کی خدمت کرنا تھا۔ وہ روز اُن کو دیکھنے جاتی اور ان کی خوراک پہنچاتی۔ پھر اب کیا ہو سکتا تھا۔ میں اس مکان میں رہنے پر مجبور تھا۔ میرے ماں باپ وہاں تھے؛ میرے سونے کا ٹھکانا وہاں تھا؛ وہی ایک جگہ تھی جہاں ہم کو صبح شام کا کھانا ملتا تھا اور سردی گرمی میں چھت کے نیچے پناہ ملتی تھی۔ اب مجھ کو یقین ہو گیا تھا کہ ہر گھر میں سانپ کا ایک جوڑا ضرور رہتا ہے اور گھر والے مجبور ہوتے ہیں کہ ان کے ساتھ گزارا کریں، انھیں کھانے کو دیں اور دوسروں کو ان کے بارے میں کچھ نہ بتائیں اور اس بات کو راز کی طرح سے سینے میں چھپائے رکھیں۔ اگر مجھ کو کسی کے چہرے پر فکر یا پریشانی نظر آتی اور ایسا محسوس ہوتا کہ وہ کسی دھڑکے میں گرفتار ہے تو میں اپنے آپ سے کہتا، ہو نہ ہو، اس میرے یار کو اپنے گھر کے سانپ دکھائی دے گئے ہیں اور اب ڈر کے مارے اس کی جان پر بنی ہوئی ہے، اس لیے کہ جس دن سے میں نے سانپوں کو دیکھا تھا خود میری یہی حالت تھی۔

ایک دن سہ پہر کے وقت میں اسکول کے لڑکوں کے ساتھ کھیلتا کودتا گھر لوٹ رہا تھا۔ راستے میں رہین کا بڑا سا ہموار قطعہ نظر پڑا جس میں بچے کھیل رہے تھے۔ ہم بھی کبھی کبھی اسکول سے لوٹتے میں دیر دیر تک اس میدان میں دوڑیں لگاتے اور گر گیند پاس ہوتی تو گول بنا کر فٹ بال کھیلتے تھے۔ اُس روز ہم وہاں پہنچے تو ایک لڑکے کو میدان کے کنارے ایک سانپ پڑا نظر آیا جسے مار دیا گیا تھا۔ لڑکے نے اسے اٹھا لیا۔ زرد رنگ کا لمبا سا سانپ تھا۔ اُس کا پیس کسی چیز سے کچل دیا گیا تھا۔ لڑکے نے سانپ کو دُم سے پکڑ رکھا تھا اور اُسے گھما گھما کر دوسرے لڑکوں کو ڈرا رہا تھا۔ جو لڑکے ڈر رہے تھے وہ تو بھاگ کھڑے ہوئے اور جنھیں ڈر نہیں لگا وہ اطمینان سے کھڑے رہے اور سانپ ان کے بدن پر گھماتا رہا۔ لڑکے نے سانپ میری طرف بڑھایا تو میں چیخ مار کر بھاگا۔ سب لڑکے ہنسنے اور میرا مذاق اڑانے لگے۔ آخر اس لڑکے نے سانپ کو ایک گڑھے میں ڈال دیا اور ہم آگے بڑھے۔ راستے میں بھی بعض نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا اور یہ کہہ کہہ کر میری ہنسی اڑاتے رہے کہ میں مرے ہوئے سانپ سے بھی ڈرتا ہوں اور اُسے چھونے کی ہمت نہیں رکھتا۔ جب ہم سبھوں کے سامنے میری کرکری ہوئی اور سانپ سے میرے ڈرنے کا حال سب کو معلوم ہو گیا تو میری غیرت کو جوش آ گیا۔ مجھے یہ گوارا نہ تھا کہ میں سب میں بودا ٹھہروں اور ڈرپوک کہلانے لگوں؛ اس لیے میں نے کہہ دیا کہ مُردہ سانپ سے ڈرنا کیسا، میں تو زندہ سانپ سے بھی نہیں ڈرتا؛ اور اپنی بات کو سچ ثابت کرنے کی دُھن میں یہ بھی بتا گیا کہ ہمارے مکان میں دو دو سانپ ہیں جو ہمیشہ ہمارے ساتھ رہتے ہیں اور میں اُن کے پاس چلا جاتا ہوں اور انھیں ہاتھوں سے چھوتا ہوں۔ میری بات سن کر سب ہنس پڑے اور پھر میرا مذاق اڑانے اور مجھ کو جھوٹا بنانے لگے۔ میں انگاروں پر لوٹ رہا تھا اور خون کے گھونٹ پی رہا تھا، کہہ بیٹھا اگر تم لوگ مجھے جھوٹا سمجھتے ہو اور میری بات کا اعتبار نہیں کرتے تو میں تمھیں وہ سانپ دکھا سکتا ہوں۔ چلو، سب مل کر میرے یہاں چلو۔ وہ سب کے سب خوشی سے چیختے ہوئے راضی ہو گئے اور میرے گھر کی طرف چل

پڑے۔ زرا دیر میں گھر آ گیا۔ ماں گھر پر موجود نہیں تھی۔ راستے بھر مجھے اُس کا یہ کہنا یاد آتا رہا کہ سانپوں کے بارے میں نہ تو کسی سے کچھ کہوں، نہ کسی کو اُن کا پتا نشان بتاؤں۔ لیکن سب معاملہ ہاتھ سے نکل چکا تھا اور پھینکے ہوئے پانی کو اٹھایا نہیں جا سکتا تھا۔

اگر اب میں لڑکوں کو سانپ نہ دکھاتا تو وہ اسکول میں میری جان کو آ جاتے اور میں ہمیشہ کے لیے بزدل اور جھوٹا ہونے کی شرم میں مبتلا رہتا۔

میں نے سیڑھیاں چڑھ کر کمرے کا دروازہ کھولا۔ لڑکے میرے پیچھے پیچھے تھے۔ صرف ہمارے پیروں کی سنسناہٹ سنائی دے رہی تھی۔ سب خاموش اور دم سادھے ہوئے تھے۔ میرا دل سینے میں اس طرح دھڑدھڑ کر رہا تھا کہ میں اس کی آواز سن سکتا تھا۔ سانپوں کا سامنا کرنے کے خیال سے میرے ماتھے پر ٹھنڈا پسینا آ گیا تھا اور پیر کانپ رہے تھے۔ کوٹھری کے دروازے پر پہنچا تو اس کی کنڈی کھولنے کے لیے میرا ہاتھ نہیں اٹھ رہا تھا، لیکن سب لڑکے میرے پیچھے کھڑے، انتظار کر رہے تھے۔ جس لڑکے سے میدان میں مُردہ سانپ اٹھایا تھا وہ آگے بڑھ اور بولا:

"میں سمجھ گیا۔ تمھارے یہاں گھریلو سانپ ہیں۔ مگر گھریلو سانپ تو کسی کو دکھانے نہیں جاتے۔ خیر، اب دروازہ کھولو۔ زرا دیکھیں تو۔"

اور مجھے ہچکچاتے دیکھ تو اس نے خود آگے بڑھ کر یک دم سے دروازہ کھول دیا۔

سب لڑکے گردنیں بڑھا بڑھا کر کوٹھری کے اندر دیکھنے لگے۔ کوٹھری کے فرش پر پانی کا برتن اور کھانے کا سامان تو تھا لیکن سانپوں کا کہیں پتا نہ تھا۔ کچھ لڑکے دبے پاؤں اندر داخل ہوئے اور ہر طرف دیکھنے لگے، مگر سانپ گویا کبھی وہاں تھے ہی نہیں۔ ایک کونے میں ایک ٹوٹی پھوٹی کرسی تھی، طاقچوں میں کچھ برتن اور دوسرا کاٹھ کباڑ، اور بس۔ کچھ لڑکوں نے پانی کا برتن اور کھانا دیکھ کر وہاں سانپوں کا ہونا مان لیا، لیکن بعض پھر بھی میری ہنسی اڑاتے رہے۔

لڑکوں کے جانے کے بعد میری بھی گھر میں ٹھہرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ ماں کے آنے تک میں گلی میں گھومتا رہا اور ہم دونوں ساتھ ساتھ گھر میں داخل ہوئے۔ میں اپنے گھر اور اپنی زندگی کا راز ظاہر کر دینے سے پریشان تھا، اس لیے زردستی دو تین نوالے حلق سے اتار کر جلدی ہی سو گیا۔

دوسرے دن میری ماں معمول سے پہلے ہی گھبرائی ہوئی جاگ پڑی۔ اس کی عجیب حالت تھی، چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا اور آنکھیں کچھ ایسی ہو رہی تھیں کہ ان کی طرف دیکھتے ڈر لگتا تھا۔

وہ کچھ دیر تک کسی سوچ میں گم رہی، پھر لپک کر کوٹھری میں گئی اور ایک دو منٹ اندر رہی۔ میں سانس روکے ماں کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا اب کیا ہوگا؟ کیا اسے وہاں سانپ ملیں گے؟ کبھی سوچتا کہ سانپ غائب ہو گئے ہوں گے وہاں سمجھ جائے گی کہ میں نے کیا حرکت کی ہے۔ وہی ایک موقع تھا جب میرا دل چاہا کہ سانپ موجود ہوں اور ماں کو دکھائی دے

جا ہیں۔ میں جانتا تھا کہ سانپوں سے پیچھا چھڑانے کا یہ صحیح طریقہ نہیں تھا۔ ذرا دیر بعد ماں باہر نکلی، کچھ دیر تک مجھ کو غور سے دیکھتی رہی، پھر ابا سے بولی:

"کچھ پتا ہے؟ سانپ گئے! رات خواب میں آئے تھے۔ کہہ رہے تھے لوگ ان کا بھید جان گئے ہیں اس لیے وہ ہمارے یہاں سے جا رہے ہیں، ہمیشہ کے لیے، اور اب ہم پر جو کچھ بھی پڑے گی اس کے ذمے دار ہم خود ہوں گے۔ بار بار میری آنکھ کھلتی اور میں صلوات پڑھ کر اور شیطان پر لعنت بھیج کر سو جاتی تھی، لیکن ہر بار یہی خواب آتا تھا۔ صبح تک ٹھیک سے سو نہیں سکی۔ اب کوٹھری میں جا کر خود دیکھا تو خواب سچا تھا۔ سانپ گئے۔ کہیں پتا نہیں۔ میں سمجھتی ہوں اسی لڑکے نے کوئی گل کھلایا ہے۔"

پھر اس نے ڈانٹ کر مجھ سے معاملہ پوچھا۔ میں نے بھی جو کچھ ہوا تھا سب کا سب بتا دیا۔ ماں نے یہ ماجرا سنا تو اس کے سینے سے ایک آہ نکلی اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ میں اس کا اکلوتا بیٹا تھا اس لیے اس نے مجھ سے زیادہ کچھ تو نہیں کہا لیکن اتنا ضرور کہا:

"بیٹے، تم نے ہماری زندگی برباد کر دی۔ ہمارے گھر کا اقبال رخصت کر دیا، بد نصیبی کو دعوت دے دی۔ مجھے ڈر ہے اب تھوڑے ہی دن میں ہم محتاج اور دربدر ہو جائیں گے۔ یہ سانپ پشتوں سے ہمارے یہاں چلے آ رہے تھے۔ ہمارے گھر کے نگہبان تھے۔ انھیں شاید پتا تھا تم ان کو ہلکا کر دو گے۔ ان کا دل تم سے نہیں مل رہا تھا، اسی لیے وہ تم سے دور دور رہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ تم کو اپنی زبان پر قابو نہیں، تم گھر کا راز نہیں چھپا سکتے۔ آخر تم نے وہی کیا جس کا مجھے ڈر تھا: سانپ گئے، اور ہم بے سہارا رہ گئے۔ مجھے تو یہ بھی ڈر ہے کہ خدا نہ کردہ وہ تمھیں کچھ آزار نہ پہنچا دیں۔"

کئی دن تک میں سخت وحشت میں گرفتار رہا اور ڈرتا رہا کہ کہیں مجھے کوئی سانپ ڈس لے۔ ماں نے مجھ کو بہن کے گھر بھیج دیا۔ کئی دن تک وہیں رہا، اپنے گھر میں قدم نہیں رکھا۔ یہاں تک کہ ایک ہفتے بعد ماں نے آ کر بتایا کہ اسے پھر خواب میں سانپ نظر آئے ہیں اور انھوں نے کہا ہے کہ اگرچہ ان کو ہمارا گھر چھوڑنا پڑا ہے لیکن وہ ہم سے کوئی سروکار نہیں رکھیں گے اور مجھے بھی کچھ نہیں کہیں گے۔ اس لیے ماں مجھے گھر لے گئی۔

اس قصے کو زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ میرے ابا کا کاروبار الٹ پلٹ ہو گیا۔ تہران سے جو مال وہ بیچنے کو لائے تھے اس کا مندا پڑ گیا اور بکری نہیں ہو سکی۔ انھوں نے نقصان بھرنے کے لیے دوسرے دھندوں میں ہاتھ ڈالا لیکن سب میں گھاٹا ہی گھاٹا رہا۔ شہر بھر میں بات پھیل گئی کہ وہ دیوالیے ہو گئے، اور لین دار ان پر چڑھ دوڑے۔ جو کچھ ہمارے پاس تھا سب ہاتھ سے جاتا رہا۔ مکان تک نکل گیا۔ وہ شخص جس کے بھاگوان ہاتھوں کی دھوم تھی اور جو مٹی کو چھو دیتا تو سونا ہو جاتی، اس کا وقت ایسا آیا کہ کرائے کے ایک کمرے میں زمین پکڑ کے بیٹھ رہا اور تھوڑے ہی دن میں مر

Scanned with CamScanner

گیا۔ سب کا یہی کہنا تھا کہ پریشانیوں اور کوفت نے جان لے لی، لیکن جن لوگوں کو سانپوں کے معاملے کی خبر تھی وہ جانتے تھے کہ اس بدبختی اور سیاہ روزی کا اصل سبب میں ہوں۔

باپ کے مرنے کے بعد مجھ کو اسکول چھوڑنا پڑا۔ مدت تک ڈرائیوری کی، اس شہر سے اس شہر دوڑتا پھرا۔ جان کھپا کر اور دوسرے ڈرائیوروں کی گالیاں کھا کھا کر پیسے جمع کیے اور ایک ٹیکسی خریدی۔ شہر کے باہر کی بستیوں کے پھیرے کرتا تھا۔ کام چل نکلا اور قریب تھا کہ جم جاؤں اور گھر بسا لوں۔ ماں بھی بڑی خوش تھی۔ مگر ایک دن شام کے وقت جب میں سواریاں لے کر شہر سے واپس آ رہا تھا، شہر کے قریب ایک موڑ مڑتے ہوئے میری نگاہ ایک مردہ سانپ پر پڑ گئی جس کا پھن کسی گاڑی کے نیچے آ کر پچک ہو گیا تھا۔ بالکل ویسا ہی سانپ تھا جیسے ہمارے یہاں تھے۔ دم بھر میں ایک عجیب سی دہشت سے میرا بدن کپکپا گیا۔ میں نے گاڑی کو ایک طرف کاٹا کہ سانپ اس کے نیچے نہ آنے پائے۔ اس طرف ایک بڈھا اپنے خچر پر ڈھیروں لکڑیاں لادے پہاڑ سے اتر کر شہر جا رہا تھا۔ قریب تھا کہ دونوں کو روند ڈالوں۔ جلدی سے میں نے گاڑی کو پھر دوسری جانب کاٹا۔ اتار کا راستا تھا۔ بریک ماروں تو گاڑی الٹ جائے۔ اور ہوا بھی۔ ایک دو ڈھلکنیاں کھا کر ہم ایک کھڈ میں جا پڑے۔ مسافروں میں سے دو وہیں کے وہیں ختم ہو گئے، دو تین زخمی بھی ہوئے۔ میرا بھی ہاتھ ٹوٹ گیا، اور گاڑی تو ایسی پسی کہ کسی کام کی نہ رہی۔

اس لیے میں نے سمجھ لیا کہ دوڑنے دھوپنے سے کچھ نہیں ہوتا؛ اس وقت کا انتظار کرنا چاہیے جب وہ میرا پیچھا چھوڑ دیں۔ میں نے آوارہ گردی شروع کر دی۔ کبھی یہاں، کبھی وہاں، دو نوالوں کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ اب خانساماں ہو گیا ہوں۔ ماں اکیلی بیٹھی میری لگائی ہوئی آگ میں جل رہی ہے۔ جب میری حالت پر اس کا دل بہت کڑھتا ہے تو کہتی ہے:

"بیٹا، تم نے ہمیں بھی برباد کیا، خود بھی کہیں کے نہ رہے۔"

o o o

ہم آخری پہاڑی پر چڑھ رہے تھے۔ ہمارے خیمے تھوڑی ہی دور رہ گئے تھے۔ مغربی افق کی سرخی سیاہی میں ڈھلتی جا رہی تھی۔ کالے بادل نے کسی بہت بڑے اژدہے کی طرح درِ زعفران کی چھتری کو نگل لیا تھا۔ درخت کا تنا یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے آگ کے شعلوں میں کوئی ہاتھ پھیلائے کھڑا ہو۔

سید نے کہا:

"اور آج، قسمت کا لکھا یہ تھا کہ ہم اس درخت کو دیکھنے جائیں اور وہاں ہمیں مردہ سانپ دکھائی دے جائے۔ یہ اشارہ ہے اس کا کہ مجھ کو جلد سے جلد یہاں سے رخصت ہونا ہے۔ جاتا ہوں، بستر باندھ لوں۔ کل صبح روانہ ہو جاؤں گا۔"

oo

(فارسی عنوان: "لاشہ مار")

Scanned with CamScanner

بزرگ علوی

فارسی سے ترجمہ: اجمل کمال

پیسے کا سپاہی

چار پانچ سال سے میرا معمول ہے کہ دن میں چار بار میدانِ سپاہ سے شاہ پور جانے والی بس میں سوار ہوتا ہوں۔ عجیب بات یہ ہے کہ میں نے ان بسوں میں اُس سے کہیں زیادہ سیکھا ہے جتنا ابتدائی اسکول میں آٹھ برس اور درمیانی اسکول میں دو برس تعلیم حاصل کرنے میں سیکھا تھا۔ مگر یہ کچھ ایسی تعجب کی بات بھی نہیں کیوں کہ میں بنیادی طور پر ایک کند ذہن اور کم فہم بچہ تھا۔ جب کبھی دو یا تین بار دُہرائے جانے پر بھی کوئی بات میری سمجھ میں نہ آتی اور میں استادوں سے — خدا اُن کی مغفرت کرے — سوال کرتا، تو وہ کہتے: کچھ لوگ کبھی نہیں سمجھتے۔ لیکن ان بسوں میں ہر اہم چیز میری دسترس میں آ گئی۔ کبھی یہ ہوتا تھا کہ گاڑی ابھی پوری بھری نہیں ہوتی اور مسافروں کی تلاش و جستجو کے زور پر سرکتے سرکتے حسن آباد کے چوراہے تک پہنچ جاتی، اور اس دوران ڈرائیور کا شاگرد مسافروں کی تلاش میں متواتر تاکتا رہتا۔ اگر کوئی مسافر اس کی نظر سے چوک جاتا تو ڈرائیور کہتا: تیرا دھیان کدھر ہے؟ چل اس دس شاہی کو سوار کر! یا اس دس شاہی کو مفت ہاتھ سے جانے دیا! اِس دس شاہی کے لفظ کی ہر صورت میں بہت تکرار ہوتی تھی اور اس سے مراد مسافر ہوتا تھا۔ ہر شخص کی قیمت ڈرائیور کی نظر میں دس شاہی کا سکہ تھی حالاں کہ بعض صورتوں میں وہ شخص مثلاً حاجی آقا جوبچی بھی ہو سکتا تھا جس کے پاس ایک لاکھ تومان سے بھی زیادہ دولت تھی، یا مویشیوں کے بندوبست کے محکمے کا سربراہ بھی جس نے یہ منصب حاصل کرنے کے لیے آٹھ سو تومان کی رقم ادا کی تھی اور جسے دو تین ہزار تومان منافعے کے علاوہ چار سو تومان تنخواہ بھی ملتی تھی۔

سی طرح خود میں بھی تنخواہ پانے کے دن تقریباً سات سو دس شاہیوں کے برابر رقم کا مالک ہوتا تھا، مگر اُس کی نظر میں میری قیمت وہی دس شاہی تھی، اور تنخواہ پانے سے ایک دن پہلے جب ٹکٹ کے پیسے دینے کے بعد میری جیب موسن کے دل کی طرح پاک صاف ہو جاتی، تب بھی اس کے نزدیک میری قیمت میں کچھ فرق نہ آتا تھا۔ ایک روز ایسی ہی کسی بس میں ایک ادھیڑ عورت بیٹھی تھی اور اس نے بس کی کھڑکی کے سرے پر سیسے کا ایک کھلونا سپاہی ٹکا رکھا تھا۔ کچھ کچھ دیر بعد وہ سے اٹھا کر اس کا سر اپنے منہ میں لے لیتی اور پھر واپس اُسی جگہ رکھ دیتی تھی۔ جب کبھی وہ کھلونا اس کے جھٹکے سے نیچے گر پڑتا تو وہ اسے پھر اٹھا کر منہ میں ڈال لیتی۔ میں بہت دیر اسے یوں ہی مشغول دیکھتا رہا۔ پھر میں نے مڑ کر دیکھا تو اپنے بالکل پیچھے ف کو بیٹھا پایا۔ وہ مجھ سے سلام دعا کرنے لگا۔ میں اس سے جنوب کے سفر کے دوران متعارف ہوا تھا۔ بس سے اترنے کے بعد مجھے خیال آیا کہ میرا یہ شناسا سی قسم کے سیسے کے سپاہی بنا کر دکانوں کو فروخت کیا کرتا ہے۔ بہت عرصہ گزر گیا اور میں نے ف کو پھر نہ دیکھا۔ اُن دنوں میں تحدیدِ الفیون کے محکمے میں کام کرتا تھا؛ مجھے فسا کے مقام پر تعینات کر دیا گیا جہاں میں بیمار پڑ گیا، واپس چلا آیا اور مدتوں بے کار رہا۔ واپس آنے پر، تقریباً دو سال بعد، میں ف سے ملنے گیا۔ وجہ یہ تھی کہ فسا میں محکمۂ مالیات میں کام کرنے والا ایک شخص اسے جانتا تھا اور اس نے میرے ہاتھ اُس کے لیے تھوڑی سی افیون بھیجی تھی۔

مجھے اپنے دوست میں کچھ عجیب سی بات محسوس ہوئی۔ اس کا کمرہ، جہاں وہ کام کرتا تھا اور جو پہلے دیگوں، سیسے کی چادروں، کوئلہ، برتنوں اور بھٹیوں سے بھرا رہتا تھا اور اس کے باوجود ترتیب کی حالت میں محسوس ہوتا تھا، اب بالکل درہم برہم دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے افیون کی چلم تیار کی اور ہم دونوں صحن میں غالیچہ بچھا کر بیٹھ گئے۔ باتوں باتوں میں اُس عورت کا ذکر چھڑ گیا۔ پھر وہ مجھے اپنا قصہ سنانے لگا، پہلے پہل ذرا نیم دلی سے، اس کے بعد، یہ جان کر کہ اسے کریدنے میں میری کوئی غرض شامل نہیں ہے، روانی سے بولنے لگا مگر اس کی باتیں سے ربط تھیں۔ اس میں بہت کچھ تو ایسا تھا کہ اس کا سر پیر ہی میری سمجھ میں نہ آیا۔ پھر اس نے قصہ بیچ ہی میں ختم کر دیا اور اِدھر اُدھر کی باتوں سے میں نے یہی اندازہ لگایا کہ وہ کسی مشکل میں پڑ گیا تھا۔ مگر آخر کار میں اس کی دیوانگی کا اصل سبب نہ سمجھ پایا۔

o o o

پہلے ذرا میں شروع شروع کی باتیں یاد کر لوں، پھر تمہیں بتاتا ہوں۔ یوں تو میرا قصہ ہی کیا ہے؟ میری خود سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں سے شروع کروں۔ اپنے پیدا ہونے کے دن سے؟ اُس دن سے جب میں نے اپنے داہنے اور بائیں ہاتھ کو پہچاننا سیکھا تھا؟ یا اپنی خاندانی زندگی کے ذکر سے؟ اس سے کہ میرا باپ کس طرح کا آدمی تھا؟ مجھے اپنی ماں سے کس قدر محبت تھی؟ نہیں، یہ میرے بس سے باہر ہے۔۔۔"

افیوں کا نشہ کرنے والوں کا بولنے کا ایک مخصوص طریقہ ہوتا ہے۔ ایک جملہ شروع کرتے ہیں، پھر چلم پر تھوڑی سی افیون رکھ لیتے ہیں، اور جب تک وہ ختم نہیں ہوتی جملہ بھی پورا نہیں ہوتا۔ سننے والے کو بہت صبر سے کام لینا پڑتا ہے اور بیزار ہوئے بغیر افیوں کی سُوں سُوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ جو بات ان افیونیوں کی گفتگو کو گوارا بناتی ہے وہ اُن کی آواز کی شیرینی اور ملاحت ہے۔

کچھ یاد ہے کہ ہم کس جگہ تھے؟ کون سی جگہ تھی جہاں ہماری ملاقات ہوئی تھی؟ جنوب کے راستے میں کوئی جگہ تھی، پتا نہیں، شاید کازرون۔ تم سے الگ ہونے کے بعد ہاں، اب پانچ سال گزر چکے ہیں۔ میں بُوشہر چلا گیا تھا، ایک مہینا بوشہر میں ٹھہرنے چلا گیا تھا۔ مجھے وہاں ایک خاص کام تھا، ہوتے ہوتے ایک مہینے کے ایک سال اور ایک مہینہ ٹھہرا۔ محکمے سے بھی نکال دیا گیا، کہنے لگے تہران واپس آؤ۔ میں نہیں آیا، وہیں ٹھہر رہا۔۔۔ تم بے تاب ہو رہے ہو۔ تم جاننا چاہتے ہو کہ میرا اُس عورت اور اُس کے کھونے سے کیا تعلق ہے جسے تم نے اُس روز بس میں دیکھا تھا۔ ذرا ٹھہرو، صبر کرو۔ تمہیں جاننا چاہیے کہ میری زندگی، جس دن سے میں اپنے باپ سے جدا ہوا ہوں، اس کاٹھ کباڑ سے آگے نہیں گئی ہے جسے تم ادھر اُدھر بکھرا دیکھ رہے ہو۔ ایسے بھی دن گزرے ہیں جب میں نے دوپہر کا کھانا نہیں کھایا تھا اور نہ رات کا، کیوں کہ میرے پاس جو بھی چیز ہوتی میں اسے بیچ کر افیون پر خرچ کر ڈالتا تھا۔ میری یہ زندگی تمام میرے باپ کا قصور ہے۔ مگر شاید ایسا نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو میں آدمی کیوں نہ بن جاتا۔ ٹھیک ہے نا؟ تم مجھے اچھا نہیں سمجھتے کیوں کہ مجھے افیون کی لت ہے۔ اور ٹھیک بھی ہے، مگر تم نہیں جانتے کہ میں خود بھی اپنے آپ سے بیزار ہوں۔۔۔ نہیں جانتے، دیکھو! میرے ہاتھوں کو دیکھو، میری قمیص کے کالر کو دیکھو۔ دو ہفتے ہو گئے ہیں کہ میں نے منہ نہیں دھویا۔ فرض کرو۔۔۔ مگر اب کیا ہو سکتا ہے! میں ہمیشہ سے تو افیونی نہیں تھا۔ ہمیشہ سے ایسا تو نہیں تھا، ایسا تو نہیں تھا۔ جب بوشہر میں تھا تو افیونی نہیں تھا۔ بعد میں افیون پینے لگا۔ میری ماں انہیں دنوں مری تھی۔ وہ یاد آتی ہے تو میرا بدن کانپنے لگتا ہے۔ وہ بھی مجھے بہت چاہتی تھی۔ میں سولہ سال کا تھا مگر جب تک اُس کا ہاتھ ہاتھ میں نہ لے لیتا مجھے نیند نہیں آتی تھی۔ یہ ایسی باتیں نہیں ہیں جنھیں ہر کوئی سمجھ سکے۔ بوشہر میں۔۔۔ ہاں، بوشہر میں میں اپنے افسر کے ساتھ اس کے گھر میں رہتا تھا۔ بے چارہ اب افیون کی اسمگلنگ کے الزام میں جیل کاٹ رہا ہے۔ اور وجہ اس کی یہ تھی کہ میری آواز خاصی ہے، کیوں کہ میں نے اپنے باپ کی زندگی میں موسیقی سیکھی تھی۔ میرا افسر بھی باذوق آدمی تھا۔ شام ہوتے ہی لڑکے بالے جمع ہو جاتے اور عرق اور شراب کی بساط بچھتی اور محفل جم جاتی۔ تمہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اس وقت تک میں نے عرق بھی نہیں چکھا تھا۔ سچ کہتا ہوں، اس وقت تک میں سب حماقتوں سے دور تھا۔ کوئی گروہ مجھے اپنا حصہ شمار نہ کرتا تھا۔ ایک تو میں آخوند کا لڑکا تھا، پھر سلیقے سے رہنے والا، کھُل کھیلنے کی ہمت بھی نہ رکھتا تھا۔

Scanned with CamScanner

زندگی میں میری سب سے بڑی لذت بس یہ تھی کہ بنی ماں کے پہلو سے لگا بیٹھا رہوں، اس کے نرم ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لوں اور اس کی دلداری کروں۔ ایک رات انھوں نے مجھے کچھ زیادہ عرق پلا دیا اور میرے ہوش جاتے رہے۔ مجھے اس رات کی کوئی بات یاد نہیں۔ صبح دیکھا کہ کوکب کمرے میں بیٹھی ہے۔ وہ تشت اور آفتابہ لے کر آئی تھی، قالین دھونے کے لیے جس پر میں نے رات کو قے کر دی تھی۔ اس کا چہرہ کھلا ہوا تھا اور میں اسے دیکھ سکتا تھا۔ اس کے ہونٹ سرخ تھے اور زلفیں چھتر کی طرح اس کی پیشانی پر سایہ کیے ہوئے تھیں۔ اور اس کا چہرہ گول اور گداز تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ آغا اسے شیراز سے دایہ کے طور پر لایا تھا اور وہ سال بھر کے لیے اس گھر میں ملازم تھی۔ سال پورا ہو چکا تھا، مگر اچھی خادمہ تھی اس لیے وہ لوگ اسے جانے نہیں دینا چاہتے تھے۔ یہ سب باتیں خود اس نے مجھے بتائی تھیں۔ ’ٹھیک ہے، سال بھر کی بات تھی، میں نے جیسے تیسے ان کے ساتھ گزارا کر لیا۔ مگر اب یہاں نہیں رہنا چاہتی۔ آغا بہت اچھے ہیں، باقی سب میں بھی کوئی برائی نہیں۔ بچے سے بھی مجھے انس ہو گیا ہے۔ مگر صاف بات ہے کہ میں اب جا کر شادی کرنا چاہتی ہوں۔ شیراز جانا چاہتی ہوں، اپنے پہلے شوہر کے پاس۔ اس کی فوج کی ملازمت پوری ہو چکی ہے۔ اس نے مجھے ایک طلاق دے دی تھی، مگر میں دوبارہ اس سے شادی کر سکتی ہوں۔ میں چلی جاؤں گی، ان کی زرخرید تھوڑا ہی ہوں۔‘ اور وہ یہ سب سوچ سمجھ کر کہہ رہی تھی۔ مجھے یہ بتانا یاد نہیں رہا کہ جب کوکب مجھ سے دل کی باتیں کر رہی تھی تو میں نے جواب دیا: ’تمھاری بات درست ہے۔ اگر میں آغا کی جگہ ہوتا تو تمھیں روانہ کر دیتا۔‘ اور اس نے اپنی بات پر عمل کیا۔ ایک رات جب میں گھر پہنچا تو کوکب کو اپنے کمرے میں دیکھا۔ وہ اس لیے آئی تھی کہ میں اسے شیراز روانہ کر دوں۔

اس طرح کوکب کے ساتھ میرا قصہ شروع ہوا۔‘

افیون کے دھوئیں کے پہلے سفید اور پھر نیلے حلقوں نے اس کی گفتگو کو کسی فلسفی کی شان عطا کر دی تھی۔

’جب بھی یہ عورت میری زندگی میں آئی، اس نے ہر چیز تہ و بالا کر دی۔ اگر تم سو وہوس کی چھوٹی سے چھوٹی بات کا بھی تصور کرو تو وہ میرے اور اس عورت کے درمیان نہیں تھی۔ میں کوکب کو پسند کرتا تھا، میں اسے چاہتا تھا، بالکل اس طرح جیسے کوئی اپنی ماں کو چاہتا ہے۔ مگر ہمارے درمیان کوئی رشتہ نہیں تھا۔ تمام رنج جو میں نے زندگی میں اٹھائے، اور وہ تمام تکلیفیں جو مجھے، براہ راست یا بالواسطہ طور پر، کوکب سے پہنچیں، وہ سب میری تقدیر کا حصہ تھیں۔ میں اس زندگی کا محکوم تھا۔ میری زندگی کا پہلا دن، اور باپ کے سائے اور ماں کی گود میں میری نشوونما، اس سب نے مجھے زندگی میں ایک خاص راہ اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ ان سب چیزوں نے کچھ نہ کچھ اسباب تھے، اور میں بے چارہ ان اسباب کے ہاتھوں میں کھلونا بن گیا۔ میرا بس چلے تو میں نے چاہا کے بجائے کہوں: مجھے چاہنے پر مجبور کیا گیا۔‘

Scanned with CamScanner

کھانسی کے ایک طویل اور نہ ختم ہونے والے دورے نے اس کی بات کاٹ دی۔ چند منٹ بعد اس نے دوبارہ کہنا شروع کیا:

"خیر، اصل قصہ تو بیچ ہی میں رہ گیا۔ تو ایک رات کوکب میرے کمرے میں آ گئی تاکہ صبح روانہ ہو سکے۔ طے ہوا کہ میں صبح اسے گاڑی میں سوار کر کے شیراز روانہ کروں گا۔ میرے پاس ایک ہی کمرہ تھا۔ ایک گلیم خرید کر اس میں بچھا رکھی تھی۔ کمرے کا آدھا فرش خالی تھا۔ کوکب نے اپنی گٹھری کھول کر بچھائی اور سو گئی۔ اگلی صبح سویرے ہی میں گاڑی کی تلاش میں روانہ ہو گیا اور اس کے جانے کا سب بندوبست کر لیا۔

"دوپہر کو جب گھر واپس آیا تو کوکب نہیں تھی۔ میں نے گیراج کے منتظم سے طے کیا تھا کہ مسافر کی روانگی شام کے وقت ہو گی۔ بہت دیر تک میں خالی بیٹھا اس کا انتظار کرتا رہا اور دفتر بھی نہیں گیا۔ مغرب کے وقت دیکھتا ہوں کہ کوکب واپس چلی آ رہی ہے اور اس کا حال سخت خراب ہے۔ بولی: میں صبح سے تمہاری تلاش میں گھوم رہی ہوں۔ رات کو جب میں نے اپنا اسباب جمع کیا تو پتا چلا کہ ایک چیز گم ہے۔ اگر وہ نہ ملی تو مجھے یقین ہے کہ راستے میں مجھ پر کوئی مصیبت ضرور آئے گی۔ جواب میں میں نے اپنے جوتے پہنے اور اپنے کام پر روانہ ہو گیا۔ اس رات میں دیر سے گھر لوٹا۔ دیکھا کوکب اپنی گٹھری کے پاس بیٹھی کچھ ٹٹول رہی ہے۔ میں نے پوچھا: آخر کیا کھو گیا ہے؟ کیوں کہ مجھے احساس ہوا کہ وہ سسکیاں بھر رہی ہے۔ بولی: ایک کھلونا تھا۔ میں نے پوچھا: کیسا کھلونا؟ کہنے لگی: سیسے کا سپاہی۔ میں نے حیران ہو کر کہا: سیسے کا سپاہی تو دس شاہی میں مل جاتا ہے، اس کے لیے رونے دھونے کی کیا ضرورت ہے؟ مگر معلوم ہوتا تھا کہ میری بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ بولی: دس شاہی؟ میرے لیے تو وہ جان کے برابر قیمتی ہے۔

"یہ سیسے کا سپاہی کوکب کو آغا کے بچے سے ملا تھا۔ ایک روز وہ بچے کو سیر کرانے لے جا رہی تھی اور اس نے یہ کھلونا کسی بساطی کی دکان سے خریدا تھا۔ لیکن اس کھلونے کی نوک سے بچے کا ہاتھ کٹ گیا تھا، اس لیے خانم اسے اس سے کھیلنے نہیں دیتی تھی۔ اسی وجہ سے کوکب خانم سے آزردہ ہو گئی تھی اور یہاں رہنے پر آمادہ نہیں تھی۔ اس کے بعد سے وہ اس کھلونے کو ہمیشہ اپنی نظروں کے سامنے رکھتی تھی، اور اب اس کے لیے غم زدہ تھی۔ اس کے گم ہو جانے کو اس نے بدشگونی سمجھا تھا۔

"کچھ دن میرے ساتھ رہنے کے بعد وہ مجھ سے کہنے لگی: جانتے ہو، میرا دل کھٹا ہو گیا۔ اب میں شیراز واپس نہیں جانا چاہتی۔ میرا خیال ہے میرا شوہر بھی مجھ سے بیزار ہو گیا ہے اور اب مجھے اپنے ساتھ نہیں رکھے گا۔ اگر تم چاہو تو یہاں رہ کر تمہاری خدمت کیا کروں۔ ورنہ کہیں اور چلی جاؤں گی۔ مجھے اس وقت تک اسی شہر میں ٹھہرنا ہو گا جب تک وہ کھلونا سپاہی مل نہیں جاتا۔ نہیں تو میں مر جاؤں گی۔

Scanned with CamScanner

کوکب رک گئی، اور مری نہیں۔ وہ وہاں ایک مہینے ٹھہری اور مجھے مار ڈالا۔ رات کو میں چھت پر چلا جاتا اور کوکب کمرے میں سوتی۔ صبح کو مجھے چائے بنا کر دیتی، میرے کپڑے دھوتی اور میرے لیے کھانا پکاتی۔ بعض اوقات ہم ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ جس طرح وہ میرا خیال رکھتی تھی، مجھے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ میری ماں ہو، اور میں اس خیال میں خوش رہتا تھا۔ شام کے وقت ہم ساتھ بیٹھا کرتے۔ ایک مہینہ اسی طرح گزرا۔ اس کے بعد میرا تبادلہ تہران کر دیا گیا۔ میں نے کوکب سے کہا: مجھے تہران جانا ہوگا۔ کہو تو تمہیں بھی ساتھ لے چلوں۔ بولی: نہیں، میں یہیں ٹھہروں گی۔ مجھے اُس سپاہی کو تلاش کرنا ہے، یہیں تو مر جاؤں گی۔ پھر کچھ سوچ کر کہنے لگی: تم کب جا رہے ہو تہران؟

"میں نے کہا: سنیچر کے دن۔

"وہ رات کا کھانا تیار کرنے کو ٹھہر گئی ہوئی۔ بولی: ٹھیک ہے، سنیچر تک میں بھی اپنا کوئی انتظام کر لوں گی۔ میں نے کہا: ٹھیک ہے، سنیچر تک کر لینا۔ مگر میں سنیچر کو روانہ نہیں ہوا۔ اگلے سنیچر کو بھی نہیں، اور اُس سے اگلے سنیچر کو بھی وہیں تھا۔ تہران سے پیغام پہنچا کہ میں نے اپنی روانگی کی اب تک اطلاع کیوں نہیں دی۔ میں نے خط کو پھاڑ کر پھینک دیا۔ چوتھے ہفتے سے میری تنخواہ بند ہو گئی، اور ان چار ہفتوں میں بھی کوکب اپنا کوئی اور انتظام نہ کر سکی۔ ایک شام میں نے اس سے پوچھا: جو سیسے کا سپاہی تمہارے پاس تھا اُس کی شکل کیسی تھی؟ بتاؤ، ہو سکتا ہے بالکل ویسا ہی مل جائے تو تمہارے لیے خرید لوں۔

"بولی: خوامخواہ خود کو تکلیف نہ دو۔ میں نے پورا شہر چھان مارا ہے، ویسا سپاہی کہیں نہیں ملا۔ مگر سنو، تم رات کو کروٹیں بدلتے اور بڑبڑاتے کیوں رہتے ہو؟ کل رات میں تمہارے سرہانے آئی تھی۔ تم اپنی ماں کے واسطے کیوں اتنے بے تاب رہتے ہو؟

"وہ ٹھیک کہتی تھی۔ مجھے یاد تھا، گزشتہ رات میں خواب میں دیکھ رہا تھا کہ کوئی مسلح دار ننگی تلوار لیے میری ماں پر حملہ کر رہا ہے، اور میرا باپ ساکت کھڑا دیکھ رہا ہے۔ مگر اصل وجہ یہ تھی کہ میں اُن دنوں بہت عرق پیا کرتا تھا۔

اگلے دن میں کوکب کو ساتھ لے کر سیسے کا سپاہی خریدنے نکلا۔ مگر بے سود۔ ہم جہاں کہیں پہنچتے کوکب یہی کہتی کہ نہیں، یہ گڈا ویسا نہیں ہے۔

"تب میں سوچنے لگا کہ جیسا کوکب کہتی ہے ویسا سپاہی اسے خود بنا دوں۔ میں نے لکڑی کے سانچے بنا لیے، سیسہ خریدا، مگر یہ سب چیزیں تو تم خود دیکھ چکے ہو۔۔۔ بہرحال، جیسا کوکب چاہتی تھی ویسا سپاہی نہ بن سکا۔ ہوا یہ کہ میں یہ سپاہی بنا بنا کر بیچنے لگا اور یوں زندگی گزارنے کی ایک سبیل پیدا ہو گئی، اور اب بھی یہی کرتا ہوں۔ مگر کیا فائدہ! وہ پہلا سپاہی، وہ سپاہی کبھی نہ بن سکا، سال بھر تک کوشش کرنے کے باوجود نہ بنا۔ ہمارے دن اسی طرح گزرتے، اور رات میں ہم

باتیں کیا کرتے، کبھی کبھی کوکب اپنے شوہر کا تذکرہ کرتی جو اس وقت تک فوجی خدمت میں تھا۔۔۔"

یہاں میں نے ف کی بات کاٹی، کیوں کہ اس کی باتیں ذرا بھی میرے پلے نہیں پڑ رہی تھیں۔ آخر کوئی شخص کسی خادمہ کے لیے تو اس قدر رحمت نہیں اٹھاتا، مگر مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اس قصے نے اس پر بہت گہرا اثر چھوڑا ہے اور اسے سخت متاثر کر ڈالا ہے۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ کوئی بہت گہری بات چھپا گیا ہے۔ اس لیے میں نے اس سے پوچھا، "مگر تم اسے پسند تو کرتے تھے؟ حالاں کہ تم نے پہلے کہا تھا کہ تمہارا اس سے کوئی رشتہ نہیں تھا؟"

میرے دوست نے میرے سوال کا کچھ جواب نہ دیا اور اپنی بات جاری رکھی:

چار مہینے بعد میں سوچنے لگا کہ ممکن ہے جیسا کوکب کہہ رہی ہے ویسے سپاہی کا وجود ہی نہ ہو۔ سو ایک دن میں اٹھا اور جیسے سپاہی ڈھالنے کے لکڑی تراش کر پتلے کا سانچا سا بنانے لگا۔ چاہتا تھا کہ ایک بڑے رعب دار آدمی کا پتلا بناؤں مگر جیسا چاہتا تھا ویسا بنا نہ پایا۔ اس کا چہرہ جیسا میرے تصور میں تھا ویسا نہیں بنا۔ میں اسے بہت رعب دار بنانا چاہتا تھا مگر وہ بے اختیار میرے باپ کی شکل کا بن گیا۔۔۔ میں نے اس پتلے کے سامنے میں کیسی دشواری اور مصیبت اٹھائی! مگر خیر، تمہیں تو آسان لگے گا؛ کوئی کہاں سمجھ سکتا ہے! اب تم پوچھتے ہو، مجھے اس سے محبت تھی یا نہیں۔ محبت یعنی کیا؟ میں تو اس سے بڑی مصیبت اٹھائے بیٹھا ہوں۔ جو لذت تمہیں فطری معلوم ہوتی ہے میرے لیے عذاب سے کم نہیں۔ میں محکوم تھا، کیوں کہ محبت میرے بس کی بات نہیں تھی۔ دنیا میں ہر طرح کی مصیبتیں اور دکھ ہیں۔ اس مصیبت کا کون تصور کر سکتا ہے کہ ایسے بھی لوگ ہیں جو محبت کر ہی نہیں سکتے۔ بلا؟ ہاں، بلا بھی ایک نام ہے میرے غم کا، گو میں روحانیت کا قائل نہیں ہوں۔ آہ! مجھ میں حوصلہ نہیں۔۔۔ یہ سپاہی آخر کار بن گیا، مگر میری زندگی کے دام ہوں۔ اب کہیں ایک سال بعد میری سمجھ میں آیا کہ کوکب سچ کہتی تھی، کہ ان گڈوں میں سے کوئی اس جیسا نہیں تھا۔ آخر کار میں اس جیسا ایک بنانے میں کامیاب ہو گیا، اور میں نے اس کو کوکب کی کٹھری میں ڈال دیا، اور کئی راتوں تک ایسا ہی کرتا رہا۔ پھر سب ختم ہو گیا، میری زندگی کا وہ دور ختم ہوا۔ ایک روز صبح اٹھا تو دیکھا کہ کوکب نہیں ہے۔

o o o

اس روز اس نے اپنی باقی کہانی مجھے نہیں سنائی کیوں کہ کھانسی کے دورے نے اسے خاموش ہو جانے پر مجبور کر دیا؛ مگر اصل وجہ یہ تھی کہ میرا آخری سوال اسے برا لگا تھا۔ اگلے روز جب میں اس کے پاس گیا تو وہ بات کرنے کی کیفیت میں نہیں تھا۔ اور بعد میں بھی، میرے اصرار کے باوجود، اس کی ہچکچاہٹ دور نہ ہوئی۔ لیکن اس کی اس ہچکچاہٹ نے میرا تجسس اور بڑھا دیا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ شاید اس سے کوئی جرم سرزد ہو گیا ہے اور وہ ایک مرتبہ اس کا اعتراف کر کے سکون

پانے کا خواہش مند ہے۔ اس خیال سے میں نے اس کے گھر زیادہ آنا جانا شروع کر دیا۔ ایک روز میں نے اس سے پوچھا: "کوکب کہاں ہے؟" تو جواب میں بولا: "معلوم نہیں۔"

"تمھارے خیال میں زندہ ہے؟"

"میرے لیے تو مر ہی چکی ہے۔"

"تم اسے ایک بار پھر دیکھنا نہیں چاہتے؟"

اس نے جواب نہ دیا۔ میں نے پھر پوچھا: "تم نے کب سے اسے نہیں دیکھا ہے؟"

"اگر تم چاہتے ہو کہ میں سکون سے رہوں تو آئندہ یہ باتیں مجھ سے مت پوچھنا۔ کوکب میرے لیے مر چکی ہے، جیسے میری ماں مر چکی ہے۔"

اس کے بعد اس نے کوئی بات نہ کی۔ اُس کا گھر خیابانِ اسمٰعیل بزاز میں تھا۔ میں نے اس کے محلے اور ہمسایوں سے آشنائی پیدا کی، لیکن ان سے بات چیت کر کے مجھے کچھ بھی معلوم نہ ہو سکا۔ گلی کے کونے پر واقع دکان کے مالک نے بتایا: "ہم لوگ اسے کبھی گھر کے باہر نہیں دیکھتے، اور اس کے گھر بھی کوئی شاذونادر ہی آتا ہے۔ کبھی کبھی ایک عورت آتی ہے، مگر فوراً ہی واپس چلی جاتی ہے۔ رات کو اس کے گھر پر کبھی کوئی نہیں رہا۔" برابر والے گھر کے ملازم نے بتایا کہ اس نے فقط ایک بار اُسے باغِ فردوس میں دیکھا ہے۔ آخرکار اس علاقے کے میرآب سے، جو رات کو وہاں سے گزر رہا تھا، مجھے معلوم ہوا کہ وہ راتوں کو اکثر قبرستان کا اور میدانِ پاقاپوق کے آس پاس کی گلیوں میں چکر لگایا کرتا ہے اور صبح سویرے گھر واپس پہنچتا ہے۔ مجھے خیال ہوا کہ اس کے گھر آنے والی عورت کوکب ہوگی، مگر بعد میں پتا چلا کہ وہ اس کی بہن مینا ہے۔ اور وہ خود راتوں کو کوکب کے پیچھے سرگرداں رہتا ہے۔ ایک روز اُس کے گھر کے صحن میں میرا مینا سے سامنا ہو گیا۔ اس نے شادی نہیں کی تھی، تیس برس کی عمر میں دنیا ترک کر کے کربلا کی زیارت کو چلی گئی تھی اور پھر ملانی بن گئی تھی۔ اب وہ ترقی کر کے لڑکیوں کے مدرسوں میں قرآن پڑھانے لگی تھی۔ خواہی نخواہی ہم دونوں اُس کے بارے میں بات کرنے لگے۔

مینا آغا کا چہرہ پتلا اور لاغر تھا اور رخسار پر جنبے کا داغ تھا جس سے وہ باقاعدہ بدصورت معلوم ہوتی تھی۔ شادی اس نے کی نہیں تھی اور ہر وقت تسبیح اور ذکر میں مشغول رہا کرتی تھی۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ آیا اسے اپنے بھائی کی بوشہر میں گزاری ہوئی زندگی کے بارے میں کچھ معلوم ہے یا نہیں۔ اس نے اپنی نقاب تھوڑی سی اٹھا رکھی تھی جس سے میں اس کی آنکھ کے نیچے کا داغ دیکھ سکتا تھا۔ کہنے لگی: "استغفراللہ، خدا بخشے اگر میرے بابا کو معلوم ہو جائے کہ میری زبان سے کیسے کفر کے کلمے نکلتے ہیں تو وہ اپنی گور میں لرزنے لگیں۔ خاص طور پر انھیں تو اس بچے سے ذرا بھی الفت نہیں تھی۔ مگر میری اماں اس کو بہت چاہتی تھیں۔ میں اپنے بچپن ہی سے دیکھتی تھی کہ حالاں کہ میں بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھی، مگر اماں ہم پانچوں کو قبر میں پھینکنے کو تیار ہو جاتیں، مگر

Scanned with CamScanner

اس کا باپ بیاہ ہوا انھیں منظور رہتا- اور یہ سب سے چھوٹا بھی نہیں تھا- اسے خدا، میری بہن بیگم آمنہ کی مغفرت کرے جس نے تجھ کو جان دی- چھوٹی تو وہ تھی- اس کی شادی ہو گئی تھی، مگر میاں، بیوی ایک دوسرے کو نہیں چاہتے تھے- بعد میں اسے دق ہو گئی اور وہ چل بسی- مگر ماں کی محبت اس بچے کے لیے ایسی تھی کہ بیان سے باہر- ایک دوسرے پر جان دیتے تھے، بالکل عاشق اور معشوق کی طرح تھے- ماں بار بار اس سے کہا کرتی تھی: تو میرا یوسف ہے- ایسا ہی تھا، بالکل یہی بات تھی- اصل بات جاننا چاہتے ہو؟ یہ بچہ ماں کے مرنے ہی کے غم سے اس حال کو پہنچا ہے- اس کے بعد سے یہ سنبھل نہیں سکا- مگر بوشہر جانے سے پہلے، جب اماں مری تھیں، اس وقت ایسی کوئی بات نہیں تھی- اس کے بوشہر جانے کی اصل وجہ یہ تھی کہ بابا نے دوسری عورت کر لی تھی اور یہ ماں کی جگہ اس دوسری عورت کو دیکھنا برداشت نہیں کر سکتا تھا- اور جانتے ہو؟ بابا بھی بیٹے کی شکل دیکھنے کے روادار نہیں تھے- ہم سب کرسی کے نیچے بیٹھے تھے اس بچے کا پیر بار بار کرسی سے ٹکرا رہا تھا اور چہرہ ڈھل رہا تھا- تمھیں پتا نہیں ہے کہ یہ کیسی کیسی حرکتیں کرتا تھا- مدرسے کی کتابوں اور قلم پر جھگڑا ہوتا تھا، دیر سے گھر لوٹنے پر ہنگامہ ہوتا تھا، رات کے کھانے پر تکرار ہوتی تھی، دن کے کھانے پر فضیحتا ہوتا تھا- ماں مر چکی تھیں، بے چاری نے ان دونوں کی وجہ سے کیسی مصیبت اٹھائی مسلمان کا دل سوچ کر ٹکڑے ٹکڑے ہونے لگتا ہے- آخر ایک دن باپ بیٹے میں بہت سخت تکرار ہو گئی، ایسی تکرار جس میں لوگ منھ پر آئی ہر بات کہہ بیٹھتے ہیں- اس نے کہہ دیا کہ بابا اگر مشہد زیارت کے لیے جانے کے بجائے ماں پر تھوڑا بہت خرچ کرتے تو ان کی جان بچ جاتی- اور معلوم ہے بابا نے کیا کہا؟ میری زبان بند ہو جائے، سات قرآن درمیان، میں نے کبھی کسی پر تہمت نہیں لگائی- کہنے لگے: تو نے میری عورت کے ساتھ دست درازی کی ہے- مگر یہ جھوٹ تھا- یہ جھوٹ اسی ترچھی آنکھوں والی نے گھڑا تھا، خدا کرے اس کے دل و جگر مردے نہلانے والے تختے پر خون بن کر بہیں- وہ مسلسل یہی کہتی رہی کہ بس اب میں اس گھر میں ایک پل بھی نہیں رہ سکتی-

تب میں نے پوچھا: "تم کو اس کے بوشہر کے شب و روز کی تو خبر نہیں ہو گی؟ اور اس کے بوشہر سے واپس آنے کے بعد کی؟"

"کیوں نہیں! اس نے تو شیراز کی بھی بہت سی باتیں مجھے خود بتائی تھیں- مگر میرے پلے کچھ نہ پڑا- ان عورتوں کو میں بھی خوب جانتی ہوں، خدا ان کی نسل کو غارت کرے- ہاں، جب بوشہر سے لوٹا تو یہ بیماری ساتھ لایا-"

"کیسی بیماری؟"

"تمھیں نہیں معلوم؟ یہی دیوانگی- بوشہر سے لوٹ کر میرے ہی گھر میں اترا تھا- ہر روز صبح اٹھتی تو دیکھتی کہ میرے تمام بچے کمرے بھر میں بکھرے پڑے ہیں- حتیٰ کہ میری جانماز

Scanned with CamScanner

بھی، جسے فلک بھی چھونے کی ہمت نہیں کرتا، کمرے میں اوندھی پڑی ہوتی تھی۔ پہلے دن تو مجھے خیال ہوا کہ کوئی چور آ گھسا ہوگا، مگر کوئی چیز غائب نہیں تھی۔ پھر تو روز یہی ہونے لگا۔ ایک رات میں نے پہرا دیا تو معلوم ہوا اس کا کام ہے۔ میرے سونے کے بعد وہ اٹھ کر میرے بچے ٹٹولنے لگتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا بھی کہ یہ کیا حرکت ہے، مگر اس نے سنی ان سنی کر دی۔ میں حیران تھی۔ صبح اٹھ کر اس سے پوچھتی تو اسے کچھ خبر نہ ہوتی۔ تب میں سمجھی کہ کوئی درد بے درماں سے کھائے جا رہا ہے، جیسے وہ کسی چیز کی تلاش میں بھٹک رہا ہو۔ اب بھی یہی حال ہے۔ ہر رات کو اٹھ بیٹھتا ہے، جو چیز کٹھری کی شکل کی دیکھتا ہے کھول ڈالتا ہے۔ مگر اس سے بدتر یہ جوئیں ہیں جن سے اس کا پورا بدن بھر گیا ہے۔ سارے سر اور منہ پر رینگتی رہتی ہیں۔ میں نے حاجی میرزا رضائی حکیم باشی سے پوچھا، کہتے ہیں آخر کار اندھا ہو جائے گا۔ خدا جانتا ہے، میرا دل کٹتا جاتا ہے، مگر میں بدبخت کیا کر سکتی ہوں؟"

o o o

کیا چاندنی خوب صورت نہیں ہوتی؟ بے شک ہوتی ہے، اس لیے کہ شاعروں اور ادیبوں کے بیان کیے ہوئے تمام عاشقانہ اور شاعرانہ مناظر مساوی ہوتے ہیں زلف پریشاں جمع کنار آبجو جمع چاندنی کے۔ وہ اس سے بے خبر ہیں کہ چاندنی بھی مختلف حالات میں اچھی یا بری ہو سکتی ہے۔ یعنی چاندنی جمع دس دس شاہی کی عورتیں جمع شہر میں آنے اور کشمکش کے ساتھ واپس جانے والے گھڑسوار مساوی ہیں محبت و بدبختی کے۔ جو چاندنی میں نے دیکھی ہے وہ تو گویا سفید گرد کی مانند ہے جو شہر کے جنوبی علاقے کی ٹوٹی پھوٹی سڑکوں پر بکھری ہوئی ہے؛ اور سیاہی کی یہ چادریں سی جو جاڑوں کی رات میں گلیوں کے کونوں پر دیواروں سے لگی کھڑی ہیں، زخم پر سوکھے ہوئے کھرنڈ کی طرح ہیں۔ میں ان ہیولوں میں سے ایک کے تعاقب میں چل رہا ہوں۔ عموماً جب میں ان کے پاس پہنچتا ہوں تو وہ کہتی ہیں: "گلی میں چلے آؤ۔" جب میں گلی میں داخل ہوتا ہوں تو کہتی ہیں: "پہلے دس شاہی دو۔"

میں کوکب کی تلاش میں ہوں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میرے دوست کی سرگزشت مجھ پر اثر انداز ہو گئی ہے۔ میل سے اٹی ہوئی اس کی پیشانی، اس کی دھندلی آنکھیں، قیوں کے ہاتھوں ختم ہوتا ہوا۔ صرف یہ عورت اسے نجات دلا سکتی ہے۔ میں خود سے سوال کرتا ہوں: فرض کرو اگر وہ مر جائے تو دنیا کے نظام پر کیا فرق پڑے گا؟ یہ خیال اپنی جگہ منطقی اور درست ہے۔ مگر--- شاید کوکب بھی اپنی جگہ معاشرے کی ایک مفید فرد ہے۔ ماں، کم سے کم آقائے چونچی سے تو زیادہ مفید ہے۔

کوکب رات کا وقت باغ فردوس کے اطراف کی گلیوں میں گھومتے ہوئے گزارتی ہے، تمدن سیسیا سے میدان شاہ اور بسوں کے اڈے تک، یہی اس کی متعینہ راہ اور اس کے اثر کا منطقہ

ہے۔ فرض کرو میری اس سے ملاقات ہو بھی جائے، تو وہ کیا کر سکتی ہے؟ شاید اسے مجبور کر سکے کہ دوبارہ آدمیت کے راستے پر آ جائے۔ ایسی غلیظ زندگی ہمیشہ نہیں گزاری جا سکتی۔ بہت دنوں سے اس کی زندگی کو میں اور میں آقا بسر کر رہے ہیں۔ خادمہ سنبل نے وعدہ کیا ہے کہ آج رات کوکب کو میرے سامنے پیش کرے گی۔

○ ○ ○

آپ چاہے مجھے کتنا ہی مجبور کریں، میں اس ذلیل ساقی کے پاس ہرگز نہیں جاؤں گی۔ اس کے ہاتھوں مجھے کس قدر تکلیف اور مصیبت اٹھانی پڑی ہے۔ آپ نہیں جانتے، میں نے اس پر جان نچھاور کر دی۔ خود کو ختم کر دیا اس کے لیے خدا اس کا خاتمہ کرے! آپ کہہ رہے ہوں گے کہ کیسی سنگ دل عورت ہے، مگر خدا کی قسم، ماں باپ کی روحوں کی قسم، ایسی بات نہیں ہے۔ میں آپ کو اس کا پورا قصہ سناتی ہوں۔ میں اس سے بوشہر میں ملی تھی۔ اس وقت وہ بہت اچھا لڑکا تھا۔ میں اس کی خادمہ تھی، اس کا سارا کام کرتی تھی۔ ایک رات مجھ سے کہنے لگا: کوکب، میں تمہیں بہت چاہتا ہوں، تم بالکل میری ماں جیسی ہو۔ تمہیں خبر نہیں، تمہاری آنکھیں میری ماں کی آنکھوں کی طرح ہیں، تمہارا منہ ایسا ہے، تمہاری ناک ویسی ہے۔ میں اس وقت پاک تھی، بالکل طیب و طاہر۔ میرے ناخن کا سرا بھی کسی نامحرم نے نہیں دیکھا تھا۔ حرام کاری سے ذرا بھی واقف نہیں تھی، کچھ جانتی ہی نہیں تھی کہ وہ مجھ سے کیا چاہتا ہے۔ ایک رات میں سادگی میں اس سے بولی: اگر چاہو تو تم سے متعہ کرنے کو حاضر ہوں۔ کل آقا کے سامنے چل کر ٹھیک کر لیتے ہیں۔ اگر تم مجھے اس قابل سمجھو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ یہ سننا تھا کہ بس دیوانوں کی طرح قہقہے مار مار کر ہنسنے لگا۔ میں نے جو یہ دیکھا تو چپ ہو رہی۔

کوکب میرے کمرے میں کرسی کے نیچے بیٹھی تھی، بے تحاشا عرق اور تمباکو پی رہی تھی اور مجھے اپنا قصہ سنا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر لکیریں پڑ گئی تھیں اور جلد سبزی مائل تھی، چیچک کے ہلکے ہلکے داغ بھی تھے۔ اس کے بال نرم جھاڑو کے ریشوں کی طرح اس کے چہرے کے گرد لٹک رہے تھے۔ اسے کسی طرح خوش شکل نہیں کہا جا سکتا تھا، اور اس میں ہر عیب بھی موجود تھا۔

اچانک مجھے سینے کا سپاہی یاد آیا اور میں نے پوچھا: وہ سینے کے سپاہی کا کیا قصہ تھا؟

لو، اس نے یہ بھی بتا دیا؟ یہ آدمی بالکل ہی دیوانہ ہے۔ باپ دادا کی روحوں کی قسم اگر جھوٹ کہوں۔ یہ ایک طرح کا تعویذ تھا جو میں نے اپنے لیے خریدا تھا۔ تعویذ تو خیر کیا، مگر بہرحال، آپ سچ سچ سننا چاہتے ہیں؟ ان دنوں میں اپنے سپاہی شوہر کو بہت چاہتی تھی، اسی کی یاد میں خریدا تھا۔ جب وہ گم ہوا تو مجھے بہت صدمہ ہوا۔ مگر ایسی کوئی بڑی بات بھی نہیں تھی۔ یہ سب اس کی گھڑی ہوئی ترکیب تھی تاکہ مجھے روک کر رکھ سکے۔ ایک رات میری آنکھ کھلی تو دیکھا کہ اس نے ویسا ہی ایک سپاہی بنا رکھا ہے جیسے ہم ان دنوں بنایا کرتے تھے۔ لیکن یہ والا تو عجیب و غریب تھا۔

بالکل بےڈول، کوئی کل سیدھی نہیں، بالکل غول بیابانی- اور میں آپ کو کیا بتاؤں -- اس نے یہ سپاہی اٹھا کر میری کوٹھری میں ٹھونس دیا- سچ سچ سننا چاہتے ہیں نا آپ؟ میں بہت ڈر گئی اور اگلی ہی صبح وہاں سے بھاگ کر شیراز چلی آئی- میرا شوہر وہاں نہیں ملا، سو میں اُس کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی۔ معلوم ہوا اُس نے دوسری شادی کر لی- اب یہ مصیبت آن پڑی! وہاں میں نے کیسی کیسی تکلیفیں اٹھائیں- مگر خیر! اب آپ خود دیکھیے، ایک تنہا عورت، بھرے شہر میں بے کس، کیا کرے؟ کوئی کام بھی نہیں جانتی تھی- جوان تھی، اس لیے کوئی عورت اپنے گھر میں ملازم رکھنے پر تیار نہیں ہوتی تھی- اگر بے عورت کا گھر ہوا تو آقا کے، تھول نہیں ہیں- آخر ایک ترک والے نے مجھے کچھ دن رکھا، پھر تہران لے آیا- پھر میں اس دھندے میں پڑ گئی- ایک دن باغ ملی میں گھوم رہی تھی کہ اس نے دیکھ لیا- اُس وقت اس نے اپنی حالت کچھ درست کر رکھی تھی- مجھے دیکھتے ہی میرے پیچھے لگ گیا اور اپنے گھر لے گیا- میں نے ہر کوشش کر دیکھی مگر یہ مجھے گھر سے جانے ہی نہ دیتا تھا- اب میں آپ کو کیا بتاؤں؟ مسلسل مجھ سے یہی کہے جاتا تھا کہ تم میری ماں کی طرح ہو اور میں تمھیں اُسی کی طرح چاہتا ہوں- میں نے اس سے کہا: اگر مجھے چاہتے ہو تو مجھے پناہ دو- یا تو مجھ سے شادی کرو یا متعہ- بھلا اس کے بغیر کام کیسے چلے گا؟ تو جواب میں کہنے لگا کہ نہیں، تم میری ماں ہو، ماں سے شادی کیسے ہو سکتی ہے۔۔۔

میں نے اس کی بات کاٹی: ”اگر یہ واقعی تمھیں چاہتا تھا تو تم سے شادی کیوں نہیں کی؟“

”میں کس طرح کہوں کہ آپ کی سمجھ میں آئے؟ یہ مرد نہیں ہے- دیوانوں کی طرح مجھ سے لپٹنے لگتا، میرے منھ اور ہونٹوں پر پل پڑتا، یہاں تک کہ میں اسے مار بیٹھتی۔ پھر مجھے مارتا، گالیاں دیتا اور میرے بال نوچنے لگتا- ایک دن مجھے لکڑی سے اتنی زور سے مارا کہ میں بے ہوش ہو گئی- آخر میں اس کے گھر سے بھاگ نکلی، مگر یہ ہر جگہ میرا پیچھا کرتا اور مجھے مارنے کو دوڑتا- بار بار مجھے کھینچ کر اپنے گھر لے آتا- میں پھر بھاگ جاتی- سال بھر مجھ بے چاری کے ساتھ یہی ہوتا رہا-“

یہاں تک آ کر گوگب پھر رونے لگی۔

”اس پورے عرصے میں میں کسی اور کے ساتھ نہیں گئی، آپ سے سچ کہتی ہوں- آپ جانتے ہیں، مجھے کسی کا خوف تو ہے نہیں، فلک تک کا نہیں- دیکھیے، ہوٹلوں میں میرا داخلہ بند ہو گیا، خیابانِ لالہ زار یا اسلامبول میں بھی گھومنا نہیں ہو سکتی- میری جگہ بس قبر آقا کے آس پاس کی گلیوں تک رہ گئی ہے- یوں میں اپنی مالک ہوں، میرے پاس کوئی چیز نہیں ہے جو کوئی چھین سکے- میری جان ہے، سو وہ میں ڈرائیوروں کے مددگاروں پر بھی فدا کرنے کو تیار ہوں، مگر مجھے کوئی کیوں خاطر میں لانے لگا- گھر، زندگی، شوہر، بچہ، باپ، پیسہ، کچھ بھی تو نہیں ہے میرے پاس- تو پھر میں فلک سے بھی نہیں ڈرتی- آپ مجھے چاہے جتنا مجبور کریں، اس کے پاس تو میں ہرگز نہیں جاؤں گی- لیکن اگر گئی بھی، اور اس نے مجھے چھونے کی کوشش کی، تو اس پدر سوختہ کو مزہ چکھا دوں

Scanned with CamScanner

گی۔ اس بار تو اسے مار ہی ڈالوں گی۔ سچ کہتی ہوں، مجھے کس کا ڈر ہے؟ گزری رات کی بات نہیں معلوم؟

پچھلے جاڑوں کی بات ہے۔ میں اپنے کمرے میں سونے کو گئی تو دیکھا کہ اس نے لحاف اور کمرے کے سب سامان کو آگ لگا دی اور پھر اس پر پانی ڈال دیا کہ آگ بجھ جائے۔ وہ میرے پچھلے کمرے میں آیا ہو گا، میری انگیٹھی کھلی پڑی تھی اور کرسی کے ٹکڑے ٹکڑے ہو چکے تھے۔ آگ جسم سے نکل کر لحاف میں پہنچی اور وہاں سے پورے کمرے میں بھڑک اٹھنے کو تھی۔ اسی لیے اس نے پانی ڈال کر اسے بجھانے کی کوشش کی۔ اب مجھ بدبخت کے پاس سونے کے لیے کوئی گدّا نہیں۔ بید کی طرح لرز رہی تھی۔ سب کچھ کر کے دیکھ لیا کہ مجھے اپنے کمرے میں داخل ہونے دے مگر اس کا سامنا کون کر سکتا ہے۔ آخرکار ایک آغا نے جو اسی احاطے میں رہتا تھا میرا ہاتھ تھاما اور مجھے اپنے کمرے میں پناہ دی۔ میری کیا خطا ہے؟ میرے پاس سر چھپانے کی جگہ ہی نہیں تھی۔ صبح جب وہ ہوش میں آیا تو اس بے چارے کو مارنے پر تل گیا۔ کہنے لگا تو نے میری ماں سے یہ تو خیانت کی ہے، تجھے مار ڈالوں گا۔ میں اس خیال سے بھاگ کھڑی ہوئی کہ کہیں معاملہ زیادہ خراب نہ ہو جائے۔ اس کے بعد سے وہاں کا رخ نہیں کیا، اور چاہے آپ میری بوٹی بوٹی کر دیں، نہیں جاؤں گی۔

میں نے کوکب کی بوٹی بوٹی نہیں کی، بلکہ اسے کچھ رقم دی۔ پھر عرق نے بھی اس پر اثر دکھایا تھا۔ اور بے چاری کے پاس جانے کو کوئی جگہ بھی نہیں تھی۔ سو میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے اپنے دوست کے گھر لے گیا۔ جب وہ اس کے کمرے میں چلی گئی تو میں کچھ دیر باہر راہداری میں کھڑا رہا۔ جب اندر سے کوئی آواز سنائی نہ دی تو واپس چلا آیا۔

۰ ۰ ۰

اگلے روز موسم بے اندازہ سرد تھا اور پورا شہر برف سے ڈھک گیا تھا۔ میں دفتر سے نکل کر اپنے دوست سے ملنے خیابان اسمٰعیل بزاز گیا۔ اس کے گھر کا دروازہ بند تھا اور باہر قفل پر لاکھ کی مہر لگی ہوئی تھی۔ میں کچھ دیر گلی میں ٹہلتا رہا، پھر میدان شاہ آ کر گھر جانے کے لیے بس میں سوار ہوا۔ بس میں تذکرہ ہو رہا تھا کہ گزشتہ رات کسی شخص نے کسی عورت کا گلا گھونٹ کر مار ڈالا۔ کوچہ دروازے کے پاس ایک آدمی سوٹ کیس تھامے کھڑا گردن کھجا رہا تھا۔ ڈرائیور کے شاگرد کی نظر چوکی تو ڈرائیور نے بس ٹھہرا لی اور اس سے کہنے لگا: چل، اس دس شاہی کو سڑک سے اٹھا! گردن کھجاتے ہوئے آدمی نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ٹٹولنے لگا جیسے پیسے ڈھونڈ رہا ہو۔ جب وہ بس میں سوار ہونے لگا تو اس کا سوٹ کیس بس کی سیڑھی سے ٹکرایا، سوٹ کیس کھل گیا اور اس میں سے سیسے سے بنے ہوئے بہت سے سپاہی نکل کر برف میں گر پڑے۔ ڈرائیور نے اور انتظار نہ کیا اور بس چلا دی۔ گردن کھجانے والے آدمی نے جلدی جلدی سارے سپاہی جمع کیے، سوٹ کیس سنبھالا اور چلا کر بولا: ٹھہرو! مگر ڈرائیور نے کوئی توجہ نہ دی۔ فقط اس کا شاگرد بولا: دفع ہو جائے! قرم ساق سمجھتا

بے لوگوں کو تنگ کرنا بھی کوئی مذاق ہے!"

○○

(فارسی عنوان: "سرباز سربی")

Scanned with CamScanner

بزرگ علوی

فارسی سے ترجمہ: اجمل کمال

میرزا

کوئی سال ایسا نہیں جاتا کہ میں ملک سے باہر کا سفر نہ کرتا ہوں۔ دنیا کا کون سا ایسا گوشہ ہے جہاں میں نے قدم نہ رکھا ہو۔ ایک قسم کا صحافی ہوں شہر ۔ یہ کارڈ آدمی کے واسطے دنیا کے سب دروازے کھول دیتا ہے۔ ہر بار جب یوروپ کا رخ کرتا ہوں، اپنے دوست سے ضرور ملتا ہوں۔ ہماری ملاقات میونخ سے برلن جانے والی ٹرین میں ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں لطائف الطوائف تھی۔ میں سمجھ گیا کہ ایرانی ہے۔ میں نے گفتگو کا سلسلہ چھیڑا۔ اب اس بات کو بیس برس بلکہ زیادہ گزر چکے ہیں۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ کون ہوں اور کیا کرتا ہوں اور میں نے بتا دیا۔ مجھے اس کا یہ طریقہ پسند آیا کہ کسی کے کام کاج کی تفصیل کی بلاوجہ کرید نہیں کرتا۔ لوگ پہلے تو آدمی کا نام پوچھتے ہیں، پھر یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ مثلاً اس نے اپنی دولت کس ذریعے سے حاصل کی۔ ایسے وقت سے خدا کی پناہ جب انہیں معلوم ہو جائے کہ میں نے سکول کا چھٹا درجہ بھی بمشکل پاس کیا تھا۔

جب میں نے برلن جانے کے لیے اسٹیشن پر اترنا چاہا تو اسے خدا حافظ کہا اور بولا: آپ سے مل کر میں بہت مسرور ہوا۔ اگر آپ کو یہاں میں کوئی کام ہو تو بہت خوشی سے کروں گا۔ فی الحال فلاں جگہ شہر میں ہوں۔ اس نے جواب میں کہا: اگر آپ کا فلاں شہر میں آنا ہو، تو پانسیون دوریان میں میرزا کو پوچھ لیجیے گا۔ مجھ سے ملاقات ہو جائے گی۔ میں اسے میرزا کے نام سے جانتا ہوں۔ بعد کا ارادہ یہ ہوا کہ ایک دو بعد میں اس شہر سے گزرا جہاں وہ رہتا تھا۔ میں نے اس کے پانسیون میں ٹیلی فون کیا۔ ہم مل بیٹھے اور یوں ہماری دوستی کی بنیاد ہوئی۔ جب بھی یوروپ جاتا

ہوں، دو ایک دن اس کے ساتھ گزارتا ہوں۔ شام میں ہماری ملاقات ہوتی ہے اور اندازہ ہو، کہ اسے اس سے خاصی راحت ملتی ہے۔ مگر مجھے ہرگز یقین نہیں آتا کہ ہماری زندگیوں کی سرنوشت اس طرح ایک دوسرے سے پیوست ہو چکی ہے۔

میں نے بتایا کہ وہ وسطی یوروپ کے ایک شہر میں زندگی بسر کرتا ہے۔ زندگی بسر کرنا' دراصل یک عام سا فقرہ ہے، اور جو کچھ سے پیش آیا ہے، آرہا ہے اور -- خدا معلوم -- آگے چل کر آنے والا ہے، سے دیکھتے ہوئے اس پر درست نہیں بیٹھتا۔ جب مجھے پہلی بار احساس ہو کہ وہ بے گھر اور مفرور سے نومیں وحشت میں پڑ گیا۔ وجہ یہ کہ سیاست اور اس کے پنہاں اور آشکار کھیلوں سے ہمیشہ میرا رہا ہوں، اور پچھلے کچھ برسوں سے تو مجھے ان سے باقاعدہ دہشت ہونے لگی ہے۔ خاص کر اُس وقت سے جب میں اس کے چنگل میں پھنسنے سے بال بال بچا تھا۔ جب میں نے اُس سے ملنا شروع کیا، تو چند ملاقاتوں کے بعد اپنی بیوی سے اس کا ذکر کیا -- کیوں کہ وہ مجھ سے بڑھ کر اس طرح کے معاملوں کی سمجھ رکھتی ہے اور گرفتاری، تفتیش اور مارشل لا کا مزہ چکھ چکی ہے۔ وہ بولی: 'اس میں کیا حرج ہے؟ تمہارے اس سے ملنے جلنے سے کوئی طلعات تو حاصل کرنے سے رہا۔ بلکہ ممکن ہے تم اس کی کچھ مدد کر سکو۔'

اُس وقت سے لے کر اب تک، جب بھی اس سے ملنے کا قصد کرتا ہوں بے انتہا اشتیاق مجھ پر حاوی ہو جاتا ہے۔ خود کو فریب دیتا ہوں کہ تیری اس آزاد اور بے پرواز زندگی کا، اس دولت کے ساتھ جو حالات کے زور سے اڑ کر تیرے ہاتھ آلگی ہے، کچھ مقصد اور کوئی ہدف تو ہونا ہی چاہیے۔ لیکن سچ پوچھیے تو یہ وہ خیالات ہیں جو میری بیوی نے میرے دماغ میں ٹھونس دیے ہیں۔ میں نے اسی لحاظ سے کہا کہ خود کو فریب دیتا ہوں۔ مگر اس بار میں بڑی وحشت میں ہوں، وحشت اس لیے کہ اس ملاقات میں مجھے اپنی سرنوشت کے راز اُسے بتانے ہیں۔ اب تک میں اس کی مدد کرتا رہا ہوں، مگر اس بار چاہتا ہوں کہ -- نہیں، اس طرح نہیں۔ مجھے تمہید کو مختصر کر کے مطلب کی طرف آنا چاہیے۔ بندے کو حیواں دیدہ کہتے ہیں۔ میرزا نے اپنی زندگی سیاسی جلاوطنوں کے لیے وقف کر رکھی ہے۔ وہ ان کنبوں کے بارے میں معلومات جمع کرتا ہے جن کے افراد جلاوطنی میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ وہ اپنا وقت، استعداد اور توانائی اس کی نذر کر دیتا ہے کہ نا میدوں کو امید دلائے، اور ان کی راہ کی مشکلوں کو آسان کرے۔

ہر ملاقات میں وہ ان لوگوں کا ذکر کرتا رہتا ہے جو قیدخانوں میں بوڑھے اور شکستہ ہو گئے ہیں یا قتل گاہوں میں جاں ہار بیٹھے ہیں۔ اپنے بارے میں یا اپنے خاندان کے بارے میں اشارہ تک نہیں دیتا۔ یہاں تک کہ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ اس کے ایران سے فرار ہونے کا کیا سبب تھا۔ یہ راز کھولنا میرے لیے آسان بات تھی، مگر یہ جوں مردی کے خلاف ہے۔ ٹرین میں ہی پہلی ملاقات میں ہمارے درمیان خاموش سمجھوتا ہو گیا تھا کہ ایک دوسرے کا احوال نہیں پوچھیں گے۔ میرا اس

میں کچھ فائدہ نہیں، اور اُسے اس سے نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ میں سیاسی معاملوں میں پڑنا نہیں چاہتا۔ بظاہر معمّد خیز بات لگتی ہے۔ آدمی صحافی ہو اور ہر مسئلے کے بارے میں تحقیق کا حق رکھتا ہو سوائے سیاست کے۔ آخرکار جلاوطن ہونے والے سب لوگ یا تو تودہ (کمیونسٹ) ہوتے ہیں یا مصدق کے پیرو۔ دونوں صورتوں میں یہ ان کی موجودہ حکومت کے مخالف ہوتے ہیں اور محض یہ جاننا ہی کہ ایسے لوگ موجود ہیں جنھیں یہ گمان ہے کہ وہ ایران کی حکام سے ٹکر لے سکتے ہیں، خطرناک بات ہے، اور آدمی کو آگ سے نہیں کھیلنا چاہیے۔ کیا پتا؟ شاید جن لوگوں نے انھیں فرار ہونے میں مدد دی ہو ان کی ابھی تک نگرانی کی جا رہی ہو۔ خوف موت کا بھائی ہے، وہ یوں بھی بندہ ہے ڈرپوک۔ البتہ اگر میرز مجھ سے کہتا ہوتا کہ اس کے خاندان کی خبر لاؤں تو میں دریا میں بھی کود پڑتا۔ مجھے کوئی خطرہ بھی درپیش نہ ہوتا۔ سر کوئی جانتا ہے کہ میں نہ تودہ ہوں اور نہ مصدقی، اور اس کا کہ میں آج تک کامیاب اور دولت مند ہوں اور دنیا کے تمام دروازے مجھ پر کھلے ہوئے ہیں، یہی راز ہے کہ میں ہمیشہ حکومت وقت کا طرف دار رہا ہوں۔ اگر وہ مجھ سے کہے تو میں جا کر اس کے خاندان کا پتا لگاؤں۔ اس کا مجھے فقط اپنا اصل نام بتانا بھی کافی ہے۔ میرز اس کا فرضی نام ہے۔ پہلی ہی ملاقات میں جب میری بیوی اور بچے کا ذکر آیا تو اس نے اشارہ کر دیا کہ اس کا دنیا میں کوئی نہیں ہے۔

قسمت عجب راستے اختیار کرتی ہے۔ اب مجھے جا کر اپنی لڑکی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دینا ہے کہ اس کے باپ کا پتا لگائے۔ ہاں، آپ ٹھیک سمجھے: میری ہی بیٹی ہے، اور اپنے باپ کا پتا لگانا چاہتی ہے۔

آج صبح میں نے مہری کو اس کے پاس بھیجا تھا۔ اس نے ملنے سے انکار کر دیا۔ یہ اس کی بداخلاقی ہے۔ اگر کسی کو بھی پتا نہ ہو تو اس کے لیے دروازہ نہیں کھولتا۔ آج شام مجھے خود کو آمادہ کر کے اسے سچ بات بتانی ہی ہوگی۔ میں نے اسے ٹیلی فون کیا اور کیفے لاندولت میں ملاقات طے کی۔

مہری ٹھیک نو بجے پانسیوں دوریاں کی تھی۔ میں نے خود سے بھیجا تھا۔ میں میرز کو دستی طور پر تیار کرنا چاہتا تھا تاکہ آج شام جب ہم نہر کے کنارے یا کیفے لاندولت میں یا کہیں اور ملیں تو وہ بالکل بے خبر نہ ہو۔ پانسیوں کی مالکہ نے، جو پینتالیس اور اڑتالیس سال کے درمیان، مگر پھر بھی جوان اور باوقار تھی، اس کے واسطے دروازہ کھولا۔ ہال کمرہ مہری کو تاریک معلوم ہوا۔ جب اس نے بتایا کہ میرز سے ملاقات کو آئی ہے، تو عورت کو بظاہر تعجب ہوا۔ لڑکی نے ٹوٹی پھوٹی فرانسیسی میں وضاحت کی کہ وہ پہلے کبھی میرز سے نہیں ملی ہے۔ مادام نے پوچھا: کیا پہلی بار اس شہر میں آئی ہو؟ عموماً میرز ان لوگوں سے نہیں ملتے جن کو پہلے سے جانتے نہ ہوں۔ کیا تم

سے ان سے وقت لیا ہے؟" مہری نے ان سب سوالوں کا جواب ایک ساتھ نفی میں دیا اور شرمندہ ہو کر اپنی نظریں دیوار پر لگے ہوئے نقاشی کے نمونے پر جما دیں۔ عورت نے اتنا بھی خلاق نہ دکھایا کہ اسے بیٹھنے کو کہتی۔ وہ کمرے سے چلی گئی اور مہری کو اس کے بولنے کی آواز آئی: "ایک ایرانی لڑکی آئی ہے اور آپ سے ملنا چاہتی ہے۔ کیا کہوں؟ جواب دے دوں یا آپ ملیں گے اس سے؟"

میرزا کا جواب مہری کو سنائی نہ دیا۔ لیکن مالکہ کی آواز، اگرچہ اب مدھم ہو گئی تھی، مہری کو اب بھی سنائی دے رہی تھی: "فرانسیسی تھوڑی بہت بول لیتی ہے۔ یہاں کی رہنے والی نہیں ہے۔ یقین سے نہیں کہہ سکتی، یا تو طالب ہے یا کسی شخص کی تلاش میں ہے جو آہنی پردے کے پیچھے کسی ملک میں رہ رہا ہے۔" پھر کچھ خاموشی چھا گئی۔ اس کے بعد: "سولہ سترہ سال سے زیادہ کی نہیں ہو گی۔"

مالکہ نے آ کر بتایا: "میرزا آج نہیں مل سکتے۔ دو تین دن بعد فون کر کے جواب لے لینا۔"

میرزا ہر جگہ اسی نام سے معروف تھا۔ اس نے پانسیون دوریاں میں ایک چھوٹا سا کمرہ لے رکھا تھا۔ گرمیوں میں وہ ایک دو منزلہ مکان کے باغیچے میں بیٹھتا تھا جسے استعمال کرنے کی مسافروں اور مہمانوں کو اجازت تھی۔ اس کا رخ یونیورسٹی کی طرف ہوتا تھا اور وہ جنوب مشرق کی سمت کیفے لاندولت کو -- جو کہا جاتا ہے جلاوطنی کے دنوں میں لینن کا ٹھکانا رہ چکا تھا -- دور سے دیکھ سکتا تھا۔ جاڑوں میں اس کی نشست کھانے کے کمرے میں ایک کھڑکی کے پاس ہوتی تھی اور وہ وہیں کام کرتا تھا۔ اس کا کام کتابیں پڑھنا، کاغذ کے ورقوں پر نوٹس لینا، مٹی کے برتنوں پر نقاشی کرنا اور منی ایچر اور کبھی کبھار پورٹریٹ بنانا تھا۔ دوپہر اور رات کا کھانا وہ وہیں کھاتا تھا، نہ کہ اپنے بدحال کمرے میں جہاں اس کی غیر موجودگی میں ملازموں کو لباس بدلنے، میک اپ کرنے اور چادروں اور میزپوشوں پر استری کرنے کی اجازت تھی۔ اس کا دوپہر کا کھانا سوپ، سیاہ روٹی اور ابلے ہوئے آلوؤں پر مشتمل ہوتا تھا۔ ہفتے میں ایک بار سے زیادہ گوشت نہیں کھاتا تھا۔ رات کو وہ سکے ہوئے انڈوں یا خاگینے، سلاد اور، اگر اس کے پاس پیسے ہوتے تو شراب کے ایک گلاس پر اکتفا کرتا تھا۔ اس پانسیون کے سب چھوٹے بڑے، مالکہ سے لے کر اطالوی ملازموں تک اس کا احترام کرتے تھے۔ وہ سب اس سے واقف تھے اور جانتے تھے کہ اس سے زیادہ بات چیت نہیں کرنی ہے۔ جب اس کے چہرے پر وہ مخصوص تاثر ہوتا تو وہ نہ کسی سے بات کرتا تھا نہ کسی کی بات کا جواب دیتا تھا۔ خاص بات یہ تھی کہ مادام برنابل، نو عمر ایرانیوں کے کہنے کے مطابق، میرزا پر عاشق تھی۔ کس کی مجال تھی کہ کسی بات پر میرزا کو ٹوک سکے۔ یعنی اگر اس پر دو تین مہینوں کا کرایہ چڑھ جاتا اور وہ شراب کے گلاس کے دام بھی ادا نہ کرتا، جو کمرے کے کرائے میں شامل نہیں تھے، تب بھی اطالوی خادموں کو اجازت نہیں تھی کہ اس سے سختی سے پیش آئیں۔ ہر کسی کو اس کی صداقت اور

Scanned with CamScanner

ہاتھ وردوں کی کشادگی پر اعتماد تھا، اور تجربے نے انہیں بتا دیا تھا کہ جب بھی وہ کوئی چیز بیچ کر کچھ رقم پیدا کرلیتا ہے، اپنے اندازے سے زیادہ دینگی کر دیتا ہے۔

پاسیوں داریاں ایرانی مسافروں اور طالب علموں کا مرکز تھا۔ وہ سب میرزا سے واقف تھے۔ اگر وہ بات کرنے کی کیفیت میں ہوتے تو وہ ان سے اپنے کاموں کے بارے میں بات چیت کیا کرتے تھے۔ سب ان سے مشورہ لیتے اور وہ بھی، جہاں تک اس کی عقل ساتھ دیتی، ان کی مدد کیا کرتا تھا۔ کسی کسی کے پیسے کی تنگی اور بدحالی کرتے ہیں، اور سال میں ایک دفعہ (اور اس کی خاص ضرورت ہے) پاسیوں سنگ مل میں، وہ ایرانی تصویروں، چھپے رنگدار سفالی برتنوں، قالینوں کی نقاشی کے نمونوں اور قلمدانوں وغیرہ کی نمائش کیا کرتا تھا، اور طالب علم ایرانی لڑکے لڑکیاں اپنے دوستوں یا استادوں کو تحفے دینے کے لیے ایرانی رنگ روپ کی کوئی چیز دینے کی غرض سے ایک آدھ مینی ایچر یا اسکیچ خرید لیتے تھے۔۔ کبھی کبھی تو اس پر بھی اور ہمیشہ ایرانی دعوتوں پر اس طرح ان کی روزی چلتی تھی۔

کبھی کبھی وہ پیرس میں سمٹ جاتا اور خود کو اپنے کمرے کی چار دیواری میں بند کر لیتا۔ تب دوستوں اور طالب علموں کو بھی اندر آنے کی اجازت مشکل سے ملتی تھی۔ صرف مادام اس سے مستثنیٰ تھی۔ اس کو دیکھتے ہوئے لوگ ایرانیوں کا کہنا تھا کہ عورت اس پر عاشق ہے۔ مادام واقعی اس درد مند ایرانی کی مدد کرنے کی خواہاں تھی۔ جب وہ ہال یا کھانے کے کمرے یا باغیچے میں بیٹھ کر لیس لے رہی ہوتی تو دیکھنے والے ... جیسے اس کی چمکتی آنکھ اور کھچڑی بالوں کو دیکھ کر تجسس ہوتا تھا۔ اس سے بات کرنے کی کوشش کرتے تو وہ ان کے راستے میں کھڑی ہو جاتی اور ان سے اس کا پیچھا چھڑاتی۔

اس طرح میرزا ان پاسیوں میں تیس سال سے مقیم تھا۔ کبھی کبھی وہ غائب ہو جاتا۔ چھ سات مہینوں تک کسی کو اس کی خبر نہ ملتی لیکن آخر اس کا گھر یا آشیانہ جو کچھ بھی تھا یہی تھا اور سب لوگ، خاص طور پر مادام ژوزفین، اچھی طرح جانتے تھے کہ آخرکار وہ اپنے گھر لوٹ آئے گا۔

"میرزا کہیں لوٹ گیا ہے تو صبر، وہ یہیں آ جائے گا"، یہ اس کا تکیہ کلام ہوتا۔ اس کا کمرہ جس کے در و دیوار سے رنگوں اور پینٹ کی بو آتی تھی، کرائے پر نہیں چڑھایا جاتا تھا، زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا تھا کہ اسے چادروں، میز پوشوں اور قسم قسم کی دوسری چیزوں کا سٹور بنا دیا جاتا۔

مادام ہر ایک کے سامنے -- خواہ ایرانی ہوں یا مسافر، پولیس والے ہوں یا ان کے ہم وطن طالب علم یا کوئی اور -- شدومد سے اس کی حمایت کرتی تھی۔ جب سفارت خانے سے کوئی شخص آتا تو وہ اس کو وہاں سے اس کی تواضع کرتی۔ ایران کے بارے میں جو معلومات اس نے ادھر ادھر سے جمع کی تھیں، اس کے سامنے پیش کرتی۔ ایرانی قالینوں، ملبوں، تیل کی دولت کے افسانوں، اور ... بادشاہوں کی باتیں کرتی۔ جب وہ میرزا کی بات کچھ پوچھنے کی کوشش کرتے تو وہ ایسی

رکھائی سے جواب دیتی کہ ان کا سر گھوم جاتا۔ سرکاری ملازم اس رویے کو در گزر کر جاتے اور، تھے پر شکن نہ لاتے۔ جب مادام ایزبل دیکھتی کہ میرزا نے کئی راتوں سے شراب طلب نہیں کی، اور صرف سُوپ ور روٹی پر گزارا کر رہا ہے، تو سمجھ جاتی کہ وہ قلاش ہو گیا ہے۔ ایسے دنوں میں اس کے ناشتے اور کھانے کا خرچ کم ہو کر پانچ چھ فرانک یومیہ تک رہ جاتا تھا۔ اس وقت مادام جان جاتی کہ اس کی چیزیں نہیں بک رہی ہیں۔ وہ تلاش کر کے بڑی چابک دستی سے اپنے مہمانوں میں سے کسی کو جھوٹی سچی باتیں بتا کر میرزا کا نقش کیا ہوا شمع دان یا پارچہ بے حد مہنگے داموں خریدنے پر آمادہ کر لیتی۔ اس طرح وہ اسے اس کی مشکل سے نکال لاتی۔ شہر میں رہنے کا پرمٹ اسے مادام ہی نے دلایا تھا۔ اس نے میرزا کو غیر ملکی مسافروں کے واسطے مشرقی کھانے تیار کرنے کا ماہر ظاہر کر رکھا تھا، اور اس طرح وہ ہر بار پولیس سے اس کے لیے قیام اور کام کا اجازت نامہ حاصل کر لیتی تھی۔ برسوں سے اس دیار اور اس پانسیون میں مقیم ہونے کے نتیجے میں وہ خود اس شہر کی ایک قابل دید چیز بن گیا تھا۔ کم سے کم ایرانیوں کے لیے۔ اس میں شک نہیں کہ ان میں سے بہت سے صرف اس کی خاطر اس پانسیون میں آیا کرتے تھے۔ وہ اس پُراسرار شخص کو دیکھنا چاہتے تھے۔ تجسس رکھنے والے لوگ سمجھنا چاہتے تھے کہ اس پُراسراریت کی تہ میں آخر ہے کیا۔

اسی لیے آج جب مہری نے آتے ہی پہلی بات یہ کہی کہ وہ میرزا سے ملنا چاہتی ہے تو پانسیون کی مالکہ حیران رہ گئی۔ دوسرے لوگ آتے تھے، چند روز پانسیون میں ٹھہرتے تھے، کھانے پر میرزا کی طرف دیکھتے رہتے تھے، اور اگر وہ خوشگوار کیفیت میں ہوتا تب وہ اس کے پاس بیٹھتے یا اس سے ایک آدھ بات کرنے کی ہمت کر پاتے تھے۔ مشہور تھا کہ اس کی بنائی ہوئی نقش چیزیں دنیا بھر کے عجائب خانوں کی زینت ہیں۔ اس باب میں وہ خود صرف اتنا کہتا: 'لوگوں نے شاعری اور حقیقت کو گڈمڈ کر دیا ہے۔'

ان میں سب سے احمق لوگ خود پر وطن پرستانہ تاثر طاری کر لیتے اور اس بات پر افسوس کرتے کہ ایسا بیش بہا شخص ایران میں کیوں نہیں رہتا۔

پھر 'شہزادی خانم' سے اس کی ملاقات مہری کی آج صبح کی سرگزشت سے مختلف تھی۔ اس روز میرزا ہال میں بیٹھا تھا۔ ایک ایرانی عورت کسی مسافر کے ساتھ کھانا کھا کر ہال میں آئی اور مادام سے میرزا کا پتا پوچھا۔ وہ کھڑکی کے پاس بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا۔ ذرا بھی متوجہ نہ ہوا۔ مادام کی نظر بے اختیار میرزا کی طرف اٹھی اور وہ عورت بلا اجازت کتاب پڑھنے میں مشغول شخص کے پاس جا پہنچی اور بولی: 'میں آپ کی تلاش میں تھی۔ کیا آپ آقای۔۔۔ نہیں ہیں؟ میرا نام مینا ہے۔' یہ پہلی بار تھی کہ اس پانسیون میں کسی نے علی الاعلان اور اونچی آواز میں اسے اس کے اصل نام سے پکارا تھا۔ مادام ہکابکا رہ گئی۔ یہ بات ہر کسی کے لیے غیر متوقع تھی۔ جب میرزا نے مجھے یہ واقعہ سنایا تو اس سے ایسا نتیجہ نکالا جو میں ہرگز کبھی نہیں بھول سکتا۔

Scanned with CamScanner

بولا: میں نے بھی خود کو کن جھمیلوں میں پھنسا لیا ہے۔ کہاں جاؤں کہ موت کے اس سامنے سے بچ سکے؟ اس روز یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ بعد میں جب اس نے مجھے دنیا یہ شہزادی خانم کا قصہ سنایا تو میں کچھ کچھ سمجھا۔

بہرحال، میرزا کا مستقل مادام ایزابل کے پانسیوں میں رہنا بے فائدہ تھا ورنہ تھے۔ اس لیے سپید مدن، غمگین آنکھوں اور پیشانی پر جھکے ہوئے کچھڑی بالوں والے اس شخص سے اس کا تعلق محض رسماً دوستی پر بھی نہیں تھا۔ میرزا مالک کے لیے بہت سی پریشانیاں پیدا کرنے کے باوجود اس کے لیے بالکل بے منفعت نہیں تھا۔

تودہ والے میرزا کو مشکوک سمجھتے تھے، مصدقی اسے تودہ گردانتے تھے، سوشلسٹوں کی نظر میں وہ انحطاط پسند بورژوا تھا، طالب علم اسے ایک سیدھا سادہ ایمان دار شخص سمجھتے تھے جو اب انقلابی نہیں رہا تھا، اور سکیورٹی والوں کی نگاہ میں وہ ایک منحرف تھا۔ شہر کے پولیس والے غیر جانبدار رہنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان لوگوں نے پچھلے دس پندرہ برسوں میں کیوبا اور افریقی ملکوں میں آنے والے انقلابوں سے عبرت پکڑی تھی۔ یہیں ممکن تھا کہ وہ کسی مشکوک یا مجرم ٹھہرائے جانے والے شخص کا پیچھا کریں اور اسے ملک بدر کرنے پر اصرار کریں، اور کچھ عرصے بعد وہی شخص اپنے ملک کے سامنے سے یا خصوصی ایلچی کے طور پر اسی ملک اور اسی شہر میں آ پہنچے۔ اس لیے، اگرچہ میرزا نے برسوں سے اپنے پاسپورٹ کی تجدید نہیں کرائی تھی، وہ ہر بار اسے پرمٹ جاری کر دیتے تھے۔ پولیس کے لیے اہم بات یہ تھی کہ وہ ٹیکس باقاعدگی سے ادا کر رہا ہے یا نہیں۔ بعض دفعہ یہ بھی ہوا ہے کہ پولیس کا واسطہ کسی ایرانی، ترک یا عرب مجرم سے پڑا اور اس کی بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی تو انھوں نے میرزا کو ترجمان کے طور پر بلا بھیجا اور اسے اس کا معاوضہ ادا کیا۔ سرکاری کارندے مہینے میں ایک آدھ بار مادام کے پاس آتے ہیں اور اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کی گزر بسر کیسے ہوتی ہے؟ کس سے میل ملاقات رکھتا ہے؟ کہاں جاتا ہے؟ جب یہاں نہیں ہوتا تو کہاں کے سفر پر ہوتا ہے؟ کون لوگ اس سے ملنے آتے ہیں اور کس کام سے آتے ہیں؟ مگر مادام کو ایسی باتوں کا بہت تجربہ ہے۔ وہ انھیں چکر دینا بھی خوب جانتی ہے۔ آخر وہی تو تھی جو سولہ سترہ سال کی عمر میں پہاڑوں کے راستے ہٹلر کے جرمنی سے فرار ہوئی تھی۔ اس کا ایک بھائی جنگ میں کام آ گیا تھا اور اس کی ایک بہن نے، جو ایک جرمن یہودی کی بیوی تھی، اسے ہٹلر اور اس کے گروہ کی کہانیاں سنائی تھیں۔ وہ اس کاروبار کے سب گر جانتی تھی۔ سیاست ویاست کا اسے کوئی تجربہ نہیں تھا، لیکن اتنا سمجھتی تھی کہ سوشلسٹ ملکوں سے میرزا کے نام مستقل خط آیا کرتے تھے اور اس کے وقت کا خاصا حصہ اسی کام میں صرف ہوتا تھا۔

کوئی ہفتہ ایسا نہیں جاتا تھا کہ ایران سے مسافر نہ آتے ہوں اور میرزا کسی نہ کسی طریقے سے انھیں ان کے جلاوطن عزیزوں سے ملانے کا بندوبست نہ کرتا ہو۔ اس لیے آپ کو تعجب نہیں ہوگا

Scanned with CamScanner

کہ آج میں نے مہری کو اس سے ملنے کے لیے کیوں بھیجا تھا۔ البتہ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ آج شام کی ملاقات میں اپنی بات چھیڑنے کا کوئی بہانہ ملے۔ ہم عموماً شام ہی کو ملتے تھے۔ کبھی کبھی وہ مذاقاً مجھے "جبارعالم" کا معززمدیر کہہ کر پکارتا تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ میرا اوپر سے نیچے تک ہر طبقے کے لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا ہے۔ کس سے کس کی بات چھپی ہوئی ہے؟ جسے ہاتھ لگاؤ اس میں سے کیڑے ہی کیڑے نکلتے ہیں۔ سب کی ایک دوسرے سے سازباز ہے، اور میں ان حضرات کے چھوٹے چھوٹے دھندوں کی باتیں کبھی کبھار اسے بتا سکتا تھا۔

وہ ان معمولی باتوں کو بھی درج کر لیا کرتا تھا۔ کہتا تھا کہ شاید کبھی کسی بے چارے کے کام آ جائیں۔ میں اسے نہ تو دو دھ کا دھلا سمجھتا تھا نہ صدیق، نہ انقلابی اور نہ منحرف۔ صرف اتنا سمجھتا تھا کہ اس کی گردن میں کسی شیطان یا کسی فرشتے نے رسی ڈال رکھی ہے اور اسے جان بوجھ کر کہیں کھینچے لیے جا رہا ہے۔ جو کچھ بھی وہ کرتا ہے، خواہ دانستہ یا نادانستہ، اس کا کوئی مقصد یا سبب ہوتا ہے۔ میری بیوی کے تجسس نے کہ وہ کیا چیز یا کون قوت ہے جس نے اسے اس راستے پر ڈالا، مجھے اس سے ربط ضبط بڑھانے اور اس کی مدد کرنے پر اکسایا۔ ہم ایک دوسرے کے عقائد سے سروکار نہیں رکھتے تھے۔ شہزادی خانم کے قصے نے ہمارے درمیان اعتماد پیدا کر دیا تھا۔

اتفاق سے میری بیوی شہزادی خانم کو جانتی تھی اور اس نے مجھ سے اصرار کیا کہ پتا لگاؤں وہ کہاں ہے، کیا کرتی ہے اور کس حال میں ہے۔ ٹھیک وہی بات جو میرزا نے مجھ سے پوچھی تھی، میری بیوی بھی دریافت کر رہی تھی۔ جس زمانے میں وہ اسپتال میں نرس تھی، اس کی شہزادی خانم سے ملاقات ہوئی تھی اور اپنڈکس کے آپریشن کے سلسلے میں اس کی دیکھ بھال پر متعین تھی۔ بہرحال، اس کی کہانی طویل ہے اور میں اس وقت اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ اپنے شوہر سے جدا ہونے اور ایران لوٹ جانے کے بعد اس عورت پر کیا بیتی۔ اس سلسلے میں مجھے ادھر ادھر سے جو کچھ معلوم ہو سکا، بعد کے سفر میں، اس کے شہر میں اس سے ملنے پر میں نے اسے کہہ سنایا۔ میرا خیال ہے، وہ مطمئن ہو گیا۔

میں نے بتایا کہ ہم عموماً شام کے وقت ملتے تھے۔ کچھ دیر نہر کے کنارے ٹہلتے، پھر فورسے کے نزدیک، ہوٹل میٹروپول کے سامنے والے کیفے میں جا بیٹھتے، اور رات ہونے پر کیفے لادولت میں کھانا کھاتا اور وہ شراب کا ایک جام پیتا۔ میں اس کے پاسیوں میں ہرگز نہیں جاتا تھا۔ اس لیے نہیں کہ مجھے میرزا کے ساتھ دیکھے جانے سے عار آتی تھی۔ وہاں سب لوگ مجھے جانتے تھے اور میری عزت کرنے لگے تھے۔ یوں بھی اب میرے وہ دن گزر چکے ہیں کہ مجھے چھان پھٹک کر دیکھا جائے۔ نہیں، مجھے حکومت کے کارندوں کا ڈر خوف نہیں تھا۔ میں صرف ایک ایسے شخص کے ساتھ سکون سے باتیں کرنے میں دو تین گھنٹے گزارنا چاہتا تھا جو میرے لیے محترم اور دلچسپ تھا۔ میرزا بھی شام کی ان ملاقاتوں کا بہت مشتاق رہتا تھا۔ آخر میں اس کے اطمینان کا باعث تھا اور وہ

Scanned with CamScanner

مجھ سے جلاوطن ایرانیوں کے خاندانوں کے بارے میں معلومات حاصل کر سکتا تھا۔ ایک بار تو وہ جوش میں مجھ سے مخاطب ہو کر بولا: "کوئی چھوٹی سی خبر، کسی ایک شخص کا رشتہ ہو جانا، کسی آدمی کو موت سے نجات دلا دیتا ہے۔"

بہرحال، اسے مجھ پر بھروسا تھا اور معلوم تھا کہ ہماری گفتگو کسی اور تک نہیں پہنچے گی۔ اس کے برعکس میں نے اس سے کوئی معلومات حاصل کرنے یا سوال جواب کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ اس کے باوجود کہ میری بیوی مجھے ایسا کرنے پر اکساتی رہتی تھی۔ اگر وہ خود سے کوئی بات مجھے بتا دیتا تو اس سے بہتر کیا ہوتا۔ میں اس کی بدگمانی کو بیدار کرنا نہیں چاہتا تھا۔ جیسا آپ جانتے ہیں کہ یہ سیاسی مہاجرین ہر چیز سے بدگمان ہوتے ہیں؛ ان کا معاملہ اس قدر بگڑ چکا ہے کہ وہ اپنے دوستوں تک سے محتاط رہتے ہیں۔

میری آج کی الجھن کا یہی سبب ہے۔ آج شام میں اس سے کچھ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ میری بیٹی مہری کا باپ کون ہے۔ اگر آج مجھے اس سے ملنے میں ہچکچاہٹ ہو رہی ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ آج میں وہ کردار ادا کرنا چاہتا ہوں جو اب تک وہ ادا کرتا رہا ہے۔ میں نے آج تک اس سے نہیں پوچھا کہ وہ ایران میں کیا کرتا تھا اور وہاں سے کیوں فرار ہوا اور واپس کیوں نہیں جا سکتا۔ یہ سب اس کے راز ہیں، اور مجھے کیا پڑی ہے کہ ایسی بات میں دخل دوں جس میں میرے لیے دردِ سر کے سوا کچھ نہیں رکھا ہے۔ اس کے برعکس میری بیوی ہمیشہ متجسس رہتی تھی اور مجھ سے اس آدمی کے احوال کا پتا لگانے کو کہتی رہتی تھی۔

طے ہوا کہ ہم شام ساڑھے سات بجے ہوٹل میٹروپول کے سامنے ملیں گے۔ فوارے سے کچھ دور شہر کے پارک میں محراب کے نیچے شہر کا آرکسٹرا لوگوں کے واسطے کنسرٹ کر رہا تھا۔ یوہان سٹراوس کی دھن دی پروشین مارچ نے میری توجہ اپنی طرف جذب کی۔ مقرر کیے ہوئے وقت میں ابھی کچھ منٹ باقی تھے، میں اس مقام کی طرف چل پڑا جہاں سے موسیقی کی آواز آ رہی تھی۔ دیکھا کہ میرا دوست بھی وہاں کھڑا ہے۔ کوئی بیس منٹ تک ہم موسیقی سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ جون کے آخری دن تھے اور موسم گرم تھا۔ ہوا کے رکے ہوئے ہونے کی وجہ سے درختوں کے پتے تک ساکت تھے۔ ایک شاخوں والا فوارہ چھڑکاؤ کر رہا تھا۔ ہم معمول کے مطابق نہر کے کنارے بنے ہوئے کیاریوں کے بیچ لگی ہوئی کسی بنچ کے خالی ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ پھر اس پر آ بیٹھے اور کچھ دیر تک دور سے آتی ہوئی وائلن کی آواز سنتے رہے۔

مجھے احساس ہوا کہ ہمیشہ کے برخلاف آج ہماری گفتگو میں اتنی روانی نہیں ہے۔ عموماً بات وہی شروع کرتا تھا۔ مگر آج ہمارے درمیان کھنچاؤ سا تھا۔

Scanned with CamScanner

اس نے پوچھا: "کچھ دن ٹھہریں گے اس شہر میں؟"

میں نے کہا: "نہیں صرف آپ سے ملنے یہاں آیا ہوں۔ سوچا شاید آپ کو مجھ سے کچھ کام ہو۔ میرا طیارہ کل سہ پہر کے وقت روانہ ہوگا۔"

"ایران سے آئے ہیں یا ایران جا رہے ہیں؟"

"پرسوں ایران سے چلا تھا۔ ایک رات روم ٹھہرا اور اب لندن جا رہا ہوں۔"

"واپسی میں بھی یہاں سے گزریں گے؟"

"خیال تو نہیں ہے۔ جیسا کہ آپ کو بتایا، مجھے یہاں کام تو کچھ ہے نہیں۔ یہاں صرف ایک رات کے لیے رکا ہوں کہ آپ سے ملاقات ہو جائے۔"

اس کے بعد پھر خاموشی۔ فوارے کی سرسراہٹ آدمی کی توجہ کو اپنی طرف کھینچے لیتی تھی۔ میں نے چاہا کہ خود اسی کے بارے میں بات چھیڑوں۔

"دوبارہ پیرس جانا نہیں ہوا؟"

"آپ کو کہاں سے پتا چلا کہ میں پیرس گیا تھا؟"

"آپ نے خود بتایا تھا کہ آپ کچھ مدت پیرس میں رہے تھے اور سیاحوں کے ہاتھ پرانی منی ایچر بیچ کر آپ نے خوب پیسہ کمایا تھا۔"

اس کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ جھلکی۔

میں نے پوچھا: "ہنس کیوں رہے ہیں؟"

بولا: "جو کچھ آپ نے کہا اس میں فقط پیرس اور منی ایچر کی بات درست ہے، باقی---"

میں نے تیزی سے اس کی بات کاٹی: "جھوٹ ہے۔ مجھ سے جھوٹ کیوں بولتے ہیں؟"

"بدقسمتی سے ہماری زیادہ تر عمر جھوٹ پر بسر ہوتی ہے۔ سچ بہت بدصورت ہوتا ہے اور اسے جھوٹ سے خوب صورت بنانا پڑتا ہے۔"

میں نے جرأت کر کے اسے اشتعال دلانے کی غرض سے کہا: "تو پھر بتائیے کہ سچ کیا تھا۔ میں آپ کو شرمندہ نہیں کرنا چاہتا۔ مگر مجھے کسی نے بتایا کہ آپ دریائے سین کے کنارے منی ایچر بنایا کرتے تھے اور ہیٹ اتار کر زمین پر رکھ دیتے تھے تاکہ راہ گیر اس میں چند سکے ڈال دیں۔"

"اتنی آسانی سے بھی نہیں جیسا آپ سمجھ بیٹھے ہیں۔ درست ہے۔ ایک طالب علم نے مجھے وہاں دیکھ لیا تھا۔ اسی نے یہ بات پھیلائی ہے۔ مگر حقیقت اس سے بھی زیادہ تلخ ہے۔ اسے پورے قصے کا پتا نہیں ہے۔ وہ زمانہ مجھ پر بہت سخت تھا۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا، بیچنے یا گروی رکھنے تک کے لیے کوئی چیز نہیں بچی تھی۔ بہت راتوں میں ریلوے سٹیشن پر سویا۔ بھوکا بھی تھا۔ روز دریائے سین کے کنارے جا بیٹھتا اور منی ایچر بنایا کرتا۔ بعض بوڑھی عورتیں جو وہاں سے گزرتیں چند سکے مجھے دے جاتیں۔ تیسرے دن ایک لڑکی اور لڑکا میرے پاس سے گزرے۔ وہ

مجھے عوامی مسافر خانے میں دیکھ چکے تھے۔ لڑکی کیوبائی تھی اور لڑکا الجزائر کا۔ چند قدم آگے چلنے کے بعد وہ لوٹ کر آئے اور میرے بنائے ہوئے نقش و نگار پر نظر ڈالی۔ لگتا تھا لڑکی کو میری حالت پر افسوس ہو رہا ہے۔ وہ جا کر ایک کیلا خرید لائی اور مجھے دیا۔ میں نے اسے ایسے مزے سے چل کے کھانے لگا کہ الجزائری لڑکے نے پاس کی ایک دکان سے سینڈوچ خرید کر مجھے لا دیا۔ رات کو وہ دونوں مجھے چائے خانے پر لے گئے اور وہاں ہم نے ایک طرح کی شراکت قائم کر لی۔ ہاں، تینوں آوارہ گردوں کی شراکت۔ میں نقاشی کرتا، لڑکی بن سنور کر میرے پاس آ بیٹھتی اور اپنی حسین رسیلی آنکھوں کی نمائش کیا کرتی۔ بےچارہ الجزائری، جو ہمیشہ بیمار رہتا تھا، ہمارے لیے چیزیں خرید کر لاتا اور کھانا پکاتا۔ لوگ آنے لگے اور اس بار نوجوان مردوں نے میرے ہیٹ میں سکے ڈالنے شروع کر دیے۔ یہاں تک کہ میرے کچھ مستقل گاہک بھی بن گئے۔ کیوبن لڑکی نے سب کو لبھا لیا۔ ہم ہر روز دس سے پندرہ ڈالر تک پیدا کر لیتے تھے اور تینوں کو اسی رقم میں گزارا کرنا ہوتا تھا۔ وہ دونوں کس حد تک مخلص تھے۔ بہرحال اس سے مجھے مطلب نہیں۔ حمید کو پیٹ کے درد کی پرانی بیماری تھی اور وہ اب ہمارے ساتھ کام نہیں کر سکتا تھا۔ کچھ دن بعد ہم نے ایک مذہبی جشن میں اس کے لیے دو [illegible] حاصل کر لی۔ مگر اس کے باوجود اس کی حالت روز بروز خراب ہوتی گئی۔ ایک روز ایک عاشق پیشہ یا شاعر پیشہ آدمی ۔۔ مجھے کیا معلوم؟ بہرحال کسی قسم کا فنکار ۔۔ لڑکی کے آس پاس چکر کاٹنے لگا۔ لڑکی کا نام میں نہیں بتا سکتا کیوں کہ وہ آج دنیا بھر میں مشہور ہے اور آپ نے بھی اس کا نام سن رکھا ہوگا۔ وہ آدمی ہر روز ہماری بساط پر آتا اور خوشامدیں کرتا اور ہمدردی کرتا تھا۔ ایک رات کیوبن لڑکی نے، جو عوامی مسافر خانے میں مجھ سے اوپر والی برتھ پر سویا کرتی تھی، مجھ سے کہا: حمید کی حالت بہت خراب ہے۔ اگر اسے فوراً اسپتال نہ پہنچایا تو وہ مر جائے گا۔ کیا کروں؟ میں چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔ کاش وہ کچا آدمی ڈاکٹر ہوتا--- کیوبن لڑکی نے غور سے میری طرف دیکھا اور بولی: وہ آدمی جو ہر روز ہمارے پاس آتا ہے، کہہ رہا تھا میرے ساتھ چلو اور میری ماڈل بن جاؤ۔ ایک ہفتہ کا ایک سو ڈالر دے سکتا تھا۔ البتہ مجھے اس کے ساتھ سونا بھی پڑے گا۔ مجھے لڑکی کی بات سن کر بہت رنج ہوا۔ میں نے کہا: کہیں ایسا نہ کرنا، حمید تم سے بہت محبت کرتا ہے۔ بےچاری سہم گئی۔ مجھے ڈر ہے کہ تقریباً اس کی جان ہی لے لی---

انجام کیا ہوا؟

کیوبا میں انقلاب آگیا، لڑکی واپس چلی گئی اور اسے وہاں کام مل گیا۔

خوب۔ اور حمید الجزائر واپس چلا گیا۔

نہیں، حمید کی وطن واپسی کی آرزو دل ہی میں رہ گئی۔ کیوبن لڑکی چند ماہ بعد پیرس سے چند دن کے لیے یہاں آئی۔ اس نے حمید کے لیے بھی کیوبا میں کام ڈھونڈ لیا تھا۔ لیکن وہ اسے کبھی نہ دیکھ سکی۔ ہم نے اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا تھا۔

میں نے کہا: "آخر کس لیے؟ کیا یہ دوروزہ زندگی اس قابل ہے کہ اس کے لیے اتنی مصیبتیں اٹھائی جائیں؟"

یہ جملہ سوچے سمجھے بغیر میرے منہ سے نکل گیا تھا۔ لیکن بعد میں مجھے خیال آیا کہ اس سے مجھے اپنے موضوع کی بات چھیڑنے کا موقع مل گیا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ اپنی زندگی کی بات شروع کروں۔ لیکن اس نے پہل کی۔

"ایسا نہ کہیے۔ میرے کیسے میں ایسی ایسی کہانیاں ہیں کہ یہ قصہ تو ان کے مقابلے میں ذرا بھی غم انگیز نہیں۔ آخر ان میں سے ایک مر گیا، اور دوسری اپنے وطن لوٹ گئی؛ اس نے دن پھر گئے اور اسے کام اور شہرت ملی۔ ان لوگوں کا خیال کیجیے جو سالہا سال، بلکہ پوری عمر، وطن واپسی کی راہ دیکھتے رہتے ہیں، اسی امید میں زندہ رہتے ہیں، اور آخر پامال ہو جاتے ہیں۔ وطن کی محبت کوئی قصہ کہانی نہیں ہے۔ شہزادی خانم کو تو آپ اچھی طرح جانتے ہی ہیں۔ اگر مجھے مغالطہ نہیں ہو رہا تو آپ اس سے مل چکے ہیں، بات چیت کر چکے ہیں۔ اس کا نام دیا ہے۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ اس عورت نے کس قدر مصیبتیں اٹھائی ہیں۔ خدا معلوم، شاید اب بھی اٹھا رہی ہو۔"

میں نے کہا: "میں نے اسے ایک بار اصفہان میں دیکھا تھا۔ ایک رسمی دعوت میں۔ مجھے تو ذرا بھی اندازہ نہیں ہوا کہ اس نے مصیبتیں اٹھائی ہیں۔ اس کے برعکس مجھے تو وہ بہت خوش و خرم، محفل آرا، باتونی، دلکش اور تجربہ کار دکھائی دی۔۔۔"

"یہی تو اس کی مہارت ہے۔ کسی کو پتا نہیں لگنے دیتی کہ اس کے دل پر کیا گزر رہی ہے۔ میں آپ کو صرف ان لوگوں کی کہانیاں سنا سکتا ہوں جو یہاں نہیں ہیں۔ لڑکے شہزادی خانم کو غنچہ قوپیدنا کہا کرتے ہیں، فقط بدتمیزی کے طور پر۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ بات کرتے وقت اس کا منہ غنچے کی طرح کھلتا ہے اور وہ ہر حرف کو اس کی صحیح آواز سے ادا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ یہ عورت ایک جلاوطن شخص سے منسوب تھی۔ دونوں کی ملاقات ہو چکی تھی اور ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ دونوں کے کنبوں میں شادی کی بات چیت چل رہی تھی کہ گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ۲۸ مرداد کے چند مہینے بعد وہ کسی طرح ایران سے نکل آئی۔ کسی طرح کے فقرے سے میرا مقصد صرف اختصار ہے، ورنہ تو مجھے پورا ایک ناول سنانا پڑے گا۔ اس طرح کا سفر خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ بغیر پاسپورٹ کے، یا جعلی پاسپورٹ کے ساتھ، اپنے خاندان کے لوگوں سے چھپ چھپا کر جو پورے ایران میں معروف ہیں، ایک ایسے معتبر گھرانے کی کنواری لڑکی کا یوں سفر کرنا، اور وہ بھی مال دولت، آسائش، نیک نامی، زیورات اور ماں باپ کی محبت کو تج کر کسی شخص کی تلاش میں دنیا بھر کی خاک چھاننا۔ آخر ایک دو سال کی دوڑ دھوپ کے بعد وہ اس شہر میں وارد ہوئی اور بعد میں اس نے یورپ کے ایک ملک میں اپنے شوہر کو ڈھونڈ نکالا۔ ان کی باقاعدہ شادی تو نہیں ہوئی تھی، محض منگنی ہی ہوئی تھی۔ کیا آپ کا خیال ہے کہ وہ اب تک خوش قسمتی کی

Scanned with CamScanner

زندگی بسر کر رہے ہیں؟ نہیں، ایسا نہیں ہے۔ المیہ تو یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ کہتے ہیں، ریشم کا کیڑا اپنا کفن خود بنتا ہے۔ یہ عورت اس جلاوطن کی تاریک زندگی میں سورج کی روشنی بن کر داخل ہوئی اور بہار کی دھوپ میں برف کی طرح پگھل گئی۔ ان میں پہلے دن سے جھگڑے شروع ہو گئے۔ یہ کس طرح ہو سکتا تھا کہ ایک انقلابی اس غنچہ قہقہہ کے ساتھ، جس کا سر عدم معلوم کی بلندیوں پر تھا، ایک ہی گھر میں زندگی بسر کرے، اور اپنے سب کاغذ اور خط اس عورت کو سونپ دے جسے وہ جانتا تک نہیں تھا؟ اس عورت کا تو ایک شب کا خرچ ہی سیکڑوں تومان ہوتا تھا، اتنی رقم کہاں سے آتی؟ ظاہر ہے کہ وہ خود کو اقورخان رشتی کی پوتی وغیرہ سمجھتی تھی۔ اسی طرح کی باتیں جلاوطن کے کانوں میں پڑا کرتی تھیں۔ خدا جانے اور کیا کیا باتیں ہوتی ہوں گی جنہیں چہ میگوئیاں کرنے والوں نے جلاوطن کی عزت اور اثر و رسوخ کے باعث دہرانے کی ہمت نہیں کی۔ غنچہ قہقہہ پہلے دن سے دوسرے جلاوطنوں کی بیویوں کے حسد اور بے اعتنائی سے آگاہ تھی، لیکن اس بات کو خاطر میں نہ لاتی تھی۔ جلاوطن جب کبھی اسے بے خبری کے عالم میں دیکھتا تو اس کے چہرے کی اداسی دیکھ کر، ملنے جلنے والوں اور ساتھیوں سے الگ تھلگ ایک گوشے میں پڑے رہنے کے عادی سے، اور اس کے چہرے پر وقت سے پہلے پڑنے والی لکیریں دیکھ کر جان گیا تھا کہ وہ عذاب جھیل رہی ہے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ زبان حال سے کہہ رہی ہو: ایک دن تمہیں میرے خلوص اور بے گناہی کا احساس ہوگا۔ بدقسمتی یہ تھی کہ جلاوطن نے اپنی دردمندی کے تنگ حلقے کے اثر میں آ کر اس پیغام کو غلط سمجھا اور یوں ترجمہ کیا: ایک دن آئے گا کہ میں تم سب کو اچھی طرح دیکھ لوں گی۔ وہ چار سال تک عاشق اور معشوق کے طور پر ایک گھر میں رہے، مگر ان کے درمیان ایک پردہ ہمیشہ حائل رہا۔ جلاوطن کو کبھی اپنے عشق اور معشوقہ کا کھل کر دفاع کرنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ وہ ڈرتا تھا کہ مبادا لوگوں کی افواہیں درست ثابت ہوں۔ کبھی ایسا نہ ہوا کہ دونوں مل بیٹھتے اور سب گلے شکوے زبان پر لا کر دل کا غبار نکال دیتے جس سے ان کی محبت کو وسعت ملتی۔ لوگوں کو خبر نہیں تھی کہ وہ اس کی بیوی ہے یا منگیتر یا دوست یا داشتہ۔ جلاوطن کی آنکھیں اس وقت کھلیں جب اس نے دیکھا کہ وہ گھل گھل کر ختم ہوتی جا رہی ہے اور ایک احساس گناہ کے سوا اس کے اختیار میں کچھ نہیں رہا۔ وہ اپنے سیاسی اور اخلاقی اثر و رسوخ سے کام لے کر معاملے کو سلجھا سکتا تھا۔ لیکن جھجکتا رہا، بے عزتی کے خوف، سیاسی ساکھ اور ایسے ہی دوسرے بہانوں نے اس کی آنکھیں اندھی کر دیں اور وہ حقیقت کو نہ دیکھ سکا۔ ہیرو بھی بزدل ہوتے ہیں۔ اس کے خیال میں یہ معمولی باتیں اس قابل نہ تھیں کہ آدمی ان پر وقت ضائع کرے۔ وہ چاہتا تھا کہ بغیر کسی شور وغل کے اپنی کشتی کو پانی سے نکال لے۔ وہ نجی مسئلوں پر زیادہ شور مچانے کو ناپسند کرتا تھا۔ وہ انہیں معمولی اور سرسری معاملے سمجھتا تھا اور اسی اخلاقی کمزوری سے پیدا ہونے والی ذہنیت کے باعث وہ اپنی محبوب ترین ہستی کو کھو بیٹھا۔ شہزادی خانم نے جلاوطنی کے عالم میں اسے تنہا چھوڑ دیا۔ ایک دن ٹیکسی میں سوار ہوئی اور

Scanned with CamScanner

ذرا سا بھی اشارہ دیے بغیر یورپ کو روانہ ہو گئی۔ اور پھر کسی کو اس کی خبر نہیں ملی۔ لیکن اس کے جانے کے بعد بھی جھگڑا ختم نہیں ہوا۔ افواہوں نے دوسری شکل اختیار کر لی۔ سرزنش کی جگہ الزام نے لے لی۔ لوگ کہنے لگے۔ اس نے اس عورت کے ساتھ کیا کیا کہ اس نے اس کے گھر میں زندگی گزارنے پر شہر کی کچہری میں واپس جانے کو ترجیح دی؟ اس نے اس سے شادی کیوں نہیں کی؟ سب پرانی کہانی ٹکڑوں میں رہتے ہیں؛ باقی تو آپ جانتے ہی ہیں۔ اس نے اپنے کنبے کو بتایا تھا کہ وہ حاملہ ہو گئی تھی اور چونکہ اپنے ماں باپ کی عزت کو خاک میں ملانا نہیں چاہتی تھی اس لیے چلی گئی تھی۔ اور اب، جب بات رفت گزشت ہو گئی ہے تو لوٹ آئی ہے۔ اس کے گھر والوں نے سب کو یہ بتایا کہ انھوں نے اسے تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے یورپ بھیجا تھا اور اب وہ واپس آ گئی ہے۔ لیکن کیا جلاوطن کو معلوم ہے کہ اس نے اب تک شادی نہیں کی؟ جلاوطن نے خودکشی کر لی۔ یہ بات اپنے تک رکھیے گا۔ میں ان دونوں کے درمیان رابطے کا وسیلہ تھا، اور اب بھی ہوں۔ اور شہزادی خانم اب بھی رقمیں، اور ہر مہینے لباس اور سگریٹ اور چاول اور پستے اور گڑ، اور ہر عید پر سوغاتیں بھیجا کرتی ہے۔ جلاوطن ان رقموں سے استفادہ نہ کر سکا۔ میں انھیں مستحقوں میں تقسیم کر دیتا ہوں۔ اسے کیوں اطلاع دوں کہ جلاوطن مر چکا ہے؟ اس کی امید قائم رہنی چاہیے۔ ناامیدی سب سے بڑی اذیت ہے۔

چند منٹ خاموشی میں گزرے۔

میں نے پوچھا: "مگر کیا اس خبر کو ہمیشہ متعلقہ فرد سے پوشیدہ رکھا جا سکتا ہے؟"

بولا: "نہیں ہو سکتا۔ شاید شہزادی خانم جانتی بھی ہو۔ دنیا میں فضول گویوں کی کمی نہیں ہے۔ یا شاید وہ خود کو فریب دے رہی ہو۔ شاید اس نے منت مان رکھی ہو کہ لوگوں کی بدی کا بدلہ نیکی سے دے گی۔ شاید یہی اس کے دل کی تسلی کا باعث ہو۔"

میں نے دیکھا کہ وقت نکلا جا رہا ہے۔ اگر اس وقت کو غنیمت نہ جانا تو پھر کیا معلوم کب موقع ملے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ یہ موضوع چھیڑوں۔

"آج صبح جب میں نے ٹیلی فون کیا تو دامن ایریل پہلے تو میرا پیغام آپ تک پہنچانا نہیں چاہتی تھی۔ معذرت کرنے لگی کہ آپ آج کل کسی سے نہیں ملتے۔ میں نے اس کی وجہ دریافت نہیں کی۔ جب میں نے بتایا کہ جہاں دیدہ ہوں رہا ہوں، تب اس نے آپ کو بلا کر دیا۔ آج ایک لڑکی نے آکر آپ سے ملنا چاہا تو آپ نے انکار کر دیا۔ کہہ دیا کہ دو تین دن میں فون کر کے جواب لے لینا۔"

"آپ کو کہاں سے معلوم ہوا؟"

"اسے میں نے ہی آپ کے پاس بھیجا تھا۔ اس کی سرنوشت بھی دوسرے بے وطنوں سے ملتی جلتی ہے۔ وہ باپ کی تلاش میں ہے۔"

"کہاں ہے اس کا باپ؟"

"معلوم نہیں۔ آپ کو اس کا سراغ لگانا ہے۔"

"نام کیا ہے لڑکی کا؟"

"مہری۔"

"مہری؟ باپ کا نام؟"

"میں چاہتا ہوں کہ آپ اسی سے بلا کر پوچھ لیں۔"

"آپ کیوں نہیں بتا دیتے؟"

"مجھے اس کا نام معلوم نہیں ہے۔ اس نے بھی تمام جلاوطنوں کی طرح فرضی ناموں کی نقابیں اوڑھ رکھی ہیں۔ لڑکی کو یوروپ آنے سے پہلے معلوم ہوا تھا کہ اس کا باپ واقعی جلاوطنی میں زندگی بسر کر رہا ہے۔ ابھی تک اس لڑکی کا خاندانی نام جہاں دیدہ ہے۔"

"آپ کے خاندان کی ہے؟"

"میرے عزیزوں میں سے ہے۔"

"اس کی ماں کا کیا نام ہے؟"

"آپ تو مجھ سے جرح کرنے لگے۔ یہ سب باتیں آپ خود مہری سے پوچھ سکتے ہیں۔ اس کی ماں کا نام طاہرہ ہے۔"

"طاہرہ؟"

بدقسمتی سے مجھے اس کے چہرے سے اس نام کے اثر کا اندازہ نہ ہو سکا۔

"آپ کو جاننا چاہیے یہ نام معلوم ہو؟ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ اس کی منگنی ایک جلاوطن سے ہوئی تھی۔ مجھے اس جلاوطن کا نام یقینی طور پر معلوم نہیں ہو سکا۔ بس اتنا معلوم ہے کہ کسی بد حادثے سے ان میں جدائی ہو گئی۔"

وہ کچھ نہ بولا۔ ہم پیدل چل چل کر تھک چکے تھے۔ رات بارہ بجے سے زیادہ کا وقت ہو گیا تھا۔ موسم کچھ کچھ سرد ہونے لگا تھا۔ چونکہ پیدل چلتے ہوئے میرے لیے اس کے قیافے کا جائزہ لینا ممکن نہیں تھا، مجھے بہتر معلوم ہوا کہ ہم دونوں کیفے لاندولت میں جا بیٹھیں۔ میں بھوکا اور پیاسا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ ذرا لب تر کروں۔ مجھے خیال آیا کہ اگر وہ بھی ایک جام پی لے تو اس کی زبان کھل جائے گی۔ میں چاہتا تھا کہ اس کے سامنے بیٹھوں اور دیکھوں کہ طاہرہ کا نام اس پر کیا اثر کرتا ہے۔ مجھے نظر آ رہا تھا کہ طاہرہ کا نام اس کے کانوں کے لیے اجنبی نہیں ہے۔ میں نے تجویز پیش کی: چلیے کیفے لاندولت چلتے ہیں۔ آپ شراب پی لیجیے گا اور مجھے کچھ کھانے کو مل جائے گا۔

وہ ہمیشہ مجھ سے ملاقات سے پہلے شام کا کھانا کھا لیا کرتا تھا۔

بولا: دیر ہو گئی ہے۔ بہرحال چلیے۔

ہم پارک سے باہر نکلے۔ سڑک پر رک کر اشارے کے سبز ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ میں اس کے سامنے کھڑا ہو گیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا: "طاہرہ کا نام پہلے بھی کبھی سنا ہے؟"

مجھے اس کے چہرے پر کوئی تاثر دکھائی نہ دیا۔ اس کے برعکس اس کے چہرے پر پڑی ہوئی نقاب اور بھی زیادہ گہری ہو گئی۔

بتی سبز ہوئی۔ ہم نے سڑک پار کی۔ راستے میں میوزیم کے سامنے پہنچنے تک ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ ریستوراں کے سامنے پہنچ کر میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا تاکہ وہ مجھ سے پہلے اندر قدم رکھے۔ میں سڑک کے کنارے لگی ہوئی کرسیوں پر نہیں بیٹھنا چاہتا تھا۔ کیوں کہ وہ جگہ ہمیشہ ایرانی طالب علموں سے بھری رہتی تھی اور اس کے علاوہ وہاں اندھیرا بھی تھا۔ میں نے ادھر اُدھر نظر دوڑائی کہ کوئی تنہا گوشہ مل جائے، مگر نہیں ملا۔ ریستوراں کے بیچ میں ایک میز پر جہاں دو نوجوان لڑکیاں بیٹھی تھیں، دو کرسیاں خالی تھیں۔ میں ایک نگاہ میں جان گیا کہ وہ غیر ملکی نہیں ہیں۔ اُن دونوں نے جب دیکھا کہ ہم دونوں چہروں سے سنجیدہ اور کچھ کچھ تُرش دکھائی دے رہے ہیں تو ہماری طرف سے توجہ ہٹالی۔ میں اس کی آنکھوں کو دیکھ رہا تھا کہ میز کی سطح پر جمی ہوئی ہیں۔ پوچھا: "کیا آپ نے طاہرہ کا نام پہلے کبھی نہیں سنا؟"

"کیوں؟ میں جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کو کیا کچھ معلوم ہے۔ سولہ سال ہو گئے ہیں کہ میں نے یہ نام نہیں لیا۔۔۔"

آہا، مجھے محسوس ہوا کہ برف پگھلنے لگی ہے۔ لیکن ابھی پوری طرح پانی نہیں بنی۔ دراڑ پڑنے لگی ہے۔ پتا نہیں یہ خوش شگون تھا یا بدبختی۔ بہر حال، میرے لیے تو جوش آور تھا۔

تب میں جو کچھ جانتا تھا، یا جو کچھ سمجھتا تھا کہ جانتا ہوں، اسے کہہ سنایا۔

"طاہرہ ایک جلاوطن افسر کی منگیتر تھی۔ اُن دنوں جب ایران کے ریگستانوں پر سُرخ خون اور سیاہ وسوسے سے نقش بنائے جا رہے تھے، طاہرہ کو اپنے منگیتر اور اُس کے دوستوں کے رابطے کا ذریعہ بننے کا موقع ملا تھا۔ وہ ان کے لیے ایک پردے کا کام کرتی تھی۔ چوں کہ ہسپتال میں ملازم تھی، اس لیے آسانی سے ہر طرح کے لوگوں سے تعلق قائم کر سکتی تھی۔ اگر کوئی رات یا آدھی رات کے وقت بھی اسپتال آئے تو اس پر کسی کی توجہ نہیں جاتی۔ ایک رات طاہرہ ملاقات کے لیے نہیں آئی اور پھر اُس نے اپنے منگیتر کو کبھی نہیں دیکھا۔ اُسی رات حکومتِ وقت کے سپاہیوں نے کمین گاہوں میں سے ایک پر چھاپہ مارا اور تین سرکردہ افراد کو پکڑ لیا جنھیں چند ماہ بعد سزائے موت دے دی گئی۔"

میں نے اپنی بات یوں جاری رکھی: "تہران سے نکلنے والے زیرِ زمین اخبار میں طاہرہ کو حکومتِ وقت کا جاسوس قرار دیا گیا۔ مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ بعد میں اس نے شادی کر لی اور مہری اس کی بیٹی ہے۔"

"مہری طاہرہ کی بیٹی ہے؟"

"وہی لڑکی جو کل آپ کے پاس آئی تھی اور آپ نے اس سے ملنے سے انکار کر دیا تھا۔"

"تو آپ کا کہنا ہے کہ وہ طاہرہ کی بیٹی ہے اور طاہرہ نے تہران میں شادی کر لی تھی، اور وہ بھی ۲۸ مرداد کے بعد۔ پھر وہ کس طرح اپنے باپ کی تلاش میں ہے؟"

"طاہرہ کے منگیتر کی گمشدگی کو ایک مہینہ ہوا تھا کہ اسے مجبور ہو کر اپنے گھر والوں کو بتانا پڑا کہ وہ حاملہ ہے، اور انھوں نے خاندان کی آبرو رکھنے کے لیے اپنی بیٹی کی شادی کر دی۔"

"مہری کو کہاں سے پتا چلا کہ وہ اپنے باپ کی، یعنی اپنی ماں کے شوہر کی، بیٹی نہیں ہے؟"

"ظاہر ہے اس کی ماں نے یہ راز اسے بتایا ہے۔"

"آپ نے مہری کو میرے پاس کس لیے بھیجا تھا؟"

"آپ مجھ سے جو محبت رکھتے ہیں اس سے مجھے حسنِ ظن تھا کہ آپ میری خواہش سے انکار نہیں کریں گے۔ اس کے علاوہ اس لڑکی سے میری دور کی عزیزداری بھی ہے۔ اس کی ماں نے مجھ سے درخواست کی ہے کہ اجنبی شہر میں ایئرپورٹ اور کسٹم کے معاملات اور ہوٹل کی تلاش میں اس کی مدد کروں۔ سچ پوچھیے تو میری بیوی کو آپ سے میری دوستی کی خبر ہے، اس نے مجھ سے کہا کہ مہری کو آپ کے پاس بھیجوں۔"

"عزیز دوست، آپ کی کہانی مجھے کچھ کچھ جعلی معلوم ہوتی ہے۔ اب اگر میں آپ سے پوچھوں کہ بھلا آپ کو ماں اور بیٹی، یعنی طاہرہ اور مہری، کے بارے میں راز کی کیا خبر، تو آپ جواب دیں گے کہ تہران اور اس شہر کے درمیانی چند گھنٹوں کے راستے میں مہری نے پورا قصہ آپ کو سنا دیا۔ اور پھر آپ کو توقع ہے کہ میں اسے باور کر لوں گا۔ کیا بہتر نہ ہوگا کہ اپنے پتے سامنے رکھ دیں؟ شاید اس طرح آپ مہری کی مدد زیادہ اچھی طرح کر سکیں گے۔"

اس نے دیکھ لیا کہ اب کوئی چارہ نہیں۔ معاملے کو طول دینے سے فائدہ نہ تھا۔ میں نے کچھ جواب نہ دیا۔ مجھے ڈر تھا کہ تھیٹر کے اندر میرے آنسو نکلیں گے اور سب لوگ میری طرف متوجہ ہو جائیں گے۔ میں نے ویٹر کو بلا کر دام چکائے۔ پھر ہم دونوں اٹھ کھڑے ہوئے اور تاریکی میں پہنچ کر میں نے کہا: "طاہرہ میری بیوی ہے۔"

"اور مہری آپ کی بیٹی ہے؟"

"نہیں، مہری میری بیٹی نہیں ہے۔ میری شادی کا قصہ بہت عام سا ہے۔ اس وقت سے سنانے کا موقع نہیں۔ پہلی ہی ملاقات میں طاہرہ نے مجھ سے اعتراف کر لیا تھا کہ وہ حاملہ ہے۔

اس کی اسی دلیری نے میرا ارادہ پختہ کر دیا کہ اس سے شادی کروں گا۔ اب ذرا توجہ کیجیے: ایک طرف تو اس کے ماں باپ کی ریاکاری، کہ ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتے تھے، ایک تو اپنی حاملہ بیٹی سے اور دوسرے حکومت وقت کے شر سے نجات پانا چاہتے تھے۔ دوسری طرف طاہرہ کی پاکیزگی اور حوصلہ مندی۔ مگر خیر، ذکر تو مہری کا ہے۔ اسے میں جان سے بڑھ کر چاہتا ہوں۔ دیکھیے طاہرہ کی خاطر مجھے کتنی عزیز ہے کہ مہری کو لایا ہوں کہ اس کے فطری باپ کو سونپ دوں۔ اس کا حقیقی باپ تو میں ہوں۔ اسے آپ کے سپرد کرتا ہوں۔ اسے اس کے باپ تک پہنچا دیجیے۔

ہم نے ہاتھ ملایا اور الوداع کہا۔ چلتے وقت وہ پھر بولا: 'مہری کو کل صبح سویرے میرے پاس بھیج دیجیے گا۔ آپ سے ایک درخواست اور ہے۔ ایک دن اور یہاں ٹھہر جائیے۔ کل رات کو پھر ملتے ہیں۔'

کوئی دس بجے کا وقت تھا کہ مہری نے پانسیوں دوریوں کی گھنٹی بجائی اور مالکہ اسے ہال میں لے گئی۔ اس دفعہ نہ نقاشی کے نمونے نے اس کا دھیان بٹایا اور نہ دنیا بھر سے آئے ہوئے ہنروں کے ساز و سامان نے۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ نہ صرف اس وجہ سے کہ اب اسے اپنا دربی ماں کا راز ایک ایسے اجنبی شخص کے سامنے فاش کرنا پڑے گا جسے اس نے آج تک دیکھا بھی نہیں تھا، بلکہ اس سے بڑھ کر اس لیے کہ وہ ڈرتی تھی کہیں ایسا نہ ہو وہ اپنی ماں کی سچائی اور عزم کو، جس سے اس نے سولہ سال اس خفت کو برداشت کیا تھا، ٹھیک سے بیان نہ کر سکے۔ اس نے سولہ سال تک لب نہیں کھولے تھے۔ خود مہری کو اگر چند مہینے پہلے کوئی بتاتا کہ اس کی ماں اس کے باپ کی بیوی بننے سے پہلے کسی اور مرد کے ساتھ ہم خوابی کر چکی تھی تو وہ اسے گالی اور بہتان خیال کرتی۔ اب اسے کیا معلوم کہ یہ آدمی جو ابھی اس سے روبرو آنے والا تھا، کیا تصور نہیں رکھتا ہوگا۔ شکست سے بچنے کے لیے وہ بار بار وہ اپنے لبوں کو زبان پھیر کر تر کر رہی تھی، کہ اپنی ہمت بندھا سکے۔ انتظار نے دو ایک منٹ سے زیادہ طول نہ کھینچا ہوگا، لیکن پچھلے چند ماہ کے خیالات کی وجہ سے، جنھوں نے اس وقت اس کے ذہن میں طوفان برپا کر رکھا تھا، اسے یہ وقفہ بہت طویل معلوم ہوا۔ کل رات سے، جب اس نے اپنے سوتیلے باپ سے --- اس نے سوتیلے باپ کے لفظ کو اپنے ذہن میں ڈال کر چکی تو اسے سخت بدمزہ محسوس ہوا کہ اس کا باپ جو اسے جان سے بڑھ کر چاہتا تھا اب چونکہ سوتیلا باپ ہو گیا ہے --- کل رات سے لے کر، جب اس نے اپنے سوتیلے باپ سے سنا تھا کہ میرزا اس سے ملنے پر رضامند ہے، اب تک وہ اسی اُدھیڑبُن میں لگی ہوئی تھی کہ کس طرح بات شروع کرے گی اور کس طرح اپنی ماں کی سرنوشت اسے سنائے گی اور کس دلیقے سے اس کے احساسات کو بیان کرے گی۔ چند مہینے پہلے جب مہری نے ثانوی اسکول کی

Scanned with CamScanner

مدد حاصل کی تھی اور اس کے ماں باپ کا ارادہ اسے یوروپ بھیجنے کا ہو تھا۔ اس کی ماں نے اسے اس راز میں شریک کیا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے سوتیلے باپ کو بھی یہ چند روز پہلے معلوم ہوا تھا کہ رپورٹ میں حبار نے اس کی ماں کو ۔۔ لفظ ایک وحشی نام ہے ۔۔ غدار قرار دیا تھا۔ اس کی اس ذلت کی اس کے شوہر کو بھی خبر نہیں تھی۔ طاہرہ نے اسے بھی نہیں بتایا تھا کہ اس پر تین افراد کے قتل کا الزام ہے۔ اس عورت کو جس نے اپنا سب کچھ اس کی محبت میں قربان کر دیا تھا، دغا اور قتل کا قصوروار ٹھہرایا گیا تھا اور کسی نے اس الزام پر اس کا دفاع نہیں کیا تھا۔ اس کی ماں کا خیال تھا کہ اس طرح اپنی بات کہہ دینے سے اس کے دل کو آرام آ جائے گا۔ اس کی ماں کو یقین تھا کہ اس کی بیٹی سچے باپ کو ڈھونڈ نکالے گی اور اس سے کہے گی کہ نہیں، غداری نہیں کی گئی تھی۔ اس لیے مہری نے اپنے لیے ایک نقشہ تیار کر لیا تھا کہ کیونکر بات کا آغاز کرے گی، کس طرح آگے بڑھے گی اور کیسے نتیجے تک پہنچے گی۔ گرما کے سورج کی چمک سے جو چونک بادلوں سے نکل آیا تھا، مہری کی آنکھیں چندھیا گئیں اور وہ نہ دیکھ سکی کہ ایک شخص جنوبی دروازے میں کھڑا اسے دیکھ رہا ہے۔

میرزا آہستہ آہستہ لڑکی کے نزدیک آیا۔ اس کا ہاتھ تھاما اور صوفے پر اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔ اس کا حال دریافت کیا: خوب، تو مہری خانم، کیا خبر ہے؟ میرا پتا کس طرح معلوم ہوا؟

میرزا کے انکسار اور توقع کے انداز نے لمحہ بھر میں مہری کی پچھلے چند دن کی تذبذب کی کیفیت کو نقش بر آب کر دیا۔ مہری بے اختیار ہو کر رو پڑی اور سسکیاں لیتے ہوئے بولی: میری ماں نے کوئی غداری نہیں کی۔"

تبھی ایک برازیلی لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈالے ہوئے ہال میں داخل ہوئے۔ میرزا اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے مہری کا گرم اور نرم ہاتھ تھام لیا۔ چلو، میرے کمرے میں چلتے ہیں۔ وہ تنہا اچھا تو نہیں ہے، مگر وہاں ہم آرام سے بات کر سکتے ہیں۔ دوست۔ مجھے معلوم نہیں تم کس کے یا کس چیز کے بارے میں بات کر رہی ہو۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم ساری بات مجھے مکمل کر بتا دو تاکہ میں تمہارے درد میں شریک ہو سکوں۔

کمرے میں کرسی ایک ہی تھی۔ مہری اس پر بیٹھ گئی اور میرزا مسہری پر۔ لڑکی کا ہاتھ ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ چاہنے کے باوجود وہ اسے چھوڑنے سے قاصر تھا۔ فقط جب مہری نے اپنا پرس کھولنا چاہا تو اس نے مجبوراً اس کا ہاتھ چھوڑا۔ وہ اب سکون سے تھی۔ میرزا کمرے سے باہر گیا اور چند منٹ بعد چائے کی دو پیالیاں لے کر لوٹا۔ اس وقت مہری نے پرس میں سے ایک ڈائری نکالی اور اسے اپنی داستان سنانی شروع کی:

۲۴ آبان کی رات تھی۔ موسم سرد ہو رہا تھا۔ طے ہوا تھا کہ طاہرہ نماز کی چادر اوڑھ کر پچھلے دروازے سے اسپتال میں داخل ہو گی اور محافظ خانے میں کچھ منٹ ٹھہر کر ٹیلی فون کال کا انتظار کرے گی۔ توقع کے خلاف محافظ خانہ روشن تھا۔ اس نے چند منٹ خود کو کسی طرح مصروف رکھا۔ چادر سر سے اتار لی۔ طے یہی ہوا تھا کہ اسے فون پر اطلاع دی جائے گی کہ وہ کس جگہ رک کر انتظار کرے جہاں سے اس کے منگیتر سے ملاقات کے لیے لے جایا جائے گا۔ وہ آدھے گھنٹے تک انتظار کرتی رہی۔ جب کچھ خبر نہ آئی تو وہ اس سوچ میں پڑ گئی کہ باہر کسی لیے شخص کو ٹیلی فون کرے جو اسے کوئی اطلاع دے سکے۔ وہ اسپتال سے فون نہیں کرنا چاہتی تھی کیوں کہ اسے بے احتیاطی سمجھتی تھی۔ اس نے نماز کی چادر کو ایک الماری میں رکھ دیا اور اسپتال کے صدر دروازے سے باہر نکلی۔ سڑک کے دوسری طرف ایک جیپ کھڑی ہوئی تھی۔ طاہرہ شک میں پڑ گئی۔ وہ چلتی ہوئی سنیما کے ٹکٹ گھر تک گئی، لیکن اس کا دل گھبرا رہا تھا۔ اس آدمی کے ذریعے اپنے منگیتر کو پیغام پہنچانا بہت ضروری تھا جس سے وہ کل رات چھپ کر ملی تھی۔ کچھ لوگ خط سے میں تھے۔ جس وقت سے وہ اسپتال سے باہر نکلی تھی شاید دس منٹ سے زیادہ نہ گزرے تھے۔ وہی جیپ سنیما کے سامنے آ کر رک گئی۔ ایک شخص اس میں سے باہر آیا اور بولا: خانم، ہمارے ساتھ آئیے۔ ہمیں آپ سے کچھ کام ہے۔

طاہرہ کو حفاظتی پولیس کے دفتر لے گئے۔ اس سے پوچھا کہ اسے اسپتال میں کیا کام تھا۔ اس نے جواب دیا: میں کسی کسی رات اسپتال جا کر مریضوں کو دیکھتی ہوں۔ پوچھا: اپنی چادر محافظ خانے میں کیوں چھوڑ آئیں؟ بولی: اس لیے کہ مجھے گھر سے چلتے وقت خیال تھا کہ برف پڑے گی اور نہیں چاہتی تھی کہ بال گیلے ہوں۔ جب دیکھا کہ موسم برف آلود نہیں تو چادر الماری میں رکھ دی چادر اوڑھ کر سنیما نہیں جانا چاہتی تھی۔ پوچھا: پھر سنیما گئیں کیوں نہیں؟ اس نے جواب دیا: جا ہی رہی تھی کہ آپ نے پکڑ لیا۔ کہا گیا: ٹکٹ گھر تک تو گئی تھیں، ٹکٹ لیا کیوں نہیں؟ جواب میں بولی: ہاں، میں نے سوچا پہلے ایک چکن سینڈوچ خرید لوں پھر سنیما میں واپس آؤں۔

انھوں نے طاہرہ کا نام پتا لکھ لیا۔ پھر اسے جیپ میں بٹھا کر گھر لے گئے۔ پورے گھر کی تلاشی لی۔ کچھ برآمد نہ ہوا تو اسے چھوڑ دیا۔

اس دن کے بعد امی نے اپنے منگیتر سے ملنے کے وسیلے جس جس سے بھی رجوع کیا، سے وہی جواب سننا پڑا جو میں پہلے بتا چکی ہوں۔ انھی دنوں اس اخبار میں چھپا کہ فاطمہ پولیس کی جاسوس ہے اور تین افراد کا خون اس کی گردن پر ہے۔"

میرزا نے ٹوکا: "فاطمہ یعنی طاہرہ۔"

اس پر مہری نے وضاحت کی: "امی اور ان کے دوست کے درمیان یہی نام طے ہوا تھا۔"

میرزا نے دریافت کیا: "تم نے کبھی اس شخص کو جس نے تمھاری ماں کے ساتھ بے وفائی

کی اور ان کی آبرو اور شرافت کا دفاع کرنے کی ہمت نہیں کی---

مہری نے اس کی بات کاٹی۔ میرے ابا کو برا مت کہیے۔ امی انھیں شریف آدمی سمجھتی ہیں۔ اگر ان کی جگہ کوئی اور بھی ہوتا تو اس کے سوا کچھ نہ کر پاتا۔

میں کسی کی برائی نہیں کر رہا ہوں---"

بات صاف ہے۔ انھوں نے ایک عورت کو گرفتار کیا اور دو ایک گھنٹے بعد چھوڑ دیا۔ اس کے بعد تیس افراد کو سزائے موت ہوئی۔ کون یقین کرے گا کہ عورت نے غداری نہیں کی؟

اب تم اپنے باپ سے کیا چاہتی ہو؟ جب کہ تمھارا سوتیلا باپ تمھارے باپ سے زیادہ تم پر مہربان ہے۔

امی--- نہیں، صرف امی نہیں--- ان کی طرح میں بھی۔ ہماری خواہش ہے کہ ابا کو یہ معلوم ہو جائے کہ ہم نے ان سے غداری نہیں کی۔

قریب تھا کہ میرزا درد سے مغلوب ہو جاتا، اس درد سے جس پر اس نے ایک عمر میں قابو پایا تھا۔ لیکن اس نے خود کو سنبھال لیا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ مہری کو آغوش میں لے لے، اسے پیار کرے اور کہے: میری بیٹی--- لیکن اس نے ضبط کرنا سیکھ لیا تھا۔

اب تمھیں توقع ہو گی کہ تمھارا باپ تم سے اور تمھاری ماں سے اس بزدلی کی معافی مانگے جو اس نے دکھائی۔ کیا اس سے تمھاری ماں کی سولہ سال کی مصیبت دور ہو جائے گی اور آئندہ کے لیے اس کی تشفی ہو سکے گی؟'

نہیں، ایسا نہیں ہے۔

"پھر کیسا ہے؟

پتا نہیں۔ چاہتی ہوں کہ ابا کے گلے لگ کر آنسو بہاؤں۔ اس کے بعد امی کو لکھوں گی کہ میرے رنج بہہ گئے، امی جان، اب آپ بھی خوش ہو جائیے۔'

میرزا کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔ وہ اٹھا اور مہری کے سر کو سینے سے لگا کر بولا: میری بیٹی، تم سمجھ لو میں ہی تمھارا باپ ہوں۔" اور اس کے بالوں کو سہلانے لگا۔

کچھ دیر دونوں خاموش رہے۔

اب تم جاؤ۔ میں معلومات کروں گا۔ اگر کچھ خبر ملی تو تمھارے سوتیلے باپ کو بتا دوں گا۔

سچ یہ ہے کہ اس لہر کے بعد جو اس کے اندر اٹھی تھی، اس نے خود کو پھر سنبھال لیا تھا۔ یہ احساس ہو کہ اس نازک ہستی نے اس کی زندگی کے توازن کو برہم کر دیا ہے۔ اگر میرزا نے تنہا زندگی گزارنے کا قصد کیا ہوتا تب بھی اس کی سرنوشت ایسی غمناک نہ ہوتی۔ اس نے سہارا دے کر مہری کو کرسی سے اٹھایا اور اسے دروازے تک پہنچایا۔ برآمدے میں لڑکا لڑکی بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے اور خط لکھ رہے تھے۔ میرزا نے ان پر نگاہ ڈالی، مہری کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اسے

Scanned with CamScanner

پالسیوں سے رخصت کیا۔

حسبِ معمول ہم پھر ہوٹل میٹروپول کے سامنے والے باغ میں ملے۔ اس شام کنسرٹ نہیں ہو رہا تھا اور بنچیں خالی تھیں۔ ہم کچھ دیر ٹہلتے رہے، پھر ایک فوارے کے سامنے جا بیٹھے۔ ہمارے درمیان بات بہت کم ہوئی۔ رات تین بجے تک مختلف کیفوں، ریستورانوں اور مے خانوں میں شب گردی کرتے رہے۔ ایک دوسرے سے کہنے کو ہمارے پاس کچھ زیادہ نہ تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میری طرح وہ بھی اس فکر میں ہے کہ اس ماجرے کا انجام کیا ہوگا۔ ہم نے ایک ایسا کام ہاتھ میں لے لیا تھا جس کے بارے میں خود بھی نہیں جانتے تھے کہ ختم کیسے کریں گے۔

میرزا کے خیال کے مطابق یہ بہت آسان معلوم ہوتا تھا۔ لیکن نازک احساسات کو یوں مٹھی میں لے کر دور پھینک دینے کے لیے فولادی اعصاب درکار تھے۔

میں نے اس سے پوچھا: "پھر آپ نے مہری کو دیکھا؟ کیا خیال ہے؟"

اس کے جواب نے مجھے دہشت زدہ کر دیا۔

'مہری میری بیٹی ہے۔ ہاں، میں ہی مہری کا فطری باپ ہوں۔ میں نے اور طاہرہ نے آپس میں طے کیا تھا کہ جب بچہ ہو، اگر لڑکی ہوئی تو اس کا نام مہری رکھیں گے۔'

"آپ نے مہری کو بتایا؟"

"نہیں، اُسے نہیں بتایا۔ اور میرے بس میں ہوا تو کبھی نہیں بتاؤں گا۔ خدا کرے اسے بتانے کی ضرورت کبھی نہ پڑے۔ میں اُس کا فطری باپ ہوں۔ بس، نہ اس سے زیادہ نہ کم۔ مہری کو آپ ہی کی بیٹی رہنا چاہیے۔ میں تنہائی کا عادی ہو گیا ہوں۔ میں آپ کی اولاد کو آپ سے نہیں چھین سکتا۔ پھر اُس کے لیے یہی بہتر ہے کہ وہ آپ کی بیٹی رہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ اُس سے کیا کہوں۔"

"کہنا کیا ہے؟ وہی جو سچ ہے۔"

جواب میں بولا: 'کون سا سچ؟ یہ کہ میں جو اُس کا باپ ہوں، مدت ہوئی مر چکا ہوں؟ میرا عشق اُسی دن مر گیا تھا جب وہ خبر اُس اخبار میں میری رضامندی سے -- ہاں، میری مکمل رضامندی سے -- شائع ہوئی تھی۔ میں نے زن و فرزند کے عشق کو مار ڈالا۔ آپ نے دلیری کی کہ پرانی روایتوں کو خاطر میں نہ لائے اور طاہرہ کو اپنی بیوی بنایا اور مہری کو اپنی بیٹی کی طرح پالا۔ آپ ہی اس کے اصل باپ ہیں نہ کہ میں ڈرپوک اور کم زور۔ جب طاہرہ مجھ سے ملاقات کو نہ پہنچی تو میں نے یقین کر لیا کہ کوئی حادثہ پیش آ گیا ہے۔ مجھے یہ تصور ناممکن لگا کہ کوئی عورت جو ایسی بے وفا محبت کرتی ہو، ایک دو گھنٹے کے عرصے میں اپنے محبوب اور اپنے عشق سے دست بردار ہو جائے۔

لیکن میرا تصور کافی نہیں تھا۔ واقعات مجھ سے زیادہ گویائی رکھتے تھے۔ اگر مجھے اپنی جان کا خوف نہ ہوتا تو اگلے روز، یا جب اُن تین افراد کے قتل کی خبر سنی تھی — یعنی اس کے اخبار میں آنے سے بہت پہلے — اُس کے گھر چلا جاتا اور اس سے چند جملوں ہی کا تبادلہ کر لیتا تاکہ حقیقت جان سکوں۔ ہاں، اس وقت، اُس وقت بہت سی چیزیں مختلف شکل اختیار کر سکتی تھیں۔ شاید اُس روز میں بھی مارا جاتا۔ میں مر چکا ہوتا۔ مگر اس طرح ایک عمر موت کے عالم میں بسر کرتا۔ اس سے کہہ دیجیے کہ مر گیا۔

نہیں، نہیں، ایسا نہیں کہنا چاہیے۔ مجھ میں تو یہ کہنے کی جرات نہیں ہے۔ آخر اب آپ اس لڑکی یا اس کی ماں کے لیے فقط باپ یا جوانی کے دنوں کے منگیتر تو نہیں ہیں۔ میرے خیال میں — خواہ وہ صحیح ہو یا غلط — ان کی امیدوں کا مظہر ہیں۔ ہمیں اُن کو ٹھیس نہیں دینا چاہیے۔ آپ خود مجھ سے کہتے ہیں کہ دونوں کی امید کو قائم رکھنا چاہیے۔

باقی تمام رات ہم نے اسی طرح، ایک دوسرے سے ایک لفظ کہے بغیر، خود سے یہی سوال کرتے ہوئے گزاری: حقیقت کو کہاں تلاش کریں؟

○○

(فارسی عنوان: "میرزا")

جلال آلِ احمد

فارسی سے ترجمہ: اجمل کمال

جشنِ مسرت

دوپہر کے وقت جب میں سکول سے گھر آیا تو بابا حوض کے پاس بیٹھے وضو کر رہے تھے۔ سلام ابھی میرے منہ ہی میں تھا کہ ان کے حکم آنے شروع ہو گئے:

"چل، ہاتھ دھو، پھر چھت پر سے میرا تولیا لا کر دے۔"

یہ ان کی عادت تھی۔ جوں ہی ہم میں سے کسی پر نظر پڑتی یہی شروع کر دیتے، چاہے ہم ہوں یا اماں یا چھوٹی بہن۔ میں نے اپنا ہاتھ حوض میں ڈالا تو مچھلیاں اِدھر اُدھر بھاگنے لگیں۔ بابا نے کہا:

"گدھے کے بچے، آہستہ!"

میں فوراً چھت کو جانے والے زینے کی طرف لپکا۔ اُنہیں مچھلیاں بہت عزیز تھیں۔ حوض کی سفید اور سُرخ مچھلیاں۔ وضو اس طرح کرتے کہ مچھلیاں اپنی جگہ سے جنبش تک نہ کرتیں۔ مگر پتا نہیں کیوں میرے حوض کے نزدیک آتے ہی وہ اِدھر اُدھر ہونے لگتیں۔ اپنا سر نیچے کر لیتیں، دُم کو زور زور سے ہلاتیں، اور حوض کی تہہ میں پہنچ جاتیں۔ اسی لیے مجھے مچھلیوں سے نفرت تھی۔ زینہ چڑھتے ہوئے میں نے مچھلیوں کو دو ایک گالیاں دیں اور چھت پر پہنچ گیا۔ ہر طرف دھوپ پھیلی ہوئی تھی مگر سردی ایسی تھی کہ ۔ پوچھو۔ ہمارے ہمسائے صفر آقا اپنے کبوتروں کو دانہ ڈال رہے تھے۔ میں نے تولیا لگنی پر سے اتارا اور کھڑا ہو کر کبوتروں کو دیکھنے لگا۔ انھیں مجھ سے ڈر نہیں لگتا تھا۔ میں نے اصغر آقا کو سلام کیا جنھوں نے پچھلے دنوں اپنی بیٹی کی شادی کر دی تھی اور اب اپنے گھر میں تنہا رہتے تھے۔ کبوتروں میں سے ایک کے پَر پنجوں تک پھیلے ہوئے تھے۔ چاروں طرف اور

ہموار- اور چال کس قدر پیاری تھی کہ نہ پوچھو- میں نے کہا:

اصغر آقا، اس کبوتر کے پیر ایسے کیوں ہیں؟

بولے: ارے سیکڑوں میں ایک بھی ایسا نہیں ہوتا- جانتے ہو؟ کل اسے پار کر کے لایا ہوں-

میں نے کہا: "پار کر کے؟"

ہاں، کسی نے میرے ساتھ گڑبڑ کی تھی- میں نے اس کے دو قُمری اڑا لیے-

بابا نے میرے اس کبوتر باز ہمسائے سے بات کرنے پر بھی پابندی لگا رکھی تھی- مگر کب میں ان کے امر و نہی پر کان دھرتا تھا؟ دو تین بار، اصغر آقا کے ہاتھ سے کنکر ہمارے آنگن میں آ گرے تھے اور بابا نے چیخنا چلانا شروع کر دیا تھا- ایک بار تو بدقسمتی سے ٹھیک اس وقت جب بابا حوض پر وضو کر رہے تھے، کبوتروں کی طرف پھینکا ہوا ایک ڈھیلا ہمارے حوض میں آ گرا اور بابا کی مچھلیاں ڈر گئیں- پھر جو چیخ پکار شروع ہوئی ہے تو بس دیکھنے کی چیز تھی- بابا نے اپنی داڑھی اور بزرگی کے باوجود ایسی ایسی گالیاں اصغر آقا کو دیں کہ میرے تو رونگٹے کھڑے ہو گئے- مگر اصغر آقا نے زبان تک نہ کھولی- اس روز سے مجھے اصغر آقا اچھے لگنے لگے اور بابا کی روک ٹوک کے باوجود جب بھی مجھے موقع ملتا انھیں سلام کرتا اور ان کے کبوتروں کے بارے میں ایک آدھ بات پوچھتا- ابھی میں نے پوچھا ہی تھا:

اچھا، اس کا نام قُمری ہے؟"

کہ بابا کے چھینکے کی آواز اوپر آئی کہ: "گدھے کے بچے کہاں رہ گیا؟

افوہ! میں تو بابا کا تولیا لیے آیا تھا- لٹکتا ہوا زینے سے نیچے اترا- گرتے گرتے بچا- بچے کا بچنا تو نہیں تھم رہا تھا کہ پانی کا ایک قطرہ ان کے ہاتھ سے ٹپک کر میرے ہاتھ پر گرا- بس یوں لگا جیسے انھوں نے مجھے پاشا مار دیا ہو- میں مڑ جانے کو تھا ہی کہ کسی نے گلی کا دروازہ کھٹکھٹایا-

دیکھ جا کے کون ہے- کربلائی حسین ہو تو کہہ ابھی آتا ہوں-

جب کبھی بابا کو مسجد جانے میں دیر ہو جاتی تو لوگ ان کو بلانے بھیج جاتے- میں نے دروازہ کھولا- ڈاکیا تھا- اس نے ایک لفافہ میرے ہاتھ میں دیا اور کچھ کہے بغیر چلا گیا- وہ ہمارے ساتھ اسی طرح پیش آتا تھا- بابا اسے کبھی انعام یا عیدی جو نہیں دیتے تھے- ہم سے بالکل بگڑا ہوا تھا- مجھے تعجب ہوتا تھا کہ بابا کے خط اتنے کیوں ہیں- اس خیال سے کہ کہیں آنا ہی نہ چھوڑ دے ایک بار میرا ارادہ ہوا تھا کہ اپنے جیب خرچ میں سے تھوڑا تھوڑا کر کے ایک تومان جمع کر کے اسے دوں اور کہوں حاجی آقا نے دیا ہے- یعنی بابا نے- محلے میں سب انھیں حاجی آقا کہتے تھے-

یوں تھا گدھے کے بچے؟"

بابا کی آواز کمرے کے اندر سے آ رہی تھی- میں نے دروازے میں سے ہاتھ بڑھا کر لفافہ

Scanned with CamScanner

انھیں دیا اور کہا: "ڈاکیا تھا۔"

"اسے کھول کر پڑھ۔ دیکھوں تجھے اسکول میں کچھ سکھاتے بھی ہیں یا نہیں۔"

بابا کرسی پر بیٹھے داڑھی میں کنگھی کر رہے تھے۔ میں نے لفافہ کھولا۔ اس میں سے ایک کاغذ نکلا جس پر چار سطریں چھپی ہوئی تھیں۔ میں بڑا خوش ہوا۔ اگر ہاتھ کا لکھا ہوا ہوتا، اور خاص کر اگر خطِ شکستہ میں ہوتا، تو میں ہرگز نہ پڑھ سکتا، اور بابا پھر سر کھانے لگتے۔ صرف بابا کا نام چھپی ہوئی سطروں کے بیچ میں قلم سے لکھا ہوا تھا۔ نیچے ہمارے محلّے کے یک آخوند کے دستخط تھے جس نے حال ہی میں نئی وضع کی ٹوپی پہننا شروع کی تھی۔ پچھلے سال تک بابا کے پاس اس کا آنا جانا تھا۔

"اب پڑھ بھی سہی۔ چپ کیوں کھڑا ہے؟"

میں پڑھنے لگا: "۱۷ دی ماہ کی پُرمسرت یاد اور آزادیِ نسواں کے سلسلے میں ایک جشن بندے کے مکان پر۔۔۔"

یہیں تک پڑھا تھا کہ بابا نے خط میرے ہاتھ سے چھین لیا اور مجھے ان کی آواز سنائی دی کہ:

"ادھر دے میں دیکھوں گدھے کے بچّے۔"

میں اندر چلا گیا۔ غصّے کی حالت میں ان کے سامنے سے ٹل جانا ہی بہتر ہوتا تھا۔ صحن میں مجھے ان کے بار بار چلّانے کی آوازیں سنائی دیں کہ "کتّے کا بچہ، زندیق، پدرسوختہ، ملحد!

زندیق سے تو میں واقف تھا۔ وہ اصغر آقا کو بھی زندیق کہتے تھے۔ مگر ملحد یعنی کیا؟ یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ آخر اس کاغذ پر کیا لکھا ہوا تھا؟ میں نے پہلی ہی نگاہ میں بھانپ لیا تھا کہ کوئی دعوت نامہ ہے۔ مجھے یہ بھی یاد تھا کہ اس کے بیچ میں بابا کا نام بہت مختصر کر کے لکھا گیا تھا۔ "آیت اللہ" اور "حجۃ الاسلام" وغیرہ جنھیں میں ان کے نام کے ساتھ لکھا دیکھنے کا عادی تھا غائب تھے۔ صرف ان کا اپنا اور خاندانی نام درج تھا۔ اور اس کے آگے لکھا تھا: "اور بیگم" جس کا مطلب میری سمجھ میں نہ آیا۔ یہ تو میں جانتا تھا کہ بیگم کا کیا مطلب ہوتا ہے؛ آخر میں چھٹی جماعت میں تھا اور اس سال مجھے سند ملنے والی تھی۔ مگر بابا کے نام کے ساتھ کیوں؟ ایسا تو میں نے آج تک نہ دیکھا تھا۔

تالاب کے پاس سے گزرتے ہوئے میں نے مچھلیوں کا منہ چڑایا جنھوں نے اپنے منہ پانی سے آدھے باہر نکال رکھے تھے اور انھیں بار بار کھولتی اور بند کرتی تھیں۔ مگر اس پر میرا دل ٹھنڈا نہیں ہوا۔ میں نے چلّو بھر پانی لے کر ان کے منہ پر مارا اور دوڑ کر باورچی خانے کی طرف چلا گیا۔ اماں بینگن بھون رہی تھیں۔ باورچی خانے میں دھواں بھرا ہوا تھا اور اماں کی آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں۔ بالکل ویسی جیسی محرّم کی مجلس سے لوٹ کر ہوتی تھیں۔

"سلام اماں، آج کھانے میں کیا ملے گا؟"

دیکھ تو رہے ہو۔ وعلیکم سلام۔ تمھارے بابا گئے؟"

"نہیں، ابھی نہیں۔"

بھنے ہوئے بینگنوں کے آدھے آدھے کٹے ہوئے ٹکڑے صحنک میں رکھ دیے تھے اور ان کے ارد گرد تلی ہوئی پیاز کے لچھے سجا دیے تھے۔ میں نے تھوڑی سی پیاز اٹھا کر منہ میں ڈال لی اور اسے چباتے ہوئے کہا:

"اماں، بھوک لگی ہے۔"

جاؤ بہن کے ساتھ دسترخوان بچھاؤ۔ میں ابھی اوپر آتی ہوں۔

میں نے پیاز کے دو تین لچھے اور منہ میں ڈال لیے اور جب باورچی خانے سے نکلا تو میرے منہ میں پانی بھر آیا تھا۔ بہن کرسی کے اماں کی جگہ پر بیٹھی تھی اور ان کی قینچی سے موروں کی کترنیں نکال نکال کر گڑیا بنا رہی تھی۔ بہت ہی موٹی بھدی اور بدصورت گڑیا تھی۔ میں نے کہا:

کتے کی دم، پھر اماں کی جگہ بیٹھ گئی؟

اور اس کی پھیلی ہوئی بساط پر ایک زور کی ٹھوکر لگائی۔ وہ زور سے چلائی:

اماں! یہ ذلیل عباس پھر آ گیا۔ کتے کا تخم!

اسے ٹھوکنے کو اس وقت میرا جی نہیں چاہ رہا تھا۔ مجھے سخت بھوک لگی ہوئی تھی اور بھنے ہوئے بینگن خوب سرخ ہو رہے تھے، اور میں نہیں چاہتا تھا کہ اماں میرا کھانا بند کر دیں۔ اس لیے میں نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہ دی اور اس طاقچے کی طرف چلا گیا جہاں میرا سارا سامان رکھا رہتا تھا۔ جغرافیہ کی کتابیں میں نے ایک طرف ڈالیں اور ٹکٹوں کی البم نکال کر غور سے اسے دیکھنے لگا کہیں کسی نے اس سے چھیڑ چھاڑ تو نہیں کی ہو۔ عراق اور شام کے ٹکٹ دیکھ دیکھ کر میری آنکھیں تھک چکی تھیں۔ کیا کرتا؟ ہمارے پاس صرف دو جگہوں سے خط آتے تھے۔ ان سب میں مجھے عراق کا ایک ٹکٹ بہت پسند تھا جس پر سانپ کی گردن کی شکل کا ایک مینار بنا ہوا تھا جو اپنی نوک کے پاس پہنچتے پہنچتے بالکل پتلا ہو گیا تھا۔ اس کے اوپر ایک گنبد سا رکھا تھا جو بالکل مکھی جتنا دکھائی دے رہا تھا۔ میری بڑی آرزو تھی کہ کاش اس مینار کی جگہ ہوتا، یا کم سے کم اس کے گھونسلے ہی کی جگہ ہوتا۔

"عباس!"

اماں کی پکار سنائی دی۔ خدایا، اب کیا کام آ پڑا؟ اس کی پکار بالکل ویسی تھی جیسی اس وقت لگتی تھی جب میری پٹائی ہونے والی ہو۔ میں دوڑا۔

وہ آہستہ سے کہنے لگیں: بیٹا! مسجد میں جا کر بتا کہ آقا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ پھر دوڑ کے بیچ کے کمرے میں جاؤ اور کہو کہ اگر تم میں آ سکتی۔ ٹھیک رکھا ہو تو میں پر رکھ دے اور فوراً یہاں آ جائے۔

"ارے بیٹے کو دو نوالے تو زہر مار کر لینے دیجے۔۔۔"

یہ ماں نہیں۔ مجھے پتہ نہیں چلا کہ کب باورچی خانے سے نکل آئیں۔ مگر اتنا جانتا تھا کہ

ان میں تکرار شروع ہو گی اور کھانا وغیرہ سب خاک میں مل جائے گا۔

"زبان دراز عورت! پھر تو نے میرے کام میں دخل دیا؟ ٹھیک ہے، اب تجھے ننگے سر اور ننگے بدن جشن میں لے کر جاؤں گا!"

بابا کا منہ ایسا لال ہو رہا تھا کہ میں ڈر گیا۔ ان کا غصہ میں نے بہت دیکھا تھا، کبھی مجھ پر، کبھی ماں پر، کبھی اپنے مریدوں یا محلے میں کام کاج کرنے والوں پر۔ مگر ایسا حال آج تک کبھی نہ دیکھا تھا۔ اُس دن بھی نہیں جب وہ اصغر آقا کو جو منہ میں آیا کہہ رہے تھے۔ ماں بالکل ہکابکا رہ گئیں اور ان کی سٹی گم ہو گئی، اور میرا حال اُن سے بھی بدتر۔ بابا کی گردن کی رگیں پھول کر رسی جتنی موٹی ہو گئی تھیں۔ دیر کرنے کا موقع نہ تھا۔ ابھی جوتوں میں پیر ڈال رہا تھا کہ اماں ایک بڑا سا لقمہ ہاتھ میں لیے آئیں اور بولیں:

"یہ لے اور بھاگ جا، اس سے پہلے کہ بالکل ہی منحوس ہو جائیں۔"

ابھی آدھا لقمہ میرے ہاتھ ہی میں تھا کہ میں دوڑ کر دہلیز پار کر گیا۔ ایسی سخت سردی تھی کہ نہ پوچھو۔ باقی لقمہ میں نے گلی میں دو بار منہ چلا کے ختم کیا اور مسجد کے دروازے تک پہنچتے پہنچتے منہ بھی پونچھ لیا۔

دروازے کے پاس پھٹے پرانے جوتے قطار میں رکھے تھے۔ جماعت کی صفیں اسکول کے بچوں کی صفوں سے بھی زیادہ ٹیڑھی میڑھی تھیں۔ بابا کے مرید دو دو چار چار کی ٹولیوں میں کھڑے آپس میں باتیں کر رہے تھے اور تسبیح بھی پھیرتے جا رہے تھے۔ مجھے کچھ بولنے کی ضرورت نہ پڑی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی لوگوں میں ہل چل شروع ہو گئی اور وہ نماز کے لیے کھڑے ہونے لگے۔ وہ مجھے دیکھتے ہی سمجھ جاتے تھے کہ آج بابا نہیں آئیں گے۔

پھر میں بازار کی طرف دوڑا۔ کبابی کی دکان کے پاس سے گزرتے ہوئے میری طبیعت لش کرنے لگی۔ کبابوں کا دھواں ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ میری نظر آگ کے شعلے اور کباب کی سیخوں پر پڑی جنہیں مشہدی علی الٹ پلٹ رہا تھا اور اس کے سامنے تلی ہوئی پیاز اور کتری ہوئی مولیوں سے بھرا تھال رکھا تھا۔ میں آگے بڑھ گیا۔ حلوے والے کے پاس سے گزرتے ہوئے میری اشتہا کبھی تیز نہیں ہوتی تھی۔ اس کا دروازہ بند اور کھڑکیوں پر پردے پڑے رہتے تھے، جیسے اندر لوگ چھو کھانے کے بجائے بُرا کام کر رہے ہوں۔ آش کی دکان پر سناٹا تھا اور دیگ بھی چڑھی ہوئی نہ تھی۔ حلیم کا موسم آ گیا تھا اور اب آش کی دکان صبح ہی کے وقت چلتی تھی۔ صبح جب گزرے کا جوڑا پڑا ہوتا تھا دکان کے سامنے ایک تھال میں سالم کھال اتری بھیڑ دھری ہوتی تھی اور اس کی کٹی ہوئی گردن درخت کے تنے جیسی لٹک رہی تھی۔ دوسری طرف کے چبوترے پر ایک اور تھال گندم سے بھرا رکھا تھا اور اس کے اوپر ایک بڑا، بہت بڑا پیالہ۔ مگر مجھے تو دوڑ کر چچا کو خبر کرنی تھی ورنہ کھانا بند ہو جاتا۔

Scanned with CamScanner

بازار کے آخر میں ایک مشک پکانے والا آش رشتہ کی دیگ کو اپنی ٹانگوں کے بیچ میں لیے بیٹھا تھا اور اس کے گاہک سڑپ سڑپ کر کے آش پی رہے تھے۔ ان میں زیادہ تر حمال تھے اور انھوں نے اپنی اپنی نمدی کلاہیں بغل میں داب رکھی تھیں۔ موچیوں کے بازار میں چمڑے کی تیز بو سے میرا دم گھٹنے لگا اور میں دوڑ کر بازار کے اندر کے حصے میں گھس گیا۔ وہاں سردی بالکل نہیں تھی۔ میرے کان گرم ہو چکے تھے۔ پیروں کے نیچے لکڑی کی چھیلن کا نرم فرش بچھا ہوا تھا۔ کنارے کنارے دور تک تختے پڑے تھے جن میں سے کیسی سوندھی باس اٹھ رہی تھی۔ میری خواہش تھی کہ ایسے تین تختے مل جائیں تو اپنے طاقچے میں خانے بنا لوں۔ ایک کتابوں کے لیے، ایک چھوٹی موٹی دوسری چیزوں کے لیے اور ایک، سب سے اوپر والا، ایسی چیزوں کے لیے جنھیں چھوٹی بہن کی پہنچ سے باہر رکھنا چاہتا تھا۔ یہی سوچتا ہوا چچا کے حجرے تک جا پہنچا۔ مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں دم بھر کو حجرے میں داخل ہو کر اپنے چاروں طرف دیکھ رہا تھا کہ چچا کا شاگرد پتہ نہیں کہاں سے نکل آیا۔ مجھے پہچان گیا۔ بتایا کہ چچا پیچھے کی کوٹھری میں کھانا کھا رہے ہیں۔ میں فوراً کوٹھری میں گیا۔ ان کے سامنے انگیٹھی رکھی تھی اور وہ کاندھوں پر عبا ڈالے، اپنے تخت پر بیٹھے خورشت فسنجان اور پلاؤ کھانے میں مشغول تھے۔ میں نے سلام کر کے تمام قصہ کہہ سنایا۔ میں بتاتا رہا کہ کس طرح خط آیا تھا اور بابا نے اماں سے کیا کہا تھا، اور وہ منھ چلاتے ہوئے میری بات سنتے رہے۔ دو ایک بار ان کے منھ سے "تعجب! تعجب!" نکلا۔ انھوں نے مجھے بٹھا کر ایک نان پر تھوڑا سا خورشت ڈال کر کھانے کو دیا جسے میں نے جلدی جلدی نگلا اور پھر ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ چچا نے اپنی عبا اتاری، تہ کر کے بغل میں دابی، شب کلاہ اپنی جیب میں ٹھونسی اور ہم دونوں حجرے سے باہر نکل آئے۔ میں جانتا تھا انھوں نے ایسا کیوں کیا۔ پارسال اسی گلی میں سب لوگوں کے سامنے ایک پولیس والے نے چچا کا گریبان پکڑ کر روک لیا تھا کہ سر پر چھجے والی ٹوپی کیوں نہیں پہنی۔ جب تک عبا پھٹ نہیں گئی اس نے ہاتھ سے نہ چھوڑی۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا اس روز چچا کا منھ چونے کی طرح سفید ہو گیا تھا اور وہ عزت آبرو کی باتیں کر رہے تھے اور خدا اور پیغمبر کو بیچ میں لا رہے تھے۔ مگر پولیس والے نے عبا کی آستینوں میں ہاتھ ڈال کر اسے بدن سے پھاڑ ڈالا اور چلا گیا۔ اس دن بھی، آج کی طرح، مجھے کچھ خبر نہ تھی کہ بابا نے مجھے چچا کو بلانے کیوں دوڑایا ہے، اور گھر جاتے ہوئے یہ واقعہ پیش آ گیا تھا۔

راستے میں چچا نے مجھ سے پوچھا کہ بابا نے اپنے سفر کے اجازت نامے کی تجدید کر لی ہے یا نہیں۔ مجھے معلوم نہیں تھا۔ جب بھی بابا کو قم یا قزوین جانا ہوتا تو یہی مصیبت پڑتی تھی۔ وہ اجازت نامہ مجھے تھماتے، میں اسے چچا کے پاس لاتا اور وہ تھانے لے جا کر اسے ٹھیک کر لیتے۔ پھر چچا نے پوچھا کہ آج تھانے دار تو ہمارے گھر نہیں آیا تھا۔ میں نے کہا نہیں۔ تھانے دار کو میں پہچانتا تھا۔ ایک دو بار صبح سویرے میں اسکول جانے کے لیے گھر سے نکل رہا تھا اور وہ آ رہا تھا، بابا کے مریدوں کی طرح۔ وہ جب بھی آتا دروازے پر ٹھٹکے بغیر اندر چلا جاتا، زور سے سلام کرتا اور سیدھا بابا

Scanned with CamScanner

کے کمرے میں۔

گھر پہنچ کر چچا تو بابا کے پاس چلے گئے اور میں نے مزید انتظار نہ کیا اور فوراً دسترخوان پر پہنچا جس کا ایک کونا اماں نے میرے لیے ابھی تک بچا رکھا تھا۔ جتنے بینگن قاب میں باقی تھے ان سے ظاہر تھا کہ اماں نے کچھ نہیں کھایا ہے۔ جب کبھی بابا سے تکرار ہوتی، ایسا ہی ہوتا تھا۔ کھانا میں نے جلدی جلدی کھایا اور چل دیا۔ بابا کے کمرے کے پیچھے سے گزرتے ہوئے مجھے ان کے چیخنے چلانے کی آوازیں آئیں اور وہی 'زندیق' اور 'ملحد' کے الفاظ سنائی دیے۔ ضرور وہ اُسی شخص کو گالیاں دے رہے تھے جس نے یہ خط بھیجا تھا۔ میرا بہت جی کر رہا تھا کہ چھت پر جا کر اصغر آقا کے کبوتروں کا تماشا دیکھوں۔ مگر آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور کبوتر ضرور اپنے خانے میں واپس چلے گئے ہوں گے۔ پھر اسکول کو بھی دیر ہو رہی تھی۔ یعنی دیر تو خیر نہیں ہو رہی تھی مگر میں وقت سے کافی پہلے پہنچ جایا کرتا تھا۔ ہاں، وہی نیکر کا قصہ! اب میں نیکر پہن کر تو سکول جا نہیں سکتا تھا! محلے کے حاجی آقا کا بیٹا جو ہوا! لوگ کیا کہیں گے، اور اگر بابا نے دیکھ لیا تو؟ خود مجھے بھی یہ ذرا اچھا نہیں لگتا تھا۔ بالکل اُن اترونے لڑکوں کی طرح جو اسکاؤٹ بن گئے تھے اور گلے میں سیٹی ڈالے اور "نیکر ٹوپی" پہنے پھرتے تھے۔ لیکن میرا یہ فقرہ کسی کو پسند نہ آیا۔ اور ہوا یہ کہ پرنسپل نے مجھے اسکول سے باہر کر دیا کہ 'یا تو نیکر پہن کر آؤ، ورنہ جا کے گھر کے مکتب میں بیٹھو۔' سال کا بالکل شروع تھا، یعنی مہر کے مہینے کے آخری دن جب اماں کے دماغ میں یہ ترکیب آئی۔ انھوں نے میری پتلون کے پائنچوں میں اندر کی طرف کاج بنا دیے اور اندر ہی کی طرف گھٹنوں سے کچھ اوپر بٹن لگا دیے، اور مجھے سکھا دیا کہ اسکول پہنچ کر پائنچوں کو اندر کی طرف موڑ کر بٹن لگا لیا کروں، اور بعد میں وہاں سے نکل کر بٹن کھول کر پائنچے نیچے کر لیا کروں۔ میں یہی کرتا تھا۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ اس سے میری پتلون کافی بھاری ہو گئی تھی اور مجھے دوڑنے میں دقت ہوتی تھی۔ پھر ایک دن جب میں حسن خسیکی سے شرط بد کر اسکول کے تالاب میں تیرنے کو اترا تو پائنچوں میں پانی بھر گیا اور وہ پھول گئے، اور لڑکوں نے میری طرف اشارے کر کر کے خوب مذاق اڑایا۔ خیر کچھ بھی ہو، پرنسپل کی جھک جھک سے تو جان چھوٹی۔ اسی وجہ سے میں کوشش کرتا تھا کہ وقت سے پہلے اسکول پہنچ جاؤں، اور دیر میں باہر نکلوں۔ چھٹی کی گھنٹی بجنے کے بعد میں غسل خانے میں گھس کر سب کے جانے کا انتظار کرتا تاکہ کسی کو پتا نہ چلے کہ میں اپنی نیکر کے ساتھ کیا کرتا ہوں۔ مگر لڑکے بھی بہت کائیاں تھے، شاید جان گئے تھے لیکن اس قصے سے دلچسپی نہ رکھتے تھے۔ انھوں نے شروع ہی سے میرا نام 'آشیخ' رکھ چھوڑا تھا، جسے سن کر پہلے پہل تو مجھے بہت تاؤ آیا، مگر پھر میں نے سوچا کہ یہ کچھ زیادہ بُرا نام نہیں ہے، بلکہ 'لولو' سے تو بہتر ہی ہے جو ہماری کلاس کے مانیٹر کا لقب تھا۔

اسکول کے دروازے پر پہنچا تو پسینے پسینے ہو رہا تھا۔ تمام رستے دوڑتا آیا تھا۔ اسکول میں کافی بھیڑ ہو گئی تھی۔ پرنسپل برآمدے میں کھڑا تھا اور چپڑاسی کو بار بار اپنی پتلون کے پائنچوں پر مار

رہا تھا۔ موقع نہ تھا کہ برآمدے میں کھڑے ہو کر پتلون کے پائنچے اوپر چڑھا لوں، اس لیے گلی ہی میں کھڑے کھڑے یہ کام شروع کیا۔ یکایک کسی کی آواز آئی:

خدا کی لعنت ہو! دیکھو بھلا لوگوں کے بچوں کو کس مصیبت میں ڈال دیا ہے!

میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ایک موٹی عورت سر پر سیاہ ٹوپی اور اس کے نیچے بڑا سا رومال باندھے کھڑی تھی اور رومال کے کونے اس نے اپنی بھی ڈھیلی ڈھالی عبا کے گریبان میں اڑس رکھے تھے۔ میں نے سوچا: بھلا اسے لوگوں سے کیا مطلب؟ اور دوڑ کر اسکول میں داخل ہو گیا۔

عصر کے وقت جب اسکول سے واپس آیا تو بڑی بہن اپنے شیر خوار بچے کو لیے ہمارے گھر آئی بیٹھی تھی۔ اس کا گھر پاس ہی پیچھے کی ایک گلی میں تھا اس لیے وہ روز آ جا سکتی تھی۔ وہ پہلے دروازے سے سر نکال کر تاکتی اور اگر کوئی پولیس والا آس پاس نہ ہوتا تو دوڑ کر ہمارے گھر پہنچتی۔ اس وقت اس نے سر پر لال رومال باندھ رکھا تھا۔ ضرور حمام کر کے آئی ہوئی۔ اس کے بچے نے چیخ چیخ کر سارا گھر سر پر اٹھا رکھا تھا۔ مسجد کا موذن مشہدی حسین چائے اور قلیان لیے ادھر ادھر آ جا رہا تھا۔ ضرور بابا کے پاس مہمان آئے ہوئے ہوں گے۔ اماں میرے لیے چائے انڈیلتے ہوئے بڑی بہن سے کہہ رہی تھیں:

"پتا ہے بیٹی، بچے کو نظر لگ گئی ہے۔ حیف کہ انھوں نے مروارید کی توپ ہٹا دی۔ ورنہ بچے کو لے کر دو بار اس کے نیچے سے نکلتیں تو بس جیسے آگ پہ پانی ڈال دیا ہو۔

مجھے یاد آیا کہ جب میں پہلی جماعت میں تھا تو کس قدر اس توپ پر چڑھا کرتا تھا اور اس کے دونوں طرف بنے ہوئے شیروں پر سواری کرتا تھا۔ ہم بچے اس کے پہیوں کے درمیان آنکھ مچولی کھیلتے تھے اور میدان ارگ کے کاج کے درختوں سے گھرے ہوئے تالاب کی سطح پر کنکر پھینکا کرتے تھے۔ کنکر تالاب کے پانی پر سات سات آٹھ آٹھ بار اچھلتا تھا۔ کبھی کبھی تو دس بار بھی۔ کتنا مزہ آتا تھا! میں تنوری روٹی کے ٹکڑے کے ساتھ چائے پینے لگا۔

اچھا بیٹی، اب ایک اور کام کرو۔ بچے کو تم لے جاؤ اور بندوق کے نیچے سے گزار دو۔

ماں، کیسی باتیں کرتی ہو؟ ایسے دنوں میں بھلا گھر سے کیسے نکلوں گی؟ خدا رحم کرے!"

چپ تو اپنے میاں سے کہو وہ بچے کو لے جائے۔ تین دفعہ بندوق کے نیچے سے گزار کر بندوق کے مالک کو ایک دانہ کسی ترکاری کا دینا ہوگا۔

پھر ان میں یہ بحث چھڑ گئی کہ بندوق کا مالک کون ہے، سرکار ہے یا تھانے کے سپاہی، اور اتنے میں میں نے روٹی کے ساتھ چائے کا ایک اور پیالہ پیا اور سیدھا پہنچا اپنی کتابوں کی البم کے پاس۔ ابھی سامنے مسجد والے مینار کے ٹکڑے تک پہنچا بھی نہ تھا کہ اماں کی آواز آئی۔

بیٹے، قربان جاؤں، ذرا دو گٹھے لکڑی تو لے آ حمام کے واسطے۔ جا میرے بچے!

میں منہ بنا کر البم کے ورق پلٹتا رہا اور اماں کی بات سنی ان سنی کر دی۔ اس بار بہن کی پکار

Scanned with CamScanner

سنائی دی کہ:

"شرم نہیں آتی تجھے؟ اتنا موٹا ہو رہا ہے اور چاہتا ہے اماں خود لکڑی لے کر آئیں؟ اور خود اپنا منہ تو دیکھ، گندگی تھپی ہوئی ہے۔ کیا ہو گیا تجھے؟ پہلے اتنا اچھا بچہ تھا۔"

گھر کے اس حمام نے الگ ایک مصیبت کر رکھی تھی۔ جب گلیوں میں عورتوں کے سروں سے چادر زبردستی کھینچنے کا سلسلہ شروع ہوا تو ابا نے یہ حمام بنوایا تھا اور اب یہ ہفتے میں سات دن چالو رہتا تھا اور پورے گھر میں دھواں ایسا بھر جاتا تھا کہ نہ پوچھو۔ بری بات یہ تھی کہ خاندان کی ساری عورتیں حمام کرنے یہیں آنے لگی تھیں اور اس سے بھی بری بات یہ کہ حمام کے لیے لکڑیاں لانا میرے ذمے تھا۔ مجھے جا کر صحن کے آخر میں بنے ہوئے تہ خانے سے کم سے کم دس گٹھے اٹھا کر حمام کی بھٹی تک لانے پڑتے تھے جو باورچی خانے میں لگی ہوئی تھی۔ زیادہ دو دن میں ایک بار تو ہوتا ہی تھا۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ جب سے حمام بنا تھا مجھے بابا کے ساتھ باہر حمام جانے کے عذاب سے نجات مل گئی تھی، جب وہ ہر بار میرا سر حجام کے استرے کے نیچے دھروا دیتے تھے کہ ان کے اپنے سر جیسا ہو جائے اور مجھے لگتا تھا جیسے میرے سر کی کھال کھرچ کر اتاری جا رہی ہو۔ لیکن اس کے بدلے یہ مصیبت گلے پڑ گئی۔ ہر بار لکڑیاں اٹھا کر لاتے ہوئے میرا ہاتھ ایک دو جگہ سے چھل جاتا تھا۔ زیادہ تر کی لکڑیاں ٹیڑھی میڑھی اور پھانسوں سے بھری ہوئی تھیں۔ مجھے ہر بار تہ خانے میں لکڑیوں کے انبار کے اوپر چڑھ کر لکڑیاں نکالنی پڑتی تھی ورنہ بابا چلانے لگتے تھے کہ نیچے سے کھینچ کر کیوں نکالیں۔

میں لکڑیاں نکالنے کے لیے تہ خانے میں گیا تو مرغیاں شور مچاتی ہوئی ادھر ادھر بھاگنے لگیں۔ سخت اندھیرا ہوا تھا اور وہ یہ سمجھ کر کہ رات ہو گئی ہے روز کے مقابلے میں جلدی اندر چلی آئی تھیں۔ میں لکڑیوں کا دوسرا دستہ اٹھا رہا تھا کہ ایک چوہا میرے پیروں کے پاس سے نکل کر لکڑیوں کے ڈھیر میں گھس گیا۔ اس قدر چھوٹا سا تھا کہ نہ پوچھو۔ ضرور بچہ ہو گا۔ میں جھٹ شمع لایا اور کچھ دیر تک اسے پکڑنے کی کوشش کرتا رہا مگر وہ ہاتھ نہ آیا۔ آخر میں نے اس کا پیچھا چھوڑا اور لکڑیاں اٹھانے لگا۔ چوتھا دستہ اٹھا رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ مشہدی حسین ابھی یہیں ہو گا اور دروازہ کھول دے گا۔ میں نے یہ سوچ کر ادھر کوئی توجہ نہ دی اور لکڑیاں اٹھا کر باورچی خانے میں لے گیا۔ بڑی بہن سبزیاں پانی میں ابال رہی تھی اور اماں چولھوں میں تیل ڈال رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر بولیں:

"بیٹے آواز نہیں آ رہی؟ جا دوڑ کر دروازہ کھولو۔ مشہدی حسین تو مسجد چلا گیا۔"

میں سمجھ گیا کہ بابا اس وقت بھی مسجد نہیں جائیں گے۔ جب میں دروازے کے پاس پہنچا تو اندھیرا ہو رہا تھا۔ باہر ایک فوجی منصب دار کھڑا تھا اور اس کے پیچھے ایک بے پردہ عورت۔ یعنی صرف اس کے سر پر رومال بندھا ہوا تھا۔ بڑی بہن کی ہم عمر ہو گی۔ رومال چھوٹا سا اور پھول دار تھا۔ آج تک کوئی عورت اس طرح کے لباس میں ہمارے گھر میں داخل نہیں ہوئی تھی۔ اس نے ہاتھ

Scanned with CamScanner

میں پرس لٹکا رکھا تھا اور پنجوں کے بل چل رہی تھی۔ میں سلام کر کے کنارے پر ہو گیا اور دونوں اندر آ گئے۔ منصب دار کے کندھوں پر دو تین بٹن لگے ہوئے تھے۔ میں سے نہیں پہچانتا تھا۔ اور نہ یہ سمجھ سکتا تھا کہ وہ کس کام سے آیا ہو گا۔ رات کے وقت، اور اس بے پردہ عورت کو ساتھ لیے؟ آج صبح سے لے کر اب تک ہمارے گھر میں عجیب و غریب باتیں پیش آ رہی تھیں۔ پتا نہیں کیوں یکدم مجھ پر خوف سا طاری ہو گیا۔ مگر دالان میں اندھیرا تھا اور انھوں نے مجھے خوف زدہ ہوتے نہیں دیکھا۔ کہیں بابا کے سفر کے اجازت نامے کے سلسلے میں کوئی مشکل نہ پیدا ہو گئی ہو۔ کہیں یہی وجہ تو نہیں کہ وہ آج نہ ظہر کی نماز پڑھانے گئے اور نہ مغرب کی؟ میں دروازے کو اسی طرح کھلا چھوڑ کر اماں کو خبر کرنے دوڑا۔ انھوں نے چادر سر پر ڈالی اور دالان میں آ کر سلام علیک اور احوال پرسی کرنے لگیں۔ منصب دار ان سے یوں باتیں کر رہا تھا کہ میں سمجھ گیا کہ کوئی خطرہ نہیں ہے اور مجھے سکون ہو گیا۔ اس کے بعد وہ بولا:

تو میری لڑکی آپ کے سپرد ہے۔ میں حاجی آقا کی خدمت میں جاتا ہوں۔'

اماں لڑکی کو ساتھ لے کر اندر چلی گئیں اور میں منصب دار کے آگے آگے چلتا ہوا اسے بابا کے کمرے کی طرف لے گیا۔ بعد میں میں نے چائے لے جا کر دی۔ حالاں کہ بابا نے کہا بھی نہیں تھا۔ مگر معلوم تھا کہ شناسا مہمان کو چائے پیش کی جاتی ہے۔ چائے لے کر کمرے میں آیا تو دیکھا چچا بھی موجود ہیں اور تھالے دار بھی بیٹھا ہے اور ایک آدمی اور ہے۔ بازار کا لگتا تھا۔ سب لوگ کرسی کے گرد بیٹھے تھے۔ بس چچا بابا کے برابر میں بیٹھے تھے اور باقی سب کرسی کے ایک پائے کے ساتھ۔ میں چائے رکھ رہا تھا کہ منصب دار بڑی پر تکلف زبان میں بولا:

'آپ درست کہتے ہیں حاجی آقا۔ وہ آپ کی متعلقہ ہے، آپ جیسا چاہیں انتظام کریں۔'

میں باہر نکل آیا۔ یہ متعلقہ کا کیا مطلب ہوا؟ ایک دن میں کتنے نئے لفظ سیکھے! اماں تو پڑھی لکھی نہ تھیں۔ بابا کا مزاج اگر ٹھیک ہوتا اور وہ اکیلے ہوتے تو ان سے جا کر پوچھ لیتا۔ ایسے سوالوں سے وہ ہمیشہ خوش ہوتے تھے۔ یا اُس وقت جب وہ خوش خطی کی مشق کے واسطے میرے لیے سرکنڈوں کا قلم تراشتے۔ میں بھی خوب سمجھ گیا تھا، جب کبھی ان سے کچھ کام نکالنا ہوتا یا پیسے مانگنے ہوتے تو ایسا کوئی سوال لے کر ان کے پاس چلا جاتا، یا کوئی ٹوٹی نوک والا قلم لے جاتا۔ پھر مجھے خیال آیا چل کر دیکھنا چاہیے کہ یہ عورت ہے کون۔

اماں خود کرسی کے آخر میں دروازے کے پاس بیٹھی تھیں اور اُسے صدر میں، اپنی جگہ پر، بٹھا دیا تھا۔ دروازے کے پاس جوتے اتارنے کی جگہ پر اُس کے اونچے جوتوں کی جوڑی رکھی ایسی لگ رہی تھی جیسے نماز کی صف میں بیٹھے ہوئے لوگوں کے درمیان کوئی شخص کھڑا ہوا ہو۔ کمرے میں ایک خاص قسم کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی جسے میں پہلے تو نہ پہچان سکا۔ پھر اچانک مجھے یاد آیا۔ یہ ویسی ہی خوشبو تھی جیسی ہمارے ورزش کے استاد کے پاس سے آیا کرتی تھی۔ خاص کر صبح

Scanned with CamScanner

سویرے۔ ہاں، یہ عطر تھا۔ کسی قسم کا عطر۔ اُس کے ہونٹ سرخ تھے۔ وہ کرسی کے کنارے ہو کر بیٹھی تھی اور لحاف کے کونے سے اپنی ٹانگیں ڈھانپ لی تھیں۔ جب میں دروازے سے اندر داخل ہوا تو وہ کہہ رہی تھی:

"خانم، آج بچے کو اجابت ہوئی؟"

میری بہن بولی: "نہیں خانم جان، تبھی تو اس کے پیٹ میں درد ہے۔ سوچا سبزیوں کا پانی دوں تو شاید افاقہ ہو۔ مگر اس سے بھی کچھ نہ ہوا۔"

اماں نے پوچھا: "آپ کے کتنے بچے ہیں؟"

اُس نے سر جھکا کر کہا: "ابھی تو میں پڑھ رہی ہوں۔"

"کیا پڑھ رہی ہو؟"

"دایہ گری کا کورس کر رہی ہوں۔"

وہ سر ہلا کر ہنسی۔ اماں نے بہن سے مخاطب ہو کر کہا:

"بیٹی، پھر کیا انتظار ہے؟ اٹھو، بچے کو لے آؤ، خانم دیکھ لیں گی۔ میں اتنی دیر میں ان کے واسطے چائے بنا لاؤں۔"

وہ اٹھیں اور کمرے سے باہر چلی گئیں۔ میں نے اپنے طاقچے پر سے ٹکٹوں کی البم نکالی اور بظاہر بے خبر ہو کر اس کے ورق پلٹنے لگا، مگر دیکھتا رہا کہ بہن نے بچے کو کرسی کے پاس لا کر اس کا قندیل کھولا اور عورت نے اس کے پیٹ پر دو ایک جگہ اپنا ہاتھ ملا جو بابا کی مچھلیوں کے پیٹ کی طرح سفید تھا۔ ابھی اس کے منہ سے کچھ نہ نکلا تھا کہ بابا کے کمرے سے اُن کی اونچی پکار سنائی دی۔ مجھے بلا رہے تھے۔ میں نے البم طاقچے پر رکھی اور ان کے کمرے کی طرف دوڑا۔ اماں ان کے دروازے کے پیچھے سے باہر نکل کر آ رہی تھیں۔ میں نے کہا:

"آپ تو کہہ رہی تھیں کہ مہمان کے لیے چائے بنانے جا رہی ہوں؟"

"فضول باتیں مت کر، ذلیل کہیں کا!"

میں بابا کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ اُنھیں چائے چاہیے تھی اور قلیان تازہ کرانا چاہتے تھے۔ چائے کی پیالیاں جمع کرتے اور قلیان اٹھاتے ہوئے میں نے سنا کہ وہ عمرو عاص کی رومی لشکر سے جنگ کا قصہ سنا رہے ہیں۔ میں جانتا تھا۔ اگر ان کے پاس کوئی سرکاری افسر بیٹھا ہوتا تو اپنے ہندوستان کے سفر کی داستان سناتے تھے اور اگر بازار کا کوئی شخص ہوتا تو کربلا اور مکہ کے سفر کی۔ اس وقت ان کے کمرے میں دو وردی والے بیٹھے تھے۔ میں باہر نکلا، چائے لے کر گیا، اور پھر باورچی خانے سے قلیان لے کر آیا جسے اماں نے تازہ کر دیا تھا۔ اُس وقت بابا یہاں تک پہنچے تھے جب عمرو عاص یکہ و تنہا رومیوں کی قید میں آ جاتا ہے اور قیصرِ روم کے سامنے کلام کرتا ہے۔ مجھ میں اسے سننے کی تاب نہ تھی۔ نہ اندر کے کمرے میں جا کر بہن کے بچے کے پوتڑوں کا تماشا دیکھنے

کا حوصلہ تھا۔ پھر اُس عورت کی خوشبو بھی، جو ہمارے ورزش کے استاد کی بیوی تھی، میرا دم اُلٹے دیتی تھی۔ سو میں باہر گلی میں نکل آیا۔ مگر وہاں بچوں کا نام و نشان نہ تھا۔ لگتا تھا میرا انتظار کیے بغیر چل دیے۔ ہم سب مغرب کے وقت گلی کے نکڑ پر جمع ہو کر کچھ نہ کچھ کیا کرتے تھے۔ یا تو سڑک پر جو کرمان کی ہندی کلاسوں سے پولیس والوں کے ہتھوں کھینچ کر اتارے جاتے ان کے نعلین اتارتے، یا گلی میں گھر کے پاس چار دیواری کے پیروں پر مینڈکوں کی طرح اچھل کود کرتے۔ یا ایک دوسرے سے تصویروں کا تبادلہ کرتے یا ایسا ہی کچھ اور۔ اس وقت میرا بہت ہی جی چاہ رہا تھا کہ انہیں اپنا شاہکار دکھاؤں جو میں نے آج ہی اسکول میں ایک سے تراشتے ہوئے قلم کے بدلے میں حاصل کیا تھا۔ جس پر اس کی کمر میں بندھا ہوا تھا اور ہاتھ میں رسی کا سرا تھام رکھا تھا، اور مسخرہ بنا ہوا کر شیر کے دہاڑنے کی نقل اتار رہا تھا۔ مگر گلی میں کوئی بھی نہیں تھا۔ کیا کروں کیا نہ کروں؟ میں وہیں دروازے کے پاس بیٹھ گیا اور گزرتے ہوئے لوگوں کو دیکھنے لگا۔ یہ سب سے اچھا تماشا تھا۔ گلی کے آخر سے خدا خدا کی آواز آ رہی تھی۔ یہ ایک بوڑھا بھکاری تھا جو ہر شام بہت آہستہ آہستہ قدم رکھتا ہوا گلی سے گزرتا تھا اور اس کی لاٹھی زمین پر سرکتی چلتی تھی۔ وہ آسمان کی طرف سر اٹھائے، مدد مانگنے یا سوال کرنے کے بجائے بس ایک فقرہ "یا موجود!" دہرایا کرتا تھا اور وہ بھی بہت دھیمی آواز میں، اور خوب لمبا کھینچ کر۔ چقندر کی مٹھائی والا بھی آیا اور چلا گیا۔ مجھے اس سے جو پیسے میں کچھ بھی دلچسپی نہیں دے رہا تھا مگر وہ آوازیں مسلسل لگاتا جا رہا تھا۔ نماز کی چادر پہنے ایک عورت نے اپنے گھر کے دروازے سے باہر گلی میں جھانکا۔ گلی کو خالی پا کر لپکتی ہوئی تین مکان اُدھر ایک اور دروازے پر پہنچی اور اسے زور سے بجایا مگر دروازہ بند تھا۔ وہ دروازے کو بجاتے ہوئے سر گھما کر اِدھر اُدھر دیکھتی جا رہی تھی۔ آخر دروازہ کھل گیا اور وہ اندر گھس گئی اور مجھے کسی کی آواز سنائی دی:

"ارے شمسی! میں نے تجھے پکڑ لیا!"

یہ بڑا مضحک تھا۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ وہ ہاتھ میں کوئی پیرا ہے مکھیوں کا پیچھا کر رہا تھا۔ اور کہہ رہا تھا:

"اِدھر آ پدر سوختہ! خوب پکڑا تجھے!"

گلی میں اندھیرا تھا اور چراغ کی روشنی نہیں تھی اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیسے اندھیرے میں اور اس قدر سردی میں سے مکھیاں سوجھ جاتی ہیں۔ شاید اس کا وہم ہو گا۔ وہ ہم سے دو مکان چھوڑ کر رہتا تھا۔ مدتوں پہلے اس کا دماغ چل گیا تھا۔ صبح سے شام تک دروازے پر بیٹھا مکھیاں پکڑا کرتا تھا اور کہتے تھے کہ کھا بھی جاتا تھا۔ مگر میں نے خود نہیں دیکھا تھا۔ میرا خیال ہے وہ فقط اداکاری کرتا تھا اور باتیں بناتا تھا کہ "اِدھر آ میں تیرا فسنجان بناؤں!" یا "کل میں نے چڑیا جتنی بڑی مکھی پکڑی تھی!" یا "مجھے کیا پتہ اس کی ٹانگیں نہیں تھیں مزے دار تھیں!" شروع شروع میں وہ چچا عباسی کا ساتھی تھا، اور ہم شام کے وقت کھیلتے ہوئے اسے چھیڑا کرتے تھے۔ مگر اب اس بار

Scanned with CamScanner

بنسی نہیں آتی تھی۔ اس کی بیوی ہمارے گھر میں کپڑے دھونے کا کام کرتی تھی۔ دس دن میں ایک بار۔ کہتی تھی اُسے بہت مارتا ہے اور گھر سے نکال دیتا ہے۔ مگر وہ خدا کا خوف کر کے واپس آ جاتی اور اس کے لیے کھانا پکاتی۔ میں اس سے دو باتیں کرنے کے خیال سے اس کے پاس چلا گیا۔ میں نے پوچھا:

"ابو الفضل، کیسا مزہ تھا اس کا؟"

بولا: "بالکل مکئی جیسا۔ تمھیں کیا پتا! چڑیا جتنی بڑی تھی!"

میں نے کہا: "کہیں تمھارا وہم تو نہیں ہے؟ جاڑوں میں مکھیاں کہاں سے آ گئیں؟"

بولا: "واہ! تمھیں کیا پتا؟ میں وظیفہ پڑھوں گا تو خود بخود آ جائیں گی۔ صبر کرو!"

اس نے اپنے پھٹے ہوئے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ماچس کی ڈبیا تلاش کرنے لگا جس میں وہ مکھیوں کو پکڑ کر بند کرتا تھا۔ مگر مجھے اکتاہٹ ہونے لگی۔ پھر میرے پاس اس سے کہنے کو کوئی اور بات بھی نہیں تھی۔ میں گھر واپس آنے کو تھا کہ کھڑا ہوا۔ اُسی وقت گھر کے دروازے پر کھٹکا ہوا اور منصب دار اور اس کی لڑکی باہر نکلے۔ اگر انھوں نے مجھے پاگل ابو الفضل کے ساتھ دیکھ لیا تو بہت بُرا ہوگا۔ میں فوراً چھلانگ لگا کر ابو الفضل کے پیچھے جا چھپا۔ پھر مجھے خیال آیا: چھپنے کی کیا ضرورت ہے؟ وہ کیا جانیں ابو الفضل کو؟ مگر اب دیر ہو چکی تھی اور اگر وہ مجھے اُس کے پیچھے سے نکلتے ہوئے دیکھتے تو اور بھی بُرا ہوتا۔ وہ ابو الفضل کے پاس سے گزرے تو مجھے لڑکی کی آواز سنائی دی:

"آخر صیغہ ہوتا کیا ہے آقا جان؟"

منصب دار بولا: "صرف دو گھنٹے کے لیے بیٹی، بس جشن میں شامل ہونے کے لیے۔۔۔"

"آہا، پکڑ لیا! کتنی موٹی مکھی ہے!"

ابو الفضل کے چیخ پڑنے کی وجہ سے میں منصب دار کی بات پوری نہ سن سکا۔ یہ دونوں کیا بات کر رہے تھے؟ کیا بابا اس لڑکی سے صیغہ کرنے والے ہیں؟ مگر کس لیے؟۔۔۔ اچھا، اچھا، سمجھ گیا!

میری نظر ابو الفضل کی ماچس کی ڈبیا پر پڑی۔ وہ خالی تھی۔ ابو الفضل کے پاس اور بیٹھے کو میرا جی نہیں چاہ رہا تھا۔ گھر واپس آ گیا۔

دروازہ کھلا تھا اور اندھیرے دالان میں چچی کے بات کرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ کہہ رہے تھے:

"بڑے تعجب کی بات ہے! اتنے بڑے فوجی افسر کی لڑکی۔۔۔"

میرے قدموں کی چاپ نے ان کی بات کاٹ دی۔ پاس پہنچا تو مجھے تھانے دار بھی دکھائی دیا۔ میں نے بے خیالی میں سلام کیا اور سیدھا اندر کمرے میں چلا گیا۔ بڑی بہن جا چکی تھی۔ اماں باورچی خانے میں کام میں لگی ہوئی تھیں۔ حمام کی ٹٹی میں سے صابن اور دھواں نکل رہا تھا۔ میں

بہت تھک گیا تھا۔ رات کے کھانے کا انتظار کرنا مشکل تھا۔ میں کپڑے اتار کر کرسی کے نیچے پہنچ گیا۔ دھواں میری ناک میں جا رہا تھا۔ میں ابوالفضل اور اس کی خالی ڈبیا کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ چچا کی آواز آئی:

"آبا صادق، کیسی بال بال بچی ہو! ورنہ بڑے میاں گئے تھے تمہارے ہاتھ سے!"

وہ اور چچی دونوں ماں کو بھاوج کہتے تھے۔ پھر ماں کی آواز سنائی دی:

"اس لڑکی کی بات کر رہے ہو؟ خدا نہ کرے! اس کی تو جوتی کی نوک زمین پر تھی اور ایڑی آسمان پر!"

چچا بولے: "اچھا بھاوج، حوض کے تختے کب لگواؤ گی؟ جاڑا تو آ گیا۔"

اگلے روز صبح جب میں وضو کرنے حوض پر پہنچا تو دیکھا بابا کے کمرے میں تالا پڑا ہے۔ مچھلیاں بھی حوض کی تہہ میں سو رہی نہیں۔ مگر ان کے کچھ رنگ برنگے چھلکے قدمچوں پر ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ حوض کا پتھر پر ایک جگہ سے خون سا لگا ہوا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ بابا سفر پر روانہ ہو گئے۔ وہ جب بھی کربلا یا قزوین جاتے تو کمرے کو تالا لگا جاتے تھے۔ اور جس رات وہ گھر پر نہ ہوتے تو بلیاں آ کر مچھلیوں سے سیر ہو لیا کرتی تھیں۔ کمرے میں واپس آ کر میں نے ماں سے پوچھا:

"حاجی آقا کہاں گئے؟"

"پتا نہیں بیٹے! صبح سویرے ہی نکل گئے۔ تمہارے چچا بتا رہے تھے قم گئے ہیں۔"

باہر پہنچے تو احمد نے مجھے اور چھوٹی بہن کو بتایا کہ کل رات اصغر آقا کے کبوتر کوئی اڑا لے گیا۔ ارے میرے خدا! میں دوڑتا ہوا چھت پر پہنچا۔ بابا گھر پر نہیں تھے اور اصغر آقا کے پاس جانے میں اب کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ میں کبوتروں کا سوچ سوچ کر اس قدر پریشان ہو رہا تھا کہ نہ پوچھو! آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور سخت سردی تھی۔ کبوتروں کے خانے سب کے سب خالی پڑے تھے۔ اصغر آقا کی چھت پر کوئی آواز نہ تھی اور بس کبوتروں کی سفید بیٹیں جا بجا بکھری ہوئی تھیں۔

○○

(فارسی عنوان: "جشنِ فرخندہ")

غلام حسین ساعدی

فارسی سے ترجمہ: نیر مسعود

روضے والی

۱

مہینے کے اندر اندر میں نے قُم کے تین پھیرے کیے۔ آخری پھیرے میں جیسے میرا دل بول رہا تھا کہ کام بگڑ جائے گا، پھر بھی میں آدھی رات کو ایک کھڑکھڑیا لاری میں چل کر صبح ہوتے سید اسداللہ کے گھر جا پہنچی۔ دروازہ کھٹکھٹایا تو عزیزہ خانم باہر نکلیں۔ مجھے دیکھ کر تو اچک پڑیں۔ بُرا سا منھ بنایا، دروازے پر سے ہٹ لیں اور دیدے نکال کر مجھے گھورنے لگیں۔ پھر بولیں:

'بڑی خانم، آپ گئیں نہیں؟'

میں نے کہا سنا کچھ نہیں، بس سلام علیک کر کے اندر آ گئی۔ ڈیوڑھی سے نکل کر صحن میں پہنچی۔ بچے ابھی ابھی سو کے اٹھے تھے اور حوض پر منھ ہاتھ دھو رہے تھے۔ سب کے سب اٹھ کھڑے ہوئے اور مجھے دیکھنے لگے۔ میں دیوار سے لگ کر بیٹھ گئی۔ بقچہ پہلو میں رکھ لیا اور وہیں بیٹھی رہی۔ عزیزہ خانم نے پھر پوچھا:

'سچ سچ بتائیے، بڑی خانم، آپ گئی نہیں تھیں؟'

گئے تو تھے، بٹیا،' میں نے کہا، "پھر لوٹ آئے۔"

لوٹ ہی آنا تھا تو پھر گئی کیوں تھیں؟' عزیزہ خانم بولیں، 'یہیں رہتیں، ہم بھی خاطر جمع رہتے۔"

میں ہنس پڑی اور بولی:

'اسی لیے تو ہم چلے آئے کہ تم خاطر جمع ہو جاؤ۔ لیکن بٹیا، اس بار ہم زیارت کو نہیں آئے

نہیں، کچھ اور ہی کام ہے۔"

بچوں نے آ کر مجھے گھیر لیا۔ عزیزہ خانم کی تیوریاں چڑھتی جا رہی تھیں۔ مجھ سے ذرا ہٹ کر کیاری کے پاس بیٹھ گئیں۔ پوچھا:

"اور کون سا کام؟"

"سنے ہیں اپنے واسطے بالشت بھر جگہ مول لیجیے،" میں نے کہا، "تمھیں پتا ہے؟ ہم نے خواب میں دیکھا ہے۔ تین رات پہلے دیکھا ہے کہ بس جا رہے ہیں۔۔۔"

"برے کلمے منھ سے نہ نکالیے،" عزیزہ خانم بات کاٹ کر بولیں۔ میں نے کہا:

"ہم تو ٹھہرے لٹ ہی چکے۔ ضرور تھا کہ۔۔۔"

عزیزہ خانم آگے کو سرک آئیں، اور بولیں:

"مگر پیسے تو آپ پاس تھے نہیں؟"

"تھے کیوں نہیں،" میں نے کہا اور تکیے کی طرف اشارہ کیا۔

وہ تلملا کر کھڑی ہو گئیں اور کہنے لگیں:

"تو جب پیسے آپ پاس ہیں تو یہ سید بے چارے سے کیوں ہر سٹے رقم اینٹھا کرتی ہیں؟ جب نہ تب انھیں کا گلا کاٹتی ہیں۔ سید کو دوڑتے دوڑتے صبح سے شام ہو جاتی ہے، پھر بچوں کا پیٹ نہیں بھر پاتے۔ اوپر سے آپ ہیں کہ جان کو لگی ہوئی ہیں۔ جب دیکھو چلی جا رہی ہیں اور چلی آ رہی ہیں۔"

پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگیں کہ میں کچھ بولوں، لیکن میں بھی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے انھیں دیکھتی رہی، بولی کچھ نہیں۔

عزیزہ بڑبڑاتی ہوئی کوٹھے پر چلی گئیں۔ پیچھے پیچھے بچے بھی۔ میں وہیں دیوار سے لگی بیٹھی رہی، پھر آنکھیں موند کر سو گئی۔ خواب میں دیکھا کہ سید دکان سے واپس آ گیا ہے، اور بیوی کے ساتھ بیٹھا کھڑا ہے۔ دونوں میری ہی باتیں کر رہے ہیں۔ سید پیڑ سے ایک رسی باندھ رہا ہے اور بیوی تیز تیز بول رہی ہیں۔ میں سوتے سے چونک پڑی تو دیکھتی ہوں سچ میں سید آ گیا ہے اور ڈیوڑھی میں بیوی کے ساتھ زور زور سے باتیں کر رہا ہے۔ کہہ رہا تھا:

"آخر کروں تو کیا کروں؟ جو بھی ہو، وہ میری اماں ہیں۔ تمھیں کچھ بتاؤ۔"

"میں کیا جانوں،" عزیزہ خانم بولیں، "اب کے تو آئی ہیں قبر مول لینے۔ قبرستان جا کر پیسے بھی جمع کر آئی ہیں۔ کتنی بھر رقم رولتی ہیں۔ آخر یہ اوروں پاس کیوں نہیں جاتیں؟ سلامتی بیٹیاں بیٹے ہیں، ایک تمھیں بھلے گردن والے ہو کہ ہر بار آ کر تمھارے ہی گلے پڑتی ہیں۔ سید محمد ہے، سید مرتضیٰ، جواد آقا، سید علی، ایک سے ایک۔ پھر وہ معصومہ، خورشید، اختر آغا، یہ ان کے بیٹے بیٹی نہیں ہیں کیا؟ دادی کی سب پیسے والے۔۔۔"

سید کچھ دیر چپ چاپ سنتا رہا، پھر بولا:

"ٹھیک ہے بھئی، جو جی میں آئے کرو۔ میرا تو ناک میں دم آ گیا ہے۔"

دونوں ڈیوڑھی سے نکل کر سامنے آئے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ سید دھیرے دھیرے چلتا ہوا آیا اور کوٹھے پر چڑھ گیا۔ پھر دبے پاؤں نیچے اترا اور باہر نکل گیا۔ مجھے دروازہ کھلنے بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ اس کے بعد سارے دن میں دیوار سے لگی پڑی سوتی رہی۔ جاگی، تھوڑی سی روکھی نان بقچے سے نکالی، کھائی، پھر سو گئی۔ آنکھ کھلی تو اندھیرا ہو چکا تھا۔ مجھے پتا تھا عزیزہ خانم اور بچے مل جل کر بیٹھے ہوں گے۔ میں کچھ دیر تک نستی رہی، پھر حوض پر گئی، پانی اچھلتی رہی، کوئی باہر نہیں نکلا۔ ہمت کر کے زینوں پر چڑھی، اوپر پہنچی، دیکھا سب لیمپ کے ارد گرد بیٹھے ہیں۔ میں وہیں اندھیرے میں کھڑی انھیں دیکھتی رہی۔ کھانا ہو رہا تھا۔ سب کھا چکے تو میں نے دروازے میں سر ڈالا۔ لیمپ کی روشنی پورے کمرے میں نہیں پہنچ رہی تھی، اس لیے کسی نے مجھے دیکھا نہیں۔ پھر میں نے دھیرے سے پکارا:

"عزیزہ خانم، عزیزہ خانم!"

ماہ رخ، اسد اللہ کی بڑی والی، اچھل پڑی اور اس کے منھ سے چیخ نکل گئی۔ سب گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔ عزیزہ نے لیمپ اٹھایا، پھر بڑھ کر میرے سامنے آ گئیں اور بولیں:

"آپ آخر چاہتی کیا ہیں؟ کہ میرے بچے دہل کے مر جائیں؟"

میں پیچھے ہٹ گئی، پوچھا:

"سید نہیں آئے؟"

"آج رات وہ گھر نہیں آئیں گے،" عزیزہ بولیں۔

"اچھا تو ہم کہاں لیٹیں؟" میں نے پوچھا۔

"میں کیا جانوں،" عزیزہ خانم نے کہا، "جہاں جی میں آئے وہاں آرام کیجیے۔"

میں وہیں چوکھٹ کے پاس پڑ رہی۔ بعد آ گئی۔ صبح نماز کے لیے اٹھی تو سمجھ چکی تھی عزیزہ خانم کچھ دینے دلانے کی نہیں، اس لیے نماز پڑھ کر بقچہ سنبھالا اور روضے کو روانہ ہو گئی۔ وہاں مسجد کے چھتے میں نیچے جا بیٹھی، پھر ہاتھ پھیلا دیا، منھ پر گھونگھٹ لے لیا، اور پھر سو گئی۔ دھوپ پھیل گئی تو اٹھی۔ آس پاس جو پیسے پڑے تھے انھیں سمیٹ کر بقچے کے کونے میں باندھا اور نکل کھڑی ہوئی۔

دوپہر ہوتے مکان پر آئی، بچوں کے لیے ٹکے والی مٹی کی چڑیاں اور حلوا سوہن خریدا تھا، دروازہ کھٹکھٹایا۔ ماہ رخ ڈیوڑھی میں آئی۔ پٹ اتنا سا کھول کر جھانکا، فوراً دروازہ بند کر کے چلی گئی۔ میں نے پھر کھٹکھٹانا شروع کیا۔ دروازے کے پیچھے کسی عورت نے آ کر بتایا کہ سید اسد اللہ پورے تین مہینے سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد سناٹا۔ میں نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہی عورت

پھر آئی اور بولی پتا نہیں وہ لوگ کہاں چلے گئے ہیں۔ مجھے کوئی کام تو تھا نہیں، سو پہر تک دروازے پر بیٹھی رہی کہ شاید سید اسد اللہ آجائے۔ جب دیکھا کسی طرح نہیں آتا، کھنچا ہوا ہے تو اٹھ کھڑی ہوئی۔ اچانک خیال آیا کہ جا کر سید کی دکان ڈھونڈھوں۔ مگر جہاں بھی گئی، سید اسد اللہ آئینے والے کو کوئی نہیں جانتا تھا۔ پھر شہر والوں نے قریب ایک آئینے والا سید اسد اللہ کر کے تھا تو مگر وہاں ایک آدمی عمامہ باندھے عبا پہنے بیٹھا تھا۔ سید کبھی عمامہ نہیں باندھتا، یہ میں جانتی تھی۔ اس لیے وہاں سے نکل آئی۔ نماز کا وقت ہو گیا تو روضے چلی گئی۔ وہاں پھر خیرات اکٹھی کی اور پھر بازار میں آ گئی۔ قریب مدت تک اسد اللہ کو یہاں وہاں ڈھونڈھتی رہی، بالکل ان دنوں کی طرح جب وہ بچے تھے اور کہیں گم ہو جاتا تو میں اسے کھوجتی پھرتی تھی۔ میں نے سوچا اس کے گھر جا کر دروازے پر بیٹھ رہوں، لیکن عزیزہ خانم کے ڈر سے نہیں گئی۔ سچ تو یہ ہے کہ اس رات مجھ کو سب سے ڈر لگ رہا تھا۔ پھر میرے جی میں یہ سمائی کہ اسی دن لوٹ جاؤں۔ اسی خیال سے گاڑیوں کے ڈبے پر پہنچی۔ اچانک دیکھتی ہوں کہ سید اسد اللہ ہاتھوں میں سامان اٹھائے ڈبے سے نکل رہا ہے۔ میں نے اسے پکارا تو رک گیا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا، صدقے قربان ہوئی، دعا پڑھ کر دم کی۔ وہ اسی طرح کھڑا رہا۔ زبان اس کی بند ہو گئی تھی، بس بھونچکا سے کھڑا مجھے تک رہا تھا۔ میں نے کہا:

گھبراؤ نہیں، جانی، ہم تمہارے گھر نہیں آ رہے ہیں۔ معلوم ہے عزیزہ خانم ہماری صورت دیکھنے کی روادار نہیں ہیں۔ تم بھی تو تین مہینے ہوئے وہاں سے اٹھ آئے ہو۔

سید کہنے لگا:

اماں، قصور ہمارا ہی ہے۔ تیسرے پہر تم کو روضے میں دیکھا۔ بھیک مانگ رہی تھیں۔ وہاں تم سے کچھ کہہ ہی نہیں سکتا تھا۔ اف! اگر کسی نے تمہیں پہچان لیا تو میری کیا آبرو رہ جائے گی؟

میں کچھ نہیں بولی۔ سید نے پوچھا:

تو کہیں رہنے کا ٹھکانا ہو؟

ہمارا غم نہ کھاؤ، میں نے کہا، یہیں پر کیا موقوف، جہاں بھی جائیں گے زمین کا ایک ٹکڑا تو نکل ہی آئے گا۔

پھر مجھ سے رہا نہیں گیا، رونے لگی۔ سید اسد اللہ کو بھی رونا آ گیا لیکن جھینپ لے گیا۔ پوچھنے لگا:

تو روتی کیوں ہو؟

اپنے غریب الوطنی عالم پر رو رہے ہیں، میں نے کہا۔

سید نے اپنی جیبیں ٹٹولیں، ایک تومان کے پیسے نکال کر مجھے دیے اور بولا:

اماں اس شہر میں تمہارا رہنا ٹھیک نہیں۔ اچھا یہی ہے کہ سید عبداللہ کے پاس چلی جاؤ۔

Scanned with CamScanner

مجھ سے تو تمھارے لیے کچھ ہو نہیں سکتا۔ یہ بھیک مانگنا اور صدقہ خیرات وصولنا ہمارے تمھارے لیے کوئی عزت داری کی بات نہیں۔ کل نہیں تو پرسوں کوئی۔ کوئی تمھیں دیکھ ہی لے گا اور سب کو پتہ چل جائے گا کہ حاجی سید رضی کی گھر والی بھیک مانگتی ہے۔ چلی جاؤ سید عبداللہ پاس۔ اُس کی بیوی تو عزیزہ کی طرح چڑچڑی بھی نہیں ہے۔'

ہم گاڑیوں کے پاس پہنچ گئے۔ اُس نے ایک ڈرائیور سے کہا:

' بھیا، للہ وسطے ان بڑی بی کو شوش میں اتار دینا۔ ثواب کا کام ہے۔'

۴

سید عبداللہ کے ہاں سب کا دل مجھ میں لگا ہوا تھا۔ سید اپنی بی بی کے ساتھ گاؤں چلا گیا تھا۔ گھر میں بچے ہی بچے تھے۔ رخشندہ کی اُبلی ہوئی آنکھوں والی منگنی بہن بچوں کے لیے کچھ بُن رہی تھی، مجھے دیکھا تو باچھیں کھل گئیں۔ بچے بھی نہال ہو گئے۔ رخشندہ اور سید عبداللہ کے جلدی لوٹنے کی امید نہیں تھی۔ روٹی، سالن، جو چاہو ڈھیروں موجود۔ بچے میرے اوپر لدے پڑ رہے تھے۔ صحن بھر میں میرے پیچھے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ جاننا چاہتے تھے کہ میرے تھیلے میں کیا ہے۔ میں کیوں رہتا دیتی۔ انھیں بھی اپنے بڑوں کی طرح فکر تھی کہ میرے تھیلے کی ٹوہ لیں۔ رخشندہ کی بہن دالان میں بیٹھی ٹٹھے لگا رہی تھی۔ اُس نے اپنے کھلے ہوئے بال پیچھے سمیٹے اور پوچھا:

"بڑی خانم، آخر اس تھیلے میں ہے کیا؟"

یہ میں نہیں بتا سکتی تھی۔ بس اتنا کہہ کے رہ گئی:

"کچھ بھی نہیں، ہونا کیا ہے؟"

باہر جانے کو ہوئی تو بچے بھی ساتھ چلنے کو مچل گئے، لیکن میں کسی صورت اُن کو بہلا پھسلا کر سڑک پر آ گئی۔ چوراہے پر ایک گول میدان سا تھا، بیچ میں گڑھے کی طرح دھنسا ہوا، وہیں ایک کنارے بیٹھ گئی۔ لیکن آدمی اُدھر کم آتے تھے، وہاں مانگنے سے کچھ ملنا ملانا نہیں تھا۔ ہاں بس ایک فقیری کا ثواب تھا۔

گھر واپس آئی تو رخشندہ کی بہن بولی:

"بڑی خانم خصم پاس گئی تھیں!"

بچے ہنس پڑے اور سب نے رٹ لگا دی:

"خصم پاس گئی تھیں! خصم پاس گئی تھیں!"

پھر سب ایسی ایسی باتیں پوچھنے لگے کہ مجھے بھی ہنسی آ گئی اور کچھ جواب دیتے ہی نہیں پڑا۔ رخشندہ کی بہن مجھ کو چاہتی تھی، بہت چاہتی تھی۔ یہ مجھے پتا تھا۔ خود بھی کہا کرتی تھی کہ میرے کام کرنے میں اس کا بڑا جی لگتا ہے۔ میں نے اس سے کہا میرے لیے ایک جھولا سی دو۔ اُس نے سی

سی دیر، اور کتنا بڑا سا! ایسے بیٹھی تو کہنے لگی:

"جھولے کا سپنا اچھا شگون ہوتا ہے۔"

میں نے سوچا اس میں کون سا اچھا شگون ہوگا، مگر اس نے شاید ٹھیک کہا تھا، اس واسطے کہ دوسرے ہی روز صبح اندھیرے سید عبداللہ اور رخشندہ گاؤں سے آ گئے۔ رخشندہ بھی مجھے دیکھ کر مریزو کی طرح اچھل پڑیں۔ سید عبداللہ خوب موٹا تازہ سُرخ سفید ہو رہا تھا۔ داڑھی بھی لمبی ہو گئی تھی۔ لیکن اس نے جیسے مجھے دیکھا ہی نہیں۔ میں نے سوچا چھوڑو، یہاں سے بھی ٹل ہی جاؤ۔ کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اب پہلے دن کی طرح بچوں کے ساتھ ہنسنا بولنا بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ رخشندہ کی بہن تک ساری دن لگی بھول گئی تھی۔ سید کچھ دیر تک سوچ میں ڈوبا رہا، پھر بولا:

اماں، آؤ، جس گاڑی پر ہم آئے ہیں اسی پر گاؤں چلی جاؤ۔ میں خود جاڑوں میں تم کو دیکھنے آؤں گا۔

بچے میرے واسطے نان پنیر لے کر آ گئے۔ میں نے اپنا بقچہ سنبھالا، رخشندہ کی بہن والا جھولا بھی اٹھا لیا، سید کی دی ہوئی لاٹھی سنبھالی اور کہا:

"کوئی بات نہیں، جا رہے ہیں۔"

بچوں کو پیار کر کے باہر نکل آئی۔ گاڑی دروازے ہی پر لگی ہوئی تھی، سوار ہو گئی۔ بچے میرے پیچھے پیچھے گاڑی تک آئے۔ رخشندہ اور اس کی بہن نہیں آئیں۔ سید نے دو تومان کا خُردہ جیب میں رکھوا دیا تھا کہ گاؤں ہی میں رہنا، واپس مت آنا۔ میں نے دالان میں رخشندہ کی بہن کے رونے کی آواز سنی۔ رخشندہ کی بڑی بٹیا کہنے لگی:

ماں ڈرتی ہے، ڈرتی ہے بابا گھر سے نکال دیں گے۔

o o o

دوپہر ہوتے گاؤں پہنچی۔ گاڑی سے اتری، ایک کمرے میں پہنچا دی گئی۔ اس میں کوئی کھڑکی نہیں تھی، بس ہر کونے میں طاقچے تھے۔ میں نے دروازہ بند کر لیا اور لیٹ رہی۔ ہاتھ پیر، پوری جان درد کر رہی تھی۔ رات کو مجھے نان اور نمک ملا۔ نماز کے لیے اٹھی، دروازہ کھولا۔ مکان کے سامنے کھائی تھی۔ اُس پر چاند نکل آیا تھا اور سارے میں چاندنی پھیل گئی تھی۔ دور سے بھیڑیے کی آواز آ رہی تھی جیسے کہ ابھی سردیاں شروع نہیں ہوئی تھیں۔ مکان کی چھت پر کوئی چڑیا ٹک ٹک کرتی ٹھونگیں مار رہی تھی۔

اس کے بعد میں ہمت کر کے گھر سے باہر نکلی۔ بس کمرے میں پڑی اپنے بچوں کا سوچ کرتی کہ سب کیسے ٹک ٹک کونوں میں پڑے ہیں۔ میرا دل ان کے لیے کلپتا تھا۔ سب سے زیادہ پریشانی صمد کی تھی کہ اس کا سسٹنڈ میں جواد آغا ہر وقت اُسے کو چھاتا رہتا تھا۔ بس ایسے ہی وہم گھیرے رہتے تھے۔ وہم کسی دن کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ سب سے بدتر یہ کہ میں صدقہ اکٹھا نہیں کر پا رہی

تھی۔ سہ پہر کو لاٹھی ٹیکتی ہوئی میدان کی طرف جا نکلتی اور رات تک وہیں بیٹھی رہتی۔ جوتیاں الگ کھو گئی تھیں۔ رات کو گھر لوٹتی تو بچوں کی طرح خوب میں جوتیاں دیکھتی۔ دیکھتی کہ جوتیاں مل گئی ہیں ورمیں آرام سے کانٹے کنکر پر چل لیتی ہوں۔ کئی بار رت کو کپڑے بھی خراب کر لیے۔ پیری و صد عیب۔ حالت میری اچھی نہیں تھی۔ پہلے تو کوئی کوئی خبر بھی لے لیتا تھا، مگر یہ دیہاتی بندے بس اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔

ایک رات تو دل بہت کُڑھا۔ یسا لگا کہ وہ سب مجھے پکار رہے ہیں۔ میرے بیٹے، پوتے نواسے، بیٹیاں۔ سب پکار رہے ہیں۔ سب پہاڑ کے پیچھے سے مجھے آوازیں دے رہے ہیں۔ میں باہر آ گئی۔ نماز کا وقت جا نا رہ تا۔ کچھ دور چل کر میں نے کان لگائے تو ایسا معلوم ہوا سچ مچ مجھے پکار رہے ہیں۔ صفیہ کے بچے رو رہے تھے اور مجھے بُلا رہے تھے۔ رخشندہ کی لڑکی مجھے بُلا رہی تھی۔ میں نے پکار کر کہا:

"آ رہی ہوں۔"

○ ○ ○

دو دن پہلے میں نے شمائلِ مبارک کی شبیہ خرید لی تھی۔ سوچا تھا بھیک مانگنے کے لیے شمائل ضروری ہے۔ میں نے شمائل اور بقچہ اٹھایا اور چل کھڑی ہوئی۔ سڑک تنگ ور لمبی تھی لیکن چاند نکل آیا تھا جس سے کچھ روشنی ہو گئی تھی اور مجھے پیروں تلے زمین دکھائی دے رہی تھی۔

میں گاؤں سے باہر نکل آئی تھی تھکن اتارنے کے لیے یک طرف زمین پر بیٹھ گئی۔ ونٹوں کی گھنٹیاں سنائی دیں۔ ایک آدمی تھا اور تین اونٹ۔ میں نے منت کی کہ مجھے بھی ایک اونٹ پر بٹھا لے۔ اُس نے بٹھا لیا۔ یک پر آپ سوار ہوا۔ تیسرا اونٹ ہمارے پیچھے پیچھے چلا۔ کچھ دور جانے کے بعد میں نے گھوم کر دیکھا۔ اب گاؤں نظر نہیں آ رہا تھا۔ اُس رات اور دوسرے دن چل کر ہم شہر پہنچ گئے۔ اونٹ والا مجھ سے پیسے نہیں لے رہا تھا۔ بس ذرا سی روکھی روٹی لے کر جیب میں ڈال لی، اونٹوں کو چمکارا اور چل دیا۔

پہلا ہی آدمی جو سامنے پڑا، میں نے اس کے آگے ہاتھ پھیلا دیا۔ اس نے ایک بار شمائل کو دیکھا، ایک بار میرے ننگے پیروں کو، اور آگے بڑھ گیا۔

۳

جو د آقا کو میں نے یہ بتایا تھا کہ کام پر نکلی ہوں۔ یک پیٹ کا بھرنا کون بڑی بات ہے۔ کام کرو یا نہ، پیٹ بھر لوں گی۔ بھیک مانگتی ہوں تو کوئی پیسے کے لیے تھوڑی مانگتی ہوں، ثواب کی خاطر مانگتی ہوں۔ مجھے بھیک کے ٹکڑوں کی خوشبو بھاتی ہے، اُنھیں کھانا نہیں۔ مجھے فقیری کا ثواب اچھا لگتا ہے۔

Scanned with CamScanner

جواد آقا نے میرے منہ پر دروازہ بند کر دیا اور بولا مجھے گھر میں نہیں گھسنے دے گا۔ میں جانتی تھی کہ صفیہ کوٹھری میں چھپ کر رو رہی ہو گی، بلکہ رہی ہو گی کہ اس کی ماں کو گھر سے نکال دیا گیا۔ لیکن وہ مجھ سے بھی زیادہ ڈرپوک تھی، حیریت اسی میں جانتی تھی کہ جواد آقا کے آتے ہی آپ کو سنبھال لے، آن کے بیٹھے، جواد آقا کو چائے دے، بچے کا پالا ملائے، اور میرے خیال بھی دل میں نہ لائے۔

سہ پہر کو جواد آقا بازار چلا جاتا تھا۔ میں نے سوچا، اگر اس وقت گھر پہنچ جاؤں تو صفیہ مجھے کسی کونے بلوکھے میں اس طرح چھپا سکتی ہے کہ جواد آقا کو پتا نہ چلے۔ لیکن دستک جو دی تو دروازے پر جواد آقا ہی آن کھڑا ہوا۔ تیکھی نظروں سے مجھے دیکھ کر بولا:

"کیا بات ہے؟"

کچھ نہیں، میں نے کہا اور راستا لیا

وہ پیچھے سے مجھے دیکھتا رہا یہاں تک کہ میں اس سے دھیان ہو کر سڑک پر آ گئی۔ وہاں میں نے بچے سے شامل ٹکالی اور صدقہ لینا شروع کر دیا۔ لیکن میرا دل چاہ رہا تھا کچھ کام کروں۔ میں نے اپنے آپ سے کہا میں کام کروں گی، بالکل کام کروں گی۔ اور اسی وقت کام آ بھی گیا۔ ایک دبلی پتلی لمبی سی عورت وہاں جیسے میرا ہی رستا دیکھ رہی تھی۔ اس نے مجھ سے پوچھا:

"کپڑے دھو سکتی ہو؟"

میں نے کہا دھو سکتی ہوں، اور ہم روانہ ہو گئے۔ دیر تک چلتے رہے۔ ایک سڑک، دوسری سڑک۔ آخر ایک خالی ڈھنڈار گلی میں پہنچ کر ایک مکان میں داخل ہوئے۔ لمبی سی اندھیری اندھیری ڈیوڑھی تھی۔ پھر ہم ایک بہت بڑے صحن میں آ گئے۔ وہاں چوطرفہ کمرے بنے ہوئے تھے۔ حوض کی چبوترہ کے پاس کئی عورتیں خوب سنگھار پٹار کیے بیٹھی گپا پی رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی سب میری طرف گھوم بیٹھیں اور آپس میں کچھ باتیں کر کر کے ہنسنے لگیں۔ ان میں سے دو ایک میری بڑی بیٹیوں کی طرح اچھے قد کاٹھ کی خوب گوری چٹی تھیں۔ پھر سب باتیں کرتی رہیں، کرتی رہیں۔ آخر طے پایا کہ میں کپڑے نہ دھوؤں، بس دروازے پر بیٹھی رہوں، پتا نہیں کیوں۔ مجھے دروازے کے پاس بٹھا دیا گیا۔ میں نے شامل اور تھیلا اٹھا لیا، اس سکھڑو کو نہیں اٹھانے دیا۔ مجھ سے کہہ دیا گیا کہ کوئی آدمی دروازہ کھٹکھٹائے اور رباب کو پوچھے تو دروازہ کھول کر اسے اندر آنے دوں۔ بڑا کام تھا۔ کسی نے دروازہ نہیں کھٹکھٹایا۔ میں دعائے کمیل پڑھتی رہی۔ سب سے لگ تھلگ اندھیری جگہ تھی۔ صحن سے بولنے چالنے کی آوازیں آ رہی تھیں، لیکن میں اپنے کاسے میں منہ ڈالے بیٹھی رہی۔

کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا بتایا رباب سے ملنا ہے۔ مرگھلا آدمی تھا۔ اس نے اور کچھ نہیں بتایا، اندر بلا گیا۔ میں نے پھر دروازہ بند کر دیا۔ صحن سے کھلکھلانے کی آواز آئی۔ پھر سب کچھ پہلے

کی طرح- اس کے بعد کوئی دروازے پر نہیں آیا- میں نے کہا یہ بہت اچھا ہے- یہاں چین سے بیٹھ سکتی ہوں، اور بیٹھے ہی بیٹھے مجھے نیند آ گئی- خواب میں دیکھتی ہوں کہ ایک لمبی پتلی گلی میں جواد آقا ایک ہاتھ میں چھڑی، ایک میں چابک لیے میرے پیچھے آ رہا ہے- میں بجلی کی طرح چمک کر بھاگی- اسی مکان پر پہنچی اور ڈیوڑھی میں گھس گئی، دروازہ بند کر لیا- اب وہ مجھے نہیں پا سکتا تھا- جواد آقا آ پہنچا اور دروازہ دھڑدھڑانے لگا- میری آنکھ کھل گئی- دروازہ واقعی پیٹا جا رہا تھا- میرا دم سوکھا ہوا تھا- پھر میں نے خود کو کچھ سنبھالا، پوچھا:

"کون ہے؟"

دروازے کے اُدھر سے کسی نے کہا:

"رباب!"

میں نے دروازہ جو کھولا تو سامنے جواد آقا کی صورت! میں نے دروازہ دھڑ سے بند کر دیا، تھر تھر کانپنے لگی- اس نے اور زور سے دروازہ پیٹنا شروع کر دیا- گفتگو آ گئی- میں نے کہا:

"کھولتا نہیں، جواد آقا آ گیا ہے، میرا داماد-"

جواد آقا تھا کہ دروازہ پیٹے جا رہا تھا اور گالیاں بک رہا تھا- آخر عورت نے مجھے ایک کوٹھری میں پہنچا دیا- میں نے اس کا کواڑ بند کر لیا- عورت نے ڈیوڑھی میں جا کر باہر کا دروازہ کھولا- جواد آقا اندر گھس گیا اور سیدھا صحن میں چلا گیا- عورتوں کے کھلکھلانے کی آواز آئی، اور پھر سب کچھ پہلے کی طرح-

میں نے بچے اور شمائل سنبھالی اور بھاگی باہر- وہی مثل کہ اب نہ بھاگے گا تو کب بھاگے گا- سیدھا اپنے میں آ کر رکی تو لگتا تھا دل بھی رک جائے گا-

۴

اُس رات میں نے خیریت نہیں لی- شمائل میری چادر کے اندر اور لاٹھی میرے ہاتھ میں تھی- نماز پڑھ لی تھی اور بچے میں نان کافی تھی- مسجد میں یا کسی اور جگہ جانا نہیں چاہتی تھی- ایک کالی گاڑی آئی، مجھے بٹھا لیا اور شہر کے باہر لے جا کر ایک پتلی سی اندھیری گلی کے نکڑ پر اتار دیا- گلی کے اُس سرے پر ٹمٹماتی ہوئی سی روشنی تھی جیسے ماچس جل رہی ہو- بچوں کی شیطانی سے جان چھوٹ گئی تھی، اب اپنے کام کا وقت آ گیا تھا- گلی کے سرے پر پہنچی- ایک دروازہ کھلا ہوا تھا- میں اندر چلی گئی- بڑا سا باغ تھا، گھنے پیڑ، اور پانی کی ست ت- ایک پرانی قندیل شاخ سے لٹکی ہوئی جل رہی تھی- میں ایک چبوترے کے کنارے بیٹھ کر انتظار کرنے لگی- قمر اور جامالی فاطمہ اور یاسرہ بھی آن پہنچیں- ہم چاروں مل کر پہلے تو روئے، پھر اپنے اپنے دکھڑے سنانے لگے- قمر تھلتلی ویسی ہی سوئی تھی، البتہ اس کی توند پلپلا گئی تھی- ہاں جامالی فاطمہ گھُل کر رہ گئی تھی، مگر اب بھی

Scanned with CamScanner

ہنستی خوب تھی۔ اور اس کے بعد رونے بھی لگتی تھی۔ ماہپارہ مرسکی کے چہرے کی جھریاں اسی طرح کپکپا رہی تھیں۔ اپنی انگلیاں دانتوں سے کاٹ رہی تھی۔ میں جان گئی کہ بھوکی ہے۔ بقچہ کھولا۔ روٹیاں نکالیں اور تینوں کو بانٹیں۔ قمر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کرے کیا نہ کرے۔ جانالی فاطمہ اپنا پھٹا پرانا بقچہ آگے دھرے ہنسے جا رہی تھی اور روئے جا رہی تھی۔ البتہ ماہپارہ نے پوری روٹی ختم کر لی تھی اور اب ہونٹ چبا رہی تھی۔

پھر باتیں شروع ہوئیں۔ تینوں نے مجھ سے خوب گلے شکوے کیے کہ ہم لوگ اتنے دن سے یہاں پڑے ہیں اور تم دیکھنے بھی نہیں آئیں۔ میں نے بھی قسموں پر قسمیں کھائیں کہ میں یہاں تھی ہی نہیں، مگر ان کو یقین نہیں آیا۔ پھر ٹھیک ٹھاک کی بات ہوئی۔ جانالی فاطمہ سے کتنا کتنا کہا، اس نے اپنا بقچہ کھول کر نہ دکھایا۔ میں سمجھ گئی کہ اس نے پارچوں کا کام چھوڑ دیا ہے۔ کیا پتا میرے بقچے کے اندر انھیں میں کا کوئی پارچہ ہو۔ پھر ہم حوض پر آئے۔ میں نے اپنے بچوں کا حال احوال سنایا کہ سب ٹھیک ٹھاک ہیں، میں بھی ٹھیک ٹھاک ہوں، صدقہ دیتی ہوں اور شمائل کی زیارت کرتی ہوں، بقچہ ساتھ ہے اور ہر وقت تیار ہوں۔

ماہپارہ موٹی سی نان ختم کر جانے کے بعد بھی اسی طرح بھوکی تھی اور مجھ پر آنکھیں گاڑے ہوئے تھی۔

جانالی فاطمہ نے پوچھا:

شمائل دکھانے لگتی ہو تو روضہ بھی پڑھتی ہو گی؟

میں نے روضہ پڑھنا شروع کر دیا۔

ہم چاروں درخت کے نیچے بیٹھے تھے۔ جانالی فاطمہ پہلے ٹھٹھا مار کر ہنسی، پھر رو پڑی، اور ہم سب نے، چاروں نے، رونا شروع کر دیا۔ باغ کے اندر سے بھی رونے کی آوازیں آنے لگیں۔

۵

دعائے علقمہ پڑھ چکی تو اچانک مجھے گھر اور اپنی جمع پونجی کا خیال ستانے لگا۔ گھر تو اپنا تھا نہیں، البتہ ساری جمع پونجی میں نے ایسہ آغا کے یہاں رکھوا دی تھی۔ سہ پہر کا وقت تھا کہ میں نے وہاں جا کر دستک دی۔ دروازہ کھلا۔ مجھے دیکھا تو سب سناٹے میں آ گئے، جیسے قبر سے نکل کر آ رہی ہوں۔ میں کچھ بولی نہیں۔ ایسہ آغا اور ان کی نواسیاں پاس آ کھڑی ہوئیں۔ بیٹی موجود نہیں تھی، میں نے پوچھا کہاں ہے۔ بتاتی تھی ہمیشہ کی طرح حمام کرنے گئی ہوئی ہو گی۔

ایسہ آغا نے پوچھا:

کہیے، اچھی تو ہیں؟

اپنا سامان دیکھنے آئی تھی، میں نے کہا۔

Scanned with CamScanner

انھوں نے تہہ خانے کا راستا بتا دیا، پھر خود بھی ساتھ ہولیں۔ کہنے لگیں:
"سیّد مرتضیٰ اور جواد آقا اور حور یہ سامان کے چکر میں کئی پھیرے لگا چکے ہیں، لیکن میں نے کہہ دیا ابھی تو صبر سے سیّد خانم زندہ سلامت ہیں۔ جب ان کا وقت آن پہنچے گا تب آ کر حصّہ بانٹ لیجیو۔"

ہم وہاں پہنچے۔ تہہ خانے میں فنائل کی گولیوں کی بو بسی ہوئی تھی۔ قالین اور چاندنیاں ایک کونے میں ڈال دی گئی تھیں اور سیل کر گلی جا رہی تھیں۔ آبگرموں کے نلکے، اور بڑے والے سماور، اور ٹین کے کنستر اوپر تلے ڈھیر تھے۔ دھانس ایسی کہ سانس لیے دماغ پھٹا جاتا تھا۔ میری تینوں کرسیاں برابر برابر دھری گئی تھیں اور ان پر تین بکری کے بچے آ کھڑے ہوئے تھے۔ کرسیوں کے پایوں سے پیال کے مٹھے لٹک رہے تھے۔ بکری کے بچوں نے لپک لپک کر پیال پر منہ مارے، پھر چاندنیوں پر بیٹھ کر جگالی کرنے لگے۔
"پیسوں کا کیا کیا، بڑی خانم؟" امینہ نے پوچھا۔
"پیسے کیسے؟" میں نے کہا۔
"عزیزہ نے خط میں لکھا تھا کہ آپ نے قبرستان میں جگہ مول لی ہے۔"
"تمھارے منہ میں گھی شکر،" میں نے کہا، "مگر پیسے کہاں تھے؟"
"آپ رہ کہاں رہی ہیں؟" انھوں نے پوچھا، "لیٹتی سوتی کس جگہ ہیں؟"
"جہاں بھی ہو،" میں نے کہا، "مسجد ہی میں پڑ رہتے ہیں۔ قبرستانوں میں شمائل گردانی، روضہ خوانی کرتے ہیں۔ ہم ذاکرہ ہو گئے ہیں۔"
بچے یہ سنتے ہی کھل اٹھے۔ مجھے بڑا چاؤ لگا۔ لیکن میں نے انھیں شمائل دکھائی تو ڈر گئے۔ کمبخت ان کے بچے حضور کی شبیہ سے ڈر گئے۔ امینہ نے پوچھا:
"اب تو آپ نشا خاطر ہو گئیں؟ دیکھ لیا، سب سامان موجود ہے نا؟"
"ہاں،" میں نے کہا، "لیکن ہم سوچتے ہیں ایک بُچّی مل جاتی تو شمائل کا پردہ بنا لیتے۔ گناہ کی بات ہے نا کہ ہر پاک ناپاک کی آنکھ حضور کے جمال پر پڑے۔"
امینہ میرے سامنے آ کھڑی ہوئیں اور بولیں:
"نہیں۔ یہ تو نہیں ہونے کا۔ آپ کے بیٹے راضی نہیں۔ میری جان کو آ جائیں گے۔ میں نہیں دے سکتی۔"

وہاں سے واپس آئی تو میرا دل پتھر ہو چکا تھا۔ میں نے سوچا حبیب کی شمائل کو پردہ ضرور نہیں۔ چاہے اس پر گرد اکٹھی ہو جائے۔ مٹی کا پردہ حضور کے جمال کو نامحرموں کی آنکھ سے بچائے رکھے گا۔

میں ایک ترپے پر بیٹھ گئی۔ شمائل کو دیوار سے ٹکا دیا اور روضہ پڑھنا شروع کیا۔ پھیر لگ

Scanned with CamScanner

گئی، فقط تماشا دیکھنے کو۔ کسی نے دیا کچھ نہیں۔

میں صرف صف سب پڑھ رہی تھی اور گریہ کر رہی تھی، اور وہ سب یوں ہی ٹھس کھڑے تھے۔ ناچار میں نے شمائل اٹھائی اور روانہ ہو گئی۔ لوگ میرے پیچھے پیچھے تھے۔ کئی گلیاں پار کیں۔ مجھ میں نہ آتا تھا کہاں جاؤں۔ قبرستان پہنچی۔ لوگ اب بھی پیچھے لگے ہوئے تھے۔ میں نے شمائل کو دیوار سے لگایا اور اس کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ لوگوں نے میرے چوگرد گھیرا بنا لیا۔ کوئی منہ سے کچھ بولتا نہیں رہا تھا۔ قبرستان کے اندر کہیں کوئی رو رہا تھا۔ ہم سب سن رہے تھے۔

۶

اس کے دوسرے دن سے مجھے بھیک ملنا بند ہو گئی۔ گلیاں ناپتی پھر رہی تھی اور بچوں کا غول پیچھے لگا ہوتا تھا۔ میں روضہ پڑھتی اور ایک کٹوری پانی پی لیتی۔ آواز بیٹھی ہوئی تھی۔ پیر لگ پھٹ گئے تھے، ہونٹ بری طرح تڑخ رہے تھے اور ناخن اکھڑے پڑ رہے تھے۔ گلے میں کوئی چیز پیدا ہو گئی تھی کہ منہ سے بات ٹھیک طرح نہیں نکلتی تھی۔ قبرستان میں سوتی تھی۔ شمائل پر اتنی گرد جم گئی تھی کہ حضور کی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ تھیلے میں کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ بھوک مجھے لگتی ہی نہیں تھی۔ پانی، بس پانی پی لیا کرتی تھی۔ دل پتھر ہوتا جا رہا تھا۔ منہ کے اندر ہتھیلی برابر گھاو ہو گیا تھا، اس سے بھی خون آتا رہتا تھا۔ جیسے کسی سے بھیک نہیں مانگتی تھی۔ اب تو کھانے کو بھی جی نہیں چاہتا تھا۔ لوگ ہر وقت مجھے گھیرے رہتے تھے۔ انہیں لوگوں میں دیکھتی تھی کہ میرے بیٹے پوتے بھی پیچھے کھڑے ہیں۔

جمعے کی رات دیر گئے قبرستان میں غسل خانے کے پچھواڑے بیٹھی تھی، نماز بھی نہیں پڑھی تھی، کہ دیکھتی ہوں سید مرتضیٰ کا بڑا لڑکا اور آقا مجتبیٰ چلے آ رہے ہیں۔ کہنے لگے تمہیں گھر لے جانے آئے ہیں۔ میں ملاقات کو جاتی، مگر دونوں نے زبردستی پکڑ کر مجھے گاڑی میں ڈال دیا اور روانہ ہوئے۔ چلتے چلتے، چلتے چلتے آخر اتر کر ایک احاطے میں گھسے، پھر اس سے نکل کر ایک اور احاطے میں۔ وہاں مجھ کو دم دلاسا دے کر درختوں کے ایک جھنڈ کے پاس بٹھا کر آپ سامنے ایک کمرے میں چلے گئے جہاں بتی جل رہی تھی۔ وہاں بیٹھے ہوئے آدمی کو انہوں نے ایک پرچی تھما دی۔ اس نے پرچی پڑھی، کھڑکی کے پاس آ کر مجھ کو دیکھا اور سر ہلا دیا۔ سید مرتضیٰ کا لڑکا اور آقا مجتبیٰ دونوں تب باہر آئے، میری طرف دیکھا بھی نہیں، پھر احاطے سے نکل گئے۔ اب دو اور آدمی آئے، ہاتھ پکڑ کر مجھے ایک اندھیرے گلیارے میں لے گئے۔ میرے ننگے پیر اینٹوں میں چپک رہے تھے۔ ہم ایک کمرے میں پہنچے۔ وہاں کارنس پر ایک کپی جل رہی تھی۔ کمرے کا فرش ٹھیک سے دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ایک کونے میں جگہ لی اور میں وہیں بیٹھ گئی۔ اب سانسوں کی آوازیں سنائی دیں اور میں سمجھ گئی کہ یہاں اور بھی بہت لوگ ہیں۔ اس کے بعد مجھے نیند آ گئی۔ صبح اٹھی تو

دیکھتی ہوں سارا کمرہ بھکاریوں سے بھرا پڑا ہے۔ تب ایکا ایک مجھے پتا چلا کہ میں فقیر خانے میں ہوں۔

میں دروازے کے پاس شمائل اور نقّو سنبھالے بیٹھی رہی، باقی سب روتے پیٹتے دعائیں مانگتے رہے کہ خدا جلدی موت دے۔ میں نے روضہ خوانی شروع کر دی اور سب میرے گرد جمع ہو گئے، لیکن گریہ ایک نے بھی نہیں کیا۔

کچھ زیادہ کرنا تو تھا نہیں، میں نے نماز پڑھی اور گوشہ پکڑ لیا۔ اب کسی بات کی پروا نہیں رہی تھی۔ جان گئی تھی کہ کوئی میرے واسطے پریشان نہیں۔ وہاں میں بہت دن رہی۔ کتنے ہی مر گئے، کتنے ہی نئے آ گئے۔ سب فاقوں زدہ کہ ہر وقت بس کھائے چلے جاتے تھے۔ لیکن کوئی بھی اُن میں فقیر نہیں تھا، سب بھوکے تھے، قحط۔

اتنے لوگوں میں میں وہاں صرف ایک بڑھیا تھی کہ کسی سے بولتی چالتی نہیں تھی، بس بیچ میں اپنا نقّو اور شمائل لیے اپنی دُھن میں بیٹھی رہتی تھی۔ میں نے پھر سے روٹی کھانے کی عادت بنا لی تھی اور پھر سے راتوں کو مجھے خواب میں صفیہ اور حوریہ اور سید اسد اللہ اور سید عبداللہ کے بچے آنے لگے تھے۔ میں بے نماز آدمی کی طرح ہر وقت بے آرام رہنے لگی۔ شروع کے خوابوں میں تو حضور کی بھی زیارت ہوئی، لیکن دھیرے دھیرے سب کچھ غائب ہو جاتا تھا۔ کچھ کر بھی نہیں سکتی تھی اور وہاں سے نکلنا بھی چاہتی تھی، مگر دروازے پر ایک بڈھا بیٹھا رہتا تھا کہ دیکھتے ہی لاٹھی تانتا اور کہتا تھا:

"ہُش، ہُش!"

آخر میرا دل ہولانے لگا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کروں تو کیا کروں۔ بس روضہ پڑھتی رہتی اور روتی رہتی تھی۔

ایک دن کمال، صفیہ کا بڑا بیٹا، بارہ سال کا ہو گا، وہ اپنے دوست کے ساتھ مجھے ڈھونڈھتا ہوا آ گیا۔ میں دروازے پر گئی۔ صفیہ نے میرے لیے نان پیاز بھجوائی تھی۔ لڑکے نے بتایا کہ سب کو پتا ہے کہ میں محتاج خانے میں پڑی ہوں۔ بڑا محبتی بچہ تھا۔ مجھے دیکھا تو رونے لگا۔ اپنی جوتیاں مجھ کو دیے دے رہا تھا۔ مجھے بھی رونا آ گیا۔ اُس نے بتایا کہ میں وہاں سے بھاگ سکتی ہوں۔ کسی بھی موکھلے سے، جیسے موری کے راستے، نکل جاؤں۔ کہنے لگا باہر فقیر خانے سے کہیں اچھا ہے، اور نوکری میں کوئی برائی بھی نہیں۔

لیکن مجھ کو جواد آغا سے ڈر لگتا تھا۔ جانتی تھی وہ اب بھی میری تاک میں ہے اور کہیں پکڑ پائے گا تو کھال ہی کھینچ لے گا۔ میں نے لڑکے سے کہہ دیا کہ اگر باہر نکلنے کو مل گیا تو تم کو دیکھنے تمھارے مدرسے آؤں گی۔

بچے وہ دونوں چلے گئے۔ دروازے والے بڈھے نے نان پیاز میں سے آدھی اپنے ڈبے میں

رکھی، آدھی مجھے تنہائی میں رات کی بیٹھی صبح ہوتے تک دعائیں پڑھتی رہی۔ پوری بیاض کی دعائیں رٹی ہوئی تھیں، سب پڑھ ڈالیں۔ اجالا ہونے سے پہلے چپکے چپکے بقچہ اور شمائل اٹھا کر موری کے پاس پہنچی۔ لمبی لمبی لیٹ کر زمین پر کھسکتی ہوئی موری میں گھس گئی اور سینے کے بل رینگنے لگی۔ ساری چادر کیچڑ میں لت پت ہو گئی، مگر میں باہر آ گئی، جیسے سانپ اپنے بل سے نکلتا ہے۔ سامنے لمبی سنسان گلی تھی۔ میں دیوار سے لگ کر بیٹھ گئی۔ تھوڑی سانس کھائی۔ فجر کی نماز پڑھی اور چل کھڑی ہوئی۔ گلی سے نکلتے ہی سورج نکل آیا اور مکان دکھائی دینے لگے۔

۷

ایک ہفتے تک مجھے ٹپ چڑھی رہی۔ آواز بھی بالکل بیٹھ گئی تھی۔ یہ بھی نہیں کہ روضہ خوانی کی ہو، نہیں، بس یوں ہی خاک دھول پھانکنے سے سینہ جکڑ گیا تھا۔ پت جھڑ کا زمانہ آتے ہی میرا سینہ جکڑ جاتا ہے۔ گئے دنوں میں ہمیشہ کھڑکیاں بند رکھتی تھی، اس سے یہ حالت نہیں ہوتی تھی۔ اب کھانسی آتی تو معلوم ہوتا تھا کوئی چیز گلے میں اٹک گئی ہے اور دم گھٹا جا رہا ہے۔ فقیر خانے سے نکلنے کے بعد دمڑی بھی پاس نہیں تھی۔ دیواریں تھام کر چلتی، شمائل پیٹھ پر بندھی تھی۔ ہر طرف بھٹکتی پھرتی اور دروازوں پر دستک دیتے ڈر لگتا تھا۔ صرف ایک بار سید عبداللہ کے بیٹوں کو دیکھا۔ انھوں نے بتایا کہ ان کی خالہ، رخشندہ کی بہن، مر گئی۔ اس کے سینے میں کچھ ہو گیا تھا، اسی میں ختم ہو گئی۔ اس کے بعد کوئی خبر، کسی کی سن گن نہیں ملی۔

○ ○ ○

یک دن امینہ آغا کے گھر پہنچ گئی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اندر پہنچی تو دھک سے رہ گئی۔ دیکھتی ہوں کہ سب اکٹھا ہیں۔ سب، بیٹے، پوتے، بیٹیاں، نواسے، نواسیاں۔ اور تو اور، سید اسداللہ، اس کے بچے اور عزیزہ، یہ سب بھی قم سے آ گئے ہیں۔ سب کے سب جمگھٹا لگائے بیٹھے ہیں اور میری جمع پونجی کے حصے بخرے ہو رہے ہیں۔ میرا دل ایسا دھڑ دھڑ کرنے لگا کہ آگے بڑھا نہیں گیا، وہیں کی وہیں بیٹھ گئی۔ جواد آقا سید عبداللہ سے الجھا ہوا تھا۔ جھگڑا ایک قالین پر تھا۔ لڑکیاں تھیلوں پر ٹوٹی پڑ رہی تھیں۔ کوئی راضی نہیں ہوتا تھا۔ ہر ایک چاہتا تھا کہ ہر چیز اسی کو ملے۔ امینہ آغا چیخ چیخ کر رو رہی تھیں کہ سب سے زیادہ تکلیف تو میں نے اٹھائی اور مجھی کو سب سے کم دیا جا رہا ہے۔

میں نے پیٹھ پر سے شمائل کھولی اور دیوار سے ٹکا کر بیٹھی رہی۔ میرے کانوں میں چاندنی فاطمہ اور قمر کی آوازیں آئیں کہ کہہ رہی ہیں:

"اٹھو، چلو۔ اٹھو چلو، سید خانم!"

چانک کمال نے مجھے دیکھ لیا۔ زور سے چیخا۔ سب نے گھوم کر دیکھا اور آ کر مجھے گھیر لیا۔

Scanned with CamScanner

جواد آقا کی آنکھیں چکرکر کر رہی تھیں اور وہ چنگھاڑ رہا تھا:

"دیکھ رہی ہو اپنی کرنی کا پھل؟ یہ جو تمہارے چیتھڑے گدڑے ہیں ---"

میں کچھ نہیں بولی۔ ڈر لگ رہا تھا۔ قمر نے میرے کان میں کہا:

"اٹھو، چلو۔ اٹھو چلو، سیدہ خانم!"

اُن سب کو پہلے تو شش کی نظر آئی۔ مبہوت ہو کر حضور، کاروے مبارک دیکھتے رہے۔ پھر مجھ سے کہنے لگے بقچہ کھولو، بقچہ کھولو۔ یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا تھا۔ بقچہ تو کھولنی ہی نہیں چاہتی تھی۔ جانالی فاطمہ نے میرے کان میں کہا:

"سیدہ خانم، جان! بس بہت ہو گیا۔ اب آ بھی جاؤ۔"

"آقا کھول ماننے والا تھا۔ لات مار کے چلا رہا تھا:

"اس کا بقچہ بھرا ہوا ہے!"

امینہ آغا کہہ رہی تھیں:

"بڑی خانم! بقچہ کھول بھی دیجیے نا، کہ ان کا کلیجا ٹھنڈا ہو۔"

جانالی فاطمہ کی آواز آئی:

"دکھا ہی دو۔ اٹھو، چلو۔"

میں نے بقچہ کھول دیا۔ پہلے سوکھی نانیں نکال کر دیوار کے پاس چن دیں۔ اس کے بعد کپڑے، لٹھے کا پارچہ جو بقچے میں تھا اور سب اس کے لیے مرے جا رہے تھے، وہ باہر نکال کر انہیں دکھا دیا اور کہا:

"ساڑھے تین میٹر۔ پشمی بھی کے تو ہم آدمی ہیں ہمارے لیے بہت ہے۔"

سب مجھے دیکھتے رہ گئے۔ پھر سب نے منہ دوسری طرف پھیر لیے۔ کمال، صفیہ کے بیٹے، نے رونا شروع کر دیا۔

OO

(فارسی عنوان: "تقدیر")

غلام حسین ساعدی

فارسی سے ترجمہ: اجمل کمال

عزادارانِ بَیَل

(پہلی کہانی)

1

کدخدا جب گھر سے باہر آیا تو مالک مکان کا کتا پاپاخ دیوار پر کھڑا ہو کر بھونکنے لگا اور گلی میں کود گیا۔ دوسرے کتوں نے، جو بَیَل کی بیچی چھتوں پر سو رہے تھے، سر اٹھایا، کچھ سونگھا اور کدخدا کو دیکھا جو چاندنی میں زمین پر پڑتے ہوئے لمبے سائے کے ساتھ گلی میں جا رہا تھا؛ انھوں نے اپنے سر پنجوں پر رکھ لیے اور دوبارہ سو گئے۔

کدخدا نے رک کر سننے کی کوشش کی؛ گاؤں کے باہر سے گھنٹیوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ دبی دبی سی مضطرب آواز، دور جاتی ہوئی اور پاس آتی ہوئی، گاؤں کے گرد چکر کاٹ رہی تھی۔ کھڑکیاں سب تاریک تھیں۔ بَیَل کے رہنے والے سو رہے تھے۔ ان میں جو جاگ بھی رہے تھے، اندھیرے میں بیٹھے چاندنی کا نظارہ کر رہے تھے۔

پاپاخ آ کر کدخدا کے پاس کھڑا ہو گیا اور بو سونگھنے لگا۔ کدخدا کھڑا، کان لگائے سنتا رہا۔ گھنٹیوں کی آواز دور ہوتی گئی۔ کدخدا تالاب کی طرف چلا، پاپاخ اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ جب تالاب کے کنارے پہنچا تو ایک چھوٹی سی کھڑکی کھلی اور ایک آدمی کا سر باہر نکلا۔

سر نے اندھیرے میں جنبش کی اور بولا: "کدخدا، آدھی رات سے، کہاں جا رہے ہو؟"

Scanned with CamScanner

کدخدا ٹھہر گیا۔ پاپاخ بھی رک گیا۔ دونوں نے سر کی طرف دیکھا۔

کدخدا نے کہا: 'رمضان کی ماں کی حالت خراب ہے۔ اسے شہر لے جا رہا ہوں۔'

یک اور کھڑکی کھل گئی۔ ایک اور آدمی نے سر باہر نکالا اور کہا: 'شام کو تو ٹھیک تھی، پھر کیا ہوا؟"

کدخدا بولا: "شام کو ٹھیک تھی۔ مگر اب نہیں ہے۔ اب اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ بڑھیا مرنے والی ہے۔ کیا کروں؟ بیٹیں؟ اسلام، کیا کروں؟ بچے کا کیا کروں؟"

اسلام بولا: "اب کیا حال ہے؟"

کدخدا نے کہا: 'کروٹ لے لی ہے۔ منہ قبلے کی طرف کر کے لیٹ گئی ہے۔'

پہلا آدمی جھکا اور اسلام سے بولا: 'اسے شہر لے جانا چاہتا ہے' پھر کدخدا کی طرف منہ کر کے کہنے لگا: "بستر نہیں کہ صبح تک ٹھہر جاؤ؟'

کدخدا بولا: "ڈرتا ہوں کہ صبح تک بچے گی نہیں۔ مجھے تو رمضان کی زیادہ فکر ہے۔ بڑھیا تو ختم ہی ہو گئی ہے۔ ڈرتا ہوں بچہ غصے میں اپنے سر کوئی بلا نہ لے آئے۔ کیا کروں؟ بیٹیں؟ اپنی ماں کے سرہانے بیٹھا ہے اور روئے جا رہا ہے، روئے جا رہا ہے۔'

اسلام نے پوچھا: "شہر کس طرح لے جاؤ گے؟'

کدخدا بولا: 'تمہاری گاڑی میں سڑک تک لے جاؤں گا، وہاں کوئی لاری دیکھوں گا۔'

پاپاخ نے دیکھا کہ کدخدا باتوں میں مصروف ہے۔ تالاب کے کنارے بیٹھ گیا اور تھوتھنی پنجوں پر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ کدخدا نے ایک بار مڑ کر اپنے پیچھے نگاہ ڈالی۔ پاپاخ نے بھی سر اٹھا کر اندھیرے میں دیکھا۔

اسلام نے پوچھا: "کیا ہوا؟"

کدخدا بولا: 'سن رہے ہو؟ گھنٹیوں کی آواز آ رہی ہے۔ نہیں آ رہی؟'

اسلام اور پہلے آدمی نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔ لیکن انہیں گھنٹیوں کی آواز سنائی نہیں دی۔

اسلام بولا: 'کدخدا، میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ گاڑی نکالتا ہوں۔'

اس نے سر اندر کر لیا، لالٹین جلائی، سر پر کلاہ پہنی اور کھڑکی سے باہر نکلا۔ پہلے آدمی نے کھڑکی بند کر لی۔ اس کی بیوی بھی آ گئی اور دونوں کھڑکی کے پیچھے کھڑے ہو کر لالٹین کی روشنی میں کدخدا، اسلام اور پاپاخ کو دیکھنے لگے۔

اسلام نے کہا: 'اپنے کام کا کیا کرو گے؟'

کدخدا بولا: 'تمہیں سوچتا ہوں۔ مجھے تو رمضان کی فکر ہے۔ ڈرتا ہوں کہ اس کی ماں مر جائے گی اور وہ اپنے سر کوئی بلا لے آئے گا۔"

جب وہ تالاب کی دوسری طرف پہنچے تو لالٹین کی روشنی پانی پر پڑی۔ مچھلیاں کنارے پر آ گئیں اور آدمیوں کو دیکھنے لگیں۔

پاپاخ نے جھک کر مچھلیوں کو دیکھنا چاہا، مگر جب اس کی نظر چاند پر پڑی تو ڈر گیا اور پلٹ کر آدمیوں کے پیچھے پیچھے دوڑنے لگا۔

کدخدا بولا: "رمضان کو بھی ساتھ لے جاؤں گا۔ نہ لے گیا تو۔۔۔"

ان کے قدموں کی آواز گلی میں گونجنے لگی۔ بیل کے رہنے والوں نے جب لالٹین کی روشنی دیکھی تو سوچا کہ رمضان کی ماں چل بسی۔ وہ کھڑکیوں کے راستے باہر نکل آئے۔ بوڑھے لوگ جو گھر سے باہر نہیں آ سکتے تھے، چھتوں پر بنے ہوئے سوکھوں سے سر نکال کر جھانکنے لگے۔

گاڑی تیار ہو گئی تو وہ اسے گلی میں لے آئے۔ سب لوگ ساکت کھڑے تھے۔ اسلام اور مشدی جبار اور عباس اور لال بالوں والا، رمضان کی ماں کو لحاف اٹھا کر باہر لائے اور گاڑی میں لٹا کر انتظار کرنے لگے۔ رمضان ٹوپی وسکٹ کے بٹن بند کرتا، خوش خوش اور چونچال نمودار ہوا۔ وہ دوڑتا ہوا آ کر گاڑی میں چڑھ گیا اور ماں کے پاس بیٹھ گیا۔

ناظم کی ماں اور فاطمہ کی ماں آب تربت لے کر گاڑی کے پاس آ گئیں۔ ناظم کی ماں نے رمضان کی ماں کا منھ کھولا اور فاطمہ کی ماں نے بڑھیا کے حلق میں ایک چمچ آب تربت ٹپکایا۔ گاڑی کی دوسری طرف بڑا سا عمامہ باندھے کھڑا بزرگ جلدی جلدی دعائیں پڑھتا رہا۔

اسلام اور کدخدا گاڑی بان کی جگہ پر بیٹھ گئے اور باری باری چلم بھرنے لگے۔ بیل کے رہنے والے گاڑی کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے تالاب کے کنارے تک آ کر ٹھہر گئے۔ رمضان نے مڑ کر ان پر نگاہ ڈالی۔ بیل کے لوگ زیر لب دعا کر رہے تھے۔

جب وہ گاؤں سے باہر آئے تو سڑک روشن تھی۔ پاپاخ ان سے سو قدم پیچھے دوڑا آ رہا تھا۔ چاند نے درختوں کے پیچھے رک کر گاڑی پر نظریں جما دیں۔ گھنٹیوں کی آواز دور سے سنائی دے رہی تھی۔ وہ تھوڑی دور گئے ہوں گے کہ چاند ڈھلنے لگا، نیچے آ گیا اور بڑا دکھائی دینے لگا۔ رمضان نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ بیل نے، تو انتظار کھڑے تھے اور ان کے لیے دعا کر رہا تھا۔

۲

اسلام اور کدخدا نے بیٹھ کر لگام ڈھیلی چھوڑ دی تھی اور گھوڑا خود بخود چلا جا رہا تھا۔ رمضان ماں کے پہلو میں لیٹ گیا تھا اور ہاتھ ماں کے سر کے نیچے رکھ لیا تھا۔ ہر چند منٹ کے بعد وہ جھک کر اس کا شانہ ہلاتا اور کہتا: "ماں، اماں، اب ٹھیک ہو؟"

بڑھیا جس کے سینے کو عجیب سا درد جکڑے ہوئے تھا جس سے وہ کراہ رہی تھی، آہستہ سے کہتی: "ہاں، ٹھیک ہوں۔"

Scanned with CamScanner

اور رمضان خوش ہو جاتا۔

کدخدا پُرسکون اور آسودہ بیٹھا سوچ رہا تھا کہ رات اب تھوڑی ہی رہ گئی ہے۔ ایک بار رمضان کی ماں کی آواز بلند ہوئی، وہ کہہ رہی تھی: "میرا سر اوپر اٹھاؤ، میرا سر اوپر اٹھاؤ!"

رمضان نے اس کے سر کو سہارا دے کر اوپر اٹھایا۔ رمضان کی ماں آنکھیں کھول کر بیابان اور اندھیرے کو تکنے لگی۔

رمضان بولا: "کیا چاہیے، اماں؟ اماں جان کیا چاہیے؟"

رمضان کی ماں بولی: "میں جاننا چاہتی ہوں کہ یہ کیا ہے۔"

رمضان نے کہا: "کیا؟"

اسلام اور کدخدا گردن پھیر کر ادھر دیکھنے لگے۔

رمضان کی ماں بولی: "یہ آواز جو آرہی ہے؟"

انھوں نے گاڑی روک لی۔ گھنٹیوں کی آواز دور سے سنائی دے رہی تھی۔ کدخدا نے اسلام کے پہلو میں ٹھوکا دے کر پوچھا: "سن رہے ہو؟"

اسلام بولا: "گھنٹیوں کی آواز ہے۔ خانہ بدوش پہاڑ کے پیچھے سے اتر رہے ہیں۔ ان کی پازیبیں اسی طرح چھن چھن کرتی ہیں۔"

کدخدا نے کہا: "نہیں، خانہ بدوش نہیں۔ ان کے آنے میں تو ابھی بہت دن ہیں۔"

اسلام بولا: "آہا، تو ضرور پوروسی ہوں گے۔ سنو، وہ درے کے نیچے سے گزر رہے ہیں اور اپنی چُرائی ہوئی بھیڑوں کو ساتھ لیے جا رہے ہیں۔"

کدخدا نے کہا: "پوروسی کبھی شور کرتے ہوئے نہیں گزرتے۔ سائے کی طرح آتے ہیں اور سائے کی طرح واپس چلے جاتے ہیں۔"

رمضان بولا: "مجھے پتا ہے، پاپاخ پیچھے پیچھے آرہا ہے، وہ رہا!"

اس نے انگلی سے اندھیرے میں اشارہ کیا۔

رمضان کی ماں رک رک کر بولی: "نہیں --- پاپاخ نہیں --- پاپاخ کے گلے میں --- گھنٹیاں نہیں ہیں۔"

آواز دور ہوتی گئی اور آخر ختم ہو گئی۔ کدخدا نے چابک اوپر اٹھایا اور گھوڑا دوبارہ چل پڑا۔

انھوں نے پھر کچھ راستا طے کیا۔ اسلام، جو کچھ نہ کچھ بات کرنا چاہ رہا تھا، کہنے لگا: "میں نے یہ آواز بہت دفعہ سنی ہے۔ اکیلا رہتا ہوں۔ رات کو چھت پر چلا جاتا ہوں اور بیٹھ کر سنتا رہتا ہوں۔ اس وقت یہ آواز زیادہ سنائی دیتی ہے۔"

رمضان نے اپنے بازو اپنی ماں کی گردن میں ڈال دیے اور بولا: "اماں جان، گھبراؤ مت۔ مشدی اسلام نے یہ آواز بہت سنی ہے۔ اب بس تھوڑی دور رہ گیا ہے۔ وہاں پہنچیں گے اور تم

ٹھیک ہو جاؤ گی۔"

بوڑھی عورت سسکی لے کر بولی: "مجھے پتا ہے میں مر جاؤں گی۔"

رمضان رونے لگا اور ماں کو زور زور سے بھینچ کر کہنے لگا: "نہیں، میں نہیں مرنے دوں گا، اماں جان، میں نہیں مرنے دوں گا۔"

اسلام گردن گھما کر بولا: "شور مت کرو۔ بس سڑک پر پہنچنے والے ہیں، پھر لاری مل جائے گی۔"

پھر کدخدا کی طرف دیکھ کر پوچھنے لگا: "کدخدا، یہ تمہارا رمضان کتنے سال کا ہے؟"

کدخدا بولا: "بارہ سال پورے ہو گئے ہیں۔"

اسلام نے کہا: "ماشاءاللہ، اتنا بڑا ہو گیا ہے اور روتا ہے۔ اور رونے کی کوئی بات بھی تو نہیں۔ پھر کس لیے روتے ہو؟"

رمضان بولا: "مجھے ڈر لگتا ہے۔ میری اماں مر جائے گی۔"

اسلام نے کہا: "تمہاری اماں نہیں مرے گی۔ ڈرو مت۔ لیکن آخر تو اسے مرنا ہی ہے۔ تب کیا کرو گے؟ ہم سب کی اماں مر چکی ہیں۔ میری، کدخدا کی۔ کیوں کدخدا؟ ٹھیک ہے نا؟ کیوں، رمضان کی ماں؟"

کسی نے جواب نہ دیا۔

سلام بولا: "کدخدا، شہر سے لوٹ کر اس کے لیے دلہن ضرور تلاش کرنا۔ گاؤں میں لڑکیاں بھری پڑی ہیں۔ درمشدی بابا کی بیٹی بھی تو ہے، سرخ سعید، گول مٹول۔۔۔"

اس نے اپنی بات پوری نہیں کی۔ گھنٹیوں کی آواز دوبارہ نزدیک، اور نزدیک ہو گئی تھی۔ چاروں کان لگا کر سننے لگے۔ کدخدا نے گاڑی روک لی۔

سلام نے کہا: "عباس کے باپ پر لعنت ہو۔ اس نے گاڑی کے نیچے گھنٹیاں باندھ دی ہیں۔"

وہ اتر کر گاڑی کے نیچے چلا گیا، ہر طرف ٹٹول کر دیکھا لیکن گھنٹیاں نہیں ملیں۔

وہ دوبارہ چل پڑے تو اسلام نے کہا: "پریشان مت ہو۔ ذرا اُجالا ہو جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ گھنٹیاں کہاں ہیں۔"

وہ آگے ہی آگے چلتے گئے۔ اجالا ہو گیا۔ گھنٹیوں کی آواز تھم گئی اور بڑی سڑک دور سے دکھائی دینے لگی۔

۳

سلام سڑک کے کنارے گاڑی میں بیٹھ کر انتظار کر رہا تھا کہ مسافروں کو کوئی لاری مل

جائے۔ لاری آ گئی تو اس نے چابک اٹھایا اور آندھی کی طرح بیل کی طرف روانہ ہو گیا۔

کدخدا اور رمضان نے ناں کو لاری میں سوار کر دیا اور چاولوں کی ایک بوری پر لٹا دیا۔ اس کی حالت اور بگڑ گئی تھی۔ اس کی پتلیاں دکھائی نہیں دیتی تھیں اور سانس رک رک کر آ رہی تھی۔ کدخدا ڈر رہا تھا کہ کہیں بڑھیا لاری ہی میں نہ چل بسے۔ وہ کسی نہ کسی طرح رمضان کو اس کی ماں کے پاس سے ہٹانا چاہتا تھا مگر رمضان اماں کے بے جان اور ڈھیلے ہاتھوں کو تھامے بیٹھا تھا اور اس کے پاس سے ہٹنے کو تیار نہ تھا۔ اس کی تھکی ہوئی آنکھوں میں نیند بھری تھی اور اسے بات بھی مشکل سے سنائی دے رہی تھی۔ نہ وہ ماں کو دیکھ رہا تھا نہ سڑک کے گرد و غبار کو، اور نہ گھنٹیوں کی آواز سن رہا تھا جو دور سے اور لاری کے ارد گرد سے کانوں میں پڑ رہی تھی۔

دوپہر کو لاری سڑک کے موڑ کے پاس سائے میں رک گئی جو پہاڑ کے کٹاؤ کی وجہ سے سڑک پر پڑ رہا تھا۔ کدخدا نے بوریوں پر دسترخوان بچھایا۔ رمضان نے روٹی کا ایک نوالہ توڑا اور دال سے بھر لیا، پھر ماں کے ہونٹ کھول کر اسے کھلانے کی کوشش کرنے لگا۔

کدخدا بولا: "وہ نہیں کھا سکتی۔ اسے چھوڑ دو۔"

ڈرائیور آیا اور اپنی سوجی ہوئی آنکھوں سے لاری کے کونے سے جھانک کر دیکھنے لگا۔ پوچھا: "کیا ہوا اسے؟"

کدخدا نے بتایا: "بیمار ہے۔"

ڈرائیور بولا: "کہاں لے جا رہے ہو؟ اسپتال؟"

کدخدا نے کہا: "ہاں۔ کیا کریں؟"

ڈرائیور بولا: "اسپتال میں کون پوچھتا ہے۔ اسے گاؤں ہی میں رہنے دیتے کہ سکون سے مر سکتی۔"

رمضان اور کدخدا نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ناں کی سانس اور ناہموار ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھیں ڈھیلوں میں الٹ گئی تھیں۔ ہری مکھیوں کا ایک غول اس کے ہونٹوں کے ارد گرد بیٹھا تھا۔

کدخدا بولا: "کاش ہم قرآن ساتھ لے آئے ہوتے۔"

رمضان روتے ہوئے کہنے لگا: "نہیں، نہیں، ناں نہیں مرے گی۔"

کدخدا نے کہا، "ہاں، ہاں، معلوم ہے۔"

ڈرائیور پوچھنے لگا: "اس کا بیٹا ہے؟"

کدخدا دسترخوان سمیٹتے ہوئے بولا: "ہاں، اس کا بیٹا ہے۔ اور میرا۔"

ڈرائیور نے سر ہلایا اور کہا: "آج کل لڑکے ماں کے مرنے کا غم کم ہی کرتے ہیں۔ میں بھی اس لڑکے کی طرح تھا۔ میری ماں دس سال پہلے مری تھی۔ مگر میں اب تک اسے بھول نہیں سکا۔"

پھر رمضان کی طرف دیکھ کر بولا: "گھبراؤ مت۔ اسے کچھ نہیں ہوگا۔ مرے گی نہیں۔ میں

Scanned with CamScanner

تمہیں ایک اچھے اسپتال میں لے چلتا ہوں۔ وہاں اچھی دیکھ بھال ہوتی ہے۔ وہاں یہ اٹھ کھڑی ہوگی اور چلنے لگے گی۔'

رمضان کھڑا ہوا، پھر بیٹھ گیا اور آنسو پینے کی کوشش کرنے لگا۔ دھوپ ترچھی پڑ رہی تھی اور اس کے قدموں کے بیچ کالے رنگ کی بیلوں والی ایک بڑی سی وادی نے منہ کھول رکھا تھا۔ رمضان بولا: 'دیکھو بابا، سنا تم نے؟ وہی آواز!'

کدخدا نے گھنٹیوں کی آواز سنی۔ ڈرائیور نے پوچھا: 'کیا کہہ رہے ہو؟'

رمضان بولا: 'تم نہیں سن رہے؟ گھنٹیوں کی آواز نہیں سن رہے؟'

ڈرائیور بولا: 'گھنٹیوں کی آواز؟ اس طرف تو مجھے کبھی سنائی نہیں دی۔ کبھی کبھی جھینگر سڑک کے کنارے آ کر جمع ہو جاتے ہیں۔ مگر وہ بھی رات کے وقت، اس وقت تو دوپہر ہے۔'

لاری چلی تو جھینگروں کی آواز آنی بند ہو گئی۔

۳

اسلام بیل میں داخل ہوا تو لوگ تالاب کے گرد جمع تھے۔ اسلام گاڑی سے اتر کر ہجوم کی طرف گیا اور بولا: "گئے۔"

مشدی بابا جو بید کے نیچے بیٹھا تھا، کہنے لگا: 'بڑھیا مر رہی ہے۔ مگر کدخدا کی کھال موٹی ہے۔ اسے کچھ نہیں ہوگا اور وہ گاؤں واپس آ جائے گا۔ لیکن وہ بچہ، خدا جانے اس پر کیا گزرے گی۔'

بابا علی نے لوگوں کے درمیان سے کہا: 'اگر تعویذ لے لیتے تو ٹھیک ہو جاتی۔'

مشدی صفر کا بیٹا مشدی جعفر بولا: 'کچھ نہیں ہوگا۔ بڑا ہو گیا ہے، اپنے پیشاب کی دھار سے جنگل بنا لیتا ہے۔ پلک جھپکتے میں ماں کو بھول جائے گا اور دوسرے خیالوں میں پڑ جائے گا۔'

اسلام نے کہا: 'نہیں مشدی بابا، ہر کوئی کہتا ہے کہ رمضان کی ماں مرنے والی ہے۔ اس کے بعد کدخدا بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر گاؤں لوٹ آئے گا۔ رمضان اپنی ماں کی وجہ سے بے چین ہے۔ اس وقت میں کدخدا تمہارے گھر آئیں گے اور تمہاری بیٹی کا رشتہ مانگیں گے۔ جب سے بیوی مل جانے کی توقع ہے کا گھر بسا تا رہے گا۔'

عورتیں جو تالاب کی دوسری طرف جمع تھیں، آپس میں سرگوشیاں کرنے لگیں۔ مشدی بابا کی بیٹی جو کچھ ہی دنوں پہلے بی بی آغا کی زیارت سے ہوئی تھی، دوسری عورتوں کے پیچھے چھپ گئی۔

مشدی بابا نے پوچھا: "کدخدا خود کہہ گیا تھا؟"

اسلام بولا: 'نہیں، میں نے کہا تھا، اس نے بھی قبول کیا۔ وہ واپس آ جائیں تو پھر میں اور کدخدا آئیں گے تمہارے گھر۔'

Scanned with CamScanner

مشدی بابا نے کہا: "سب کام خدا کے ہاتھ میں ہیں۔"

اسلام گاڑی پر سوار ہوا اور اسے چلاتا ہوا گاؤں سے باہر چلا گیا۔ عورتیں دالان میں بیٹھ گئیں۔ مشدی بابا نے اپنی چلم بھری اور خیالوں میں گم ہو گیا۔ اس کی بیٹی دیوار کے ساتھ ساتھ دوڑتی ہوئی گھر چلی گئی اور گھر میں آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر اپنی آنکھوں میں سرمہ لگانے لگی۔

۵

اسپتال کے دربان نے دروازہ کھولا۔ کدخدا اپنی بیوی کو گود میں لیے زمین پر بیٹھا تھا۔ رمضان، جو دروازے سے ٹیک لگائے اس کے کھلنے کا انتظار کر رہا تھا، دوڑ کر اندر گھس گیا۔

دربان نے غصے سے پوچھا: "کہاں؟"

کدخدا بولا: "میری بیوی، اس کی ماں، مر رہی ہے۔"

رمضان رو پڑا۔ وہ سر سے پیر تک گرد میں اٹے ہوئے تھے۔ دربان نے دروازہ چوپٹ کھول دیا۔ وہ ایک اندھیری اور سیلی ہوئی ڈیوڑھی میں داخل ہوئے۔ انھوں نے بڑھیا کو، جو آنکھیں کھولے تیسری سانسیں لے رہی تھی، ایک بنچ پر لٹا دیا۔

دربان بولا: "بہتر ہوگا کہ اسے کہیں اور لے جاؤ۔ اسپتال میں ایسے مریضوں کو نہیں لیتے۔"

رمضان اور زور زور سے رونے لگا۔

کدخدا بولا: "کہیں اور کہاں؟"

دربان نے کہا: "تمھیں پتا ہے، ہمارے اسپتال میں لاش لے جانے والی چارپائی اور گاڑی اور ایسی چیزیں نہیں ہیں۔ بس کچھ کمرے ہیں اور ایک ڈاکٹر۔ اگر یہ ٹھیک نہ ہوئی تو اس کا کیا کرو گے؟ کیسے لے جاؤ گے؟"

کدخدا اور رمضان دونوں اس کی منت کرنے لگے۔

دربان بولا: "ٹھیک ہے۔"

وہ رمضان کی ماں کو اٹھا کر ایک بڑے سے احاطے میں لے آئے اور اس سے گزر کر ایک اور ڈیوڑھی میں، اور پھر سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچے۔ سیڑھیوں پر میلی چادریں، خون آلود روئی اور لال دوا پڑی ہوئی تھی۔

ایک دبلی پتلی عورت سفید قمیص پہنے، دو بچوں کو ساتھ لیے اور ایک کو گود میں اٹھائے، زینے کے پاس کھڑی تھی۔ انھیں دیکھ کر بولی: "اس میت کو اوپر کس لیے لا رہے ہو؟"

کدخدا نے کہا: "اوپر لانے دو۔ ابھی زندہ ہے۔"

رمضان اونچی آواز میں رو رہا تھا۔ عورت نے آگے بڑھ کر بڑھیا کی آنکھوں پر نظر ڈالی اور بولی: "ختم ہو گئی۔"

Scanned with CamScanner

رمضان کی ماں نے ایک لمبا سانس لیا۔ عورت بولی: بہت اچھا، اسے لے آؤ اوپر۔ ہمیشہ مریضوں کو ایسی حالت میں لاتے ہیں کہ سہارے کا ہاتھ میں کچھ نہیں رہ جاتا۔

دروازہ کھلا اور ایک کمرہ نظر آیا جس کی چھت سے لالٹین لٹک رہی تھی اور اس میں بہت ذرا سی بتی جل رہی تھی۔ ایک مدھم سا چراغ بھی طاقچے میں رکھا تھا۔ کمرے کے تین کونوں میں تین خالی چارپائیاں رکھی تھیں جن پر چادریں اور گندمی روئی پڑی تھی۔

دربان نے نرس سے کہا: چراغ پھر جلا دیا؟

نرس بولی: ڈرتی ہوں لالٹین میں تیل ختم ہو گیا تو اندھیرے میں رہ جائیں گے۔

رمضان کی ماں کو چارپائی پر لٹا دیا گیا۔ رمضان اور کدخدا باہر آ کر کمرے کے دروازے کے پاس بیٹھ گئے

دربان بولا: "بیٹھ کیوں گئے؟ چلو، ڈاکٹر کو خبر کریں اور لے کر آئیں۔

کدخدا اٹھ کر دربان کے ساتھ باہر چلا گیا۔

رمضان اٹھا اور اپنی ماں کے پاس آ کر اس کی آنکھوں کو غور سے دیکھنے لگا جو لالٹین پر جمی ہوئی تھیں، پھر خود سے بولا: "اب ٹھیک ہو رہی ہے۔ چراغ کو دیکھ رہی ہے۔"

نرس نے پوچھا: کب سے بیمار ہے؟

رمضان بولا: معلوم نہیں۔ ہم مشہدی اسلام کی گاڑی میں بڑی سڑک تک لائے وہاں سے لاری میں یہاں لے آئے۔

نرس کے پیچھے دروازے کے پاس کھڑے بڑھیا اور اس کے بیٹے کو دیکھ رہے تھے اور بڑھیا کے ہاتھ کو جو بے حرکت اور ساکت چارپائی کی پٹی سے لٹک رہا تھا۔

۶

کدخدا اور دربان پہلی ڈیوڑھی میں داخل ہوئے۔ پھر دوسرے کونے میں بنے ہوئے زینے سے چڑھ کر اوپر گئے اور ایک چوکور کمرے میں پہنچے جس کی دیوار کے بیچ میں ایک گول کھڑکی تھی جو ایک بڑے سے چوک میں کھلتی تھی۔ دربان نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

ایک آدمی نے کھانستے ہوئے پوچھا: کون ہے؟ ارے کون ہے؟

دربان بولا: "ایک مریض کو لائے ہیں۔"

ایک دبلا پتلا آدمی پھٹے ہوئے سوتی جوتے اور سفید قمیص پہنے باہر آیا۔ اسٹیتھوسکوپ مڑا تڑا اس کی جیب میں ٹھنسا ہوا تھا۔ باہر آ کر اس نے کدخدا کو گھور کر دیکھا اور کہنے لگا: یہ تو مریض نہیں لگتا۔"

دربان بولا: مریض نیچے ہے۔ آذر کے کمرے میں۔

ڈاکٹر نے اپنی بھنویں سکیڑیں اور کہا: "وہاں کیوں لے گئے؟ مجھ میں بار بار اس غلیظ گڑھے میں جانے کی ہمت نہیں ہے۔"

پھر وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آیا۔ کدخدا اور دربان بھی اس کے پیچھے پیچھے تھے۔ وہ پہلی ڈیوڑھی، احاطے اور دوسری ڈیوڑھی سے گزر کر سیڑھیوں سے اوپر پہنچے۔ آذر جو بچے کو گود میں اٹھائے دروازے کے سامنے کھڑی تھی، ایک طرف ہو گئی۔ دوسرے دو بچوں نے، جو کمرے کے بیچ میں ایک ہڈی کو چوس رہے تھے، مڑ کر دیکھا۔ دربان ڈر کے مارے کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہو۔

ڈاکٹر نے آذر سے کہا: "پھر لے آئیں بچوں کو اسپتال میں؟ باہر نکالو انھیں!"

آذر نے اشارہ کیا۔ بچے ہڈی کو وہیں زمین پر ڈال کر راہداری میں چلے گئے۔ آذر خود بھی جا کر دروازے کے پیچھے کھڑی ہو گئی اور جھری میں سے ماشین کو دیکھنے لگی۔ ڈاکٹر نے آگے بڑھ کر رمضان کی ماں کے اوپر سے لحاف ہٹایا۔ اسے جانی پہچانی مکھیاں دکھائی دیں جو مریضہ کے منہ پر بھنک رہی تھیں۔ آنکھیں خشک تھیں اور آخری وقت کا غبار بڑھیا کی نگاہ میں تیر رہا تھا۔

ڈاکٹر نے کدخدا اور اس کے بیٹے سے کہا: "تم دونوں بھی باہر جاؤ۔"

رمضان، کدخدا اور دربان باہر چلے گئے۔

دربان بولا: "حالت بہت خراب ہے۔"

کدخدا دربان کو ایک طرف لے گیا اور بولا: "اگر بڑھیا مر گئی تو لڑکا خود کو مار ڈالے گا۔ اتنا میں جانتا ہوں۔ پھر کیا کیا جائے؟"

دربان نے کہا: "تمھیں یقین ہے؟"

کدخدا بولا: "ہاں، دس دن رات سے ماں کے پاس سے نہیں ہٹا۔ مجھے معلوم ہے بڑھیا کے دن پورے ہوئے۔ تمھاری منت کرتا ہوں۔ ایسا کرو کہ لڑکے کو پتا نہ چلے۔"

دربان نے کہا: "ٹھیک ہے۔"

کمرہ خالی ہوا تو ڈاکٹر نے مریضہ کا سینہ کھولا۔ بوڑھی عورت کا سبز بدن سرد پڑ چکا تھا

ڈاکٹر نے کان اس کے دل پر لگا کر سنا۔ دل کی حرکت بند ہو چکی تھی لیکن بہت مدھم اور سمجھ میں نہ آنے والی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ڈاکٹر برہم ہو کر مڑا اور دروازہ کھول کر نرس سے بولا: "کتنی دفعہ کہا ہے کہ جب میں مریض دیکھ رہا ہوں، بچوں کے ہاتھ میں کھلونے مت دیا کرو!"

آذر نے، گلی سے بچوں کو اشارہ کیا جو سیڑھیوں پر بیٹھے تھے۔ ڈاکٹر دوبارہ کمرے میں لوٹ گیا اور کان پھر مریضہ کے سینے پر لگا کر سننے لگا۔

گھنٹیوں کی آواز آہستہ آہستہ دور ہٹتی جا رہی تھی اور ۔۔۔ دور بیابان میں پہنچ کر ختم ہو گئی۔

۷

مشدی بابا کی بیٹی سرمہ لگا کر چھت پر آ بیٹھی۔ بیل کے رہنے والوں میں کوئی بھی باہر نہیں تھا۔ پاپاخ کدخدا کے گھر کی دیوار پر بیٹھا تھا اور بازوؤں پر سر رکھے سو رہا تھا۔

مشدی بابا کمرے میں لیٹا اپنی مہندی رنگی داڑھی کے بالوں سے کھیل رہا تھا اور چھت کے موکھے میں سے اپنی بیٹی کے گورے شلوکے کو دیکھ رہا تھا۔

اسلام گاڑی پر سوار گاؤں میں داخل ہوا۔ تالاب کے پاس جا کر اس نے پانی کا برتن بھرا اور گھوڑے کے آگے رکھ دیا۔ گھوڑا پانی پینے لگا۔ سلام کی کالی بکری کھڑکی میں سے باہر آئی اور گاڑی کے پاس آ کر اس کے پہلوؤں پر لگی کچھ کچی ہوئی پتیوں کو چاٹنے لگی۔ رات اتر رہی تھی۔ سب انتظار میں تھے۔ کھڑکیوں میں سے سر نکال نکال کر غور سے سننے کی کوشش کرتے تھے۔

سرگ سنسان پڑی تھی۔

مشدی بابا کی بیٹی، اداس، چھت کی منڈیر کے پاس بیٹھی تھی۔

۸

رمضان خوش خوش دربان کی کوٹھری میں روٹی اور دہی کھا رہا تھا۔ اس کی ماں ساکت ہو چکی تھی اور رو نہیں رہی تھی۔ اس کے چہرے پر چادر کھینچ دی گئی تھی۔ دربان نے بتایا تھا کہ اس کا آپریشن ہوگا تاکہ وہ چلنے پھرنے لگے اور اس لیے یہ طے ہوا تھا کہ کل صبح اسے دوسرے اسپتال لے جائیں گے۔

دونوں دربان کی کوٹھری میں ٹھہرے تھے۔ رمضان کھانا کھاتے ہی لیٹ کر سو گیا۔ لیکن دربان اور کدخدا آدھی رات تک آہستہ آہستہ باتیں کرتے رہے۔ دربان کدخدا کو ان معاملوں کی اونچ نیچ سمجھاتا رہا۔

پھر انھوں نے بتی بجھا دی اور لیٹ رہے۔ باہر ہوا چل رہی تھی اور اس کے زور سے بادام کے درختوں کی شاخیں کھڑکیوں کے شیشوں سے رگڑ کھا رہی تھیں۔

صبح ہوتے ہی دربان اور کدخدا اٹھ بیٹھے۔ وہ دبے پاؤں کوٹھری سے باہر نکلے اور رمضان کی ماں کو آدر کے کمرے سے نیچے لے آئے اور ڈیوڑھی کی ایک بنچ پر لٹا دیا۔ پھر وہ دروازہ کھول کر باہر گلی میں جا کھڑے ہوئے اور ابھی میت کو قبرستان لے جانے کے لیے ٹیکسی کے انتظار میں تھے کہ رمضان اٹھ کر باہر آ گیا

دربان بولا: "تمھاری ماں کو دوسرے اسپتال بھیج رہے ہیں جہاں آپریشن ہوگا۔"

رمضان بولا: "میں بھی ساتھ جاؤں گا۔"

دربان نے کہا: "وہاں تمھیں نہیں جانے دیں گے۔"

رمضان بولا: "نہیں جانے دیں گے تو واپس آ جاؤں گا۔"

ایک سیاہ رنگ کی ٹیکسی آئی۔ دربان اس کے ڈرائیور سے کرایہ طے کرنے لگا۔ کدخدا رمضان کی ماں کو اٹھا لایا اور سوار ہو گیا۔ دربان بھی کدخدا کے برابر میں بیٹھ گیا۔

ٹیکسی چل پڑی۔ دربان انھیں دیکھتا رہا۔ جب وہ سڑک پر پہنچے تو سورج اوپر اٹھ آیا تھا۔

ڈرائیور مڑ کر بولا: "تم نے مریض کو یوں گٹھری کیوں بنا رکھا ہے؟ کیا یہ --- کیا یہ؟"

کدخدا نے کہا: "ہم گلی کے کونے پر اتر جائیں گے۔ کوچہ بنفشہ زار کے کونے پر۔"

ڈرائیور کچھ نہ بولا اور گاڑی چلاتا رہا، چلاتا رہا، اور ایک چھوٹے سے سنسان چوک میں رک گیا۔ وہ اتر گئے۔ ان کے سامنے ایک لمبی گلی تھی جو گرد و غبار سے بھری ہوئی تھی۔ سیاہ پتھر کی ایک سل گلی کے کونے پر رکھی تھی۔ سل کے اوپر ایک چھوٹا سا علم لگا ہوا تھا جس کے اوپر والے سرے پر تانبے کا بنا ہوا پنجہ تھا۔

کدخدا نے رمضان سے کہا: "تم یہیں بیٹھو۔ ہم تمھاری اماں کو پہنچا کر ابھی آتے ہیں۔"

رمضان بولا: "میں بھی ساتھ چلوں گا۔ میں اماں کو دیکھنا چاہتا ہوں۔"

اس نے ہاتھ بڑھا کر مردہ عورت کے ہاتھ کو لحاف سے باہر نکال کر تھامنا چاہا۔

کدخدا بولا: "ہاتھ مت لگاؤ۔ اٹھ جائے گی تو اچھا نہیں ہوگا۔ تم یہیں ٹھہرو۔ اگر تم ساتھ آؤ گے تو وہ ہمیں بھی نہیں جانے دیں گے۔ پھر کیا کریں گے؟"

رمضان پتھر کی سل پر بیٹھ گیا۔ روٹی اور دہی کی تھیلی اپنے زانو پر رکھ لی۔ کدخدا رمضان کی ماں کو پیٹھ پر اٹھائے گلی میں داخل ہو گیا۔ اماں کے پیر، جو کالے پڑ گئے تھے، لحاف میں سے باہر نکلے ہوئے تھے۔ اس کے پیر کی لمبی انگلیاں کھل گئی تھیں اور گلی کی نرم خاک پر لکیریں بناتی جا رہی تھیں۔

رمضان ان لکیروں کو دیکھنے لگا جو اس کے باپ کے آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ لمبی ہوتی جا رہی تھیں۔ دھوپ تیز اور گرم تھی۔ متعفن ہوا چل رہی تھی اور اس سے رمضان کے سر کے اوپر لگا ہوا علم لہرا رہا تھا۔ گلی میں پہیوں اور گھنٹیوں کی آوازیں گونجیں۔ رمضان ایک کونے میں ہو گیا۔

ایک کالی گھوڑا گاڑی نمودار ہوئی جسے دو چاق و چوبند گھوڑے کھینچ رہے تھے۔ گاڑی کے پہلوؤں پر چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں جڑی ہوئی تھیں۔ گاڑی چوک میں پہنچ کر ٹھہر گئی۔ گھوڑے ستانے لگے، پھر بڑی سڑک کی طرف روانہ ہو گئے اور گھنٹیاں پھر بجنے لگیں۔

جب گاڑی چوک سے باہر نکل رہی تھی تو اس کے پردوں میں سے ایک بڑی سی سبز موم بتی نکل کر گر پڑی۔ پہیے گھومتے ہوئے اس کے پاس سے گزر گئے۔

۹

اسلام اور مشدی بابا گاڑی میں سوار تھے۔ مشدی بابا کی بیٹی، آنکھوں میں سرمہ لگائے، گاڑی

Scanned with CamScanner

کے دوش پر بیٹھی تھی۔ وہ بڑی سڑک کے کنارے پہنچ کر انتظار کر رہے تھے۔

سلام بولا: "میرا خیال نہیں ہے کہ انہیں زیادہ دیر لگے گی۔ بڑھیا کی حالت بہت خراب تھی۔ جب سے لاری میں سوار کرا رہے تھے تو جاں نکل ہی چکی تھی۔ بہرحال، اب آتے ہی ہوں گے۔"

مشدی بابا نے کہا: "کدخدا نیک آدمی ہے۔ جب تک کفن دفن کا انتظام نہ ہو جائے واپس نہیں لوٹے گا۔"

سڑک خالی اور سنسان تھی۔ مشدی بابا کی بیٹی سرمہ بھری آنکھوں سے شہر کی طرف تک رہی تھی۔

سلام یک دم مڑا اور سڑک کی سطح کو دیکھنے لگا۔ دو گندے چوہے آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے۔ اسلام گاڑی سے اتر آیا۔ چوہے راستہ بدل کر چکر کاٹتے ہوئے بیل کی طرف چلے گئے۔

سلام ہاتھ میں چابک لیے چوہوں کی طرف بڑھا۔ آگے والے چوہے کے منہ میں ایک بڑی سی سبز موم بتی دبی ہوئی تھی۔

اسلام نے ہنس کر مشدی بابا کو آواز دی۔ مشدی بابا بھی اسلام کے برابر میں آ کھڑا ہوا۔ دونوں جھک کر دیکھنے لگے۔

اسلام بولا: "دیکھو ان حرام زادوں کو۔ موم بتی کو بیل لے جا رہے ہیں۔"

مشدی بابا نے کہا: "ایک موم بتی لاتے ہیں اور بدلے میں دو گاڑی اناج کھا جاتے ہیں۔"

اسلام چوہوں کو لاتیں مارنے لگا۔ آگے والے چوہے کے منہ سے موم بتی گر گئی اور وہ بھاگ نکلا۔ دوسرا اسلام کے پیروں کے نیچے آ کر کچلا گیا۔

مشدی بابا نے موم بتی اٹھائی، اسے غور سے دیکھا، سونگھا اور کہا: "اس کا کیا کریں؟"

اسلام بولا: "اسے لڑکی کو دے دیتے ہیں۔ وہ اسے اپنی شادی کی رات کے لیے سنبھال کر رکھ لے گی۔ کیوں؟"

مشدی بابا نے کہا: "ہاں، یہ ٹھیک ہے۔"

انھوں نے واپس آ کر موم بتی لڑکی کو دی، اپنی چلمیں بھریں اور بیٹھ کر سوچنے لگے۔

۱۰

کدخدا نے سب کچھ کر کے دیکھ لیا مگر رمضان گاؤں لوٹنے پر راضی نہ ہوا۔ پتھر پر بیٹھا رہا اور یہی کہتا رہا: "ٹھہرو، اماں بھی آ جائے، پھر چلیں گے۔"

کدخدا بولا: "اماں ابھی نہیں آئے گی۔ دس دن بعد آئے گی۔"

رمضان نے کہا: "تو دس دن بعد چلیں گے۔"

کدخدا بولا: "اور گاؤں کے کاموں کا کیا ہوگا؟"

رمضان نے کہا: "تم چلے جاؤ۔ میں یہیں انتظار کروں گا۔"

کدخدا بیٹھ کر پسینا پونچھنے لگا۔ بڑھیا کے کپڑے اس کی بغل میں دبے ہوئے تھے۔ پھر یک دم اٹھ اور کہنے لگا: "سنو، یہاں بیٹھنا ٹھیک نہیں۔ اسپتال کے دربان کے گھر چل کر انتظار کرتے ہیں۔"

دونوں اٹھ کر دربان کے پاس آئے۔ دربان نے بھی اسپتال کے دروازے کے سامنے جھاڑو دے کر چھڑکاؤ کیا تھا۔ اب دروازے کے سامنے کرسی ڈالے بیٹھا کاہو کھا رہا تھا۔

کدخدا بولا: "اسے اسپتال پہنچا آئے۔"

یہ کہہ کر اس نے دربان کو آنکھ سے اشارہ کیا اور کہتا رہا: "کہتے ہیں دس دن بعد چھٹی ملے گی۔ مگر رمضان گاؤں واپس جانا نہیں چاہتا۔"

رمضان بولا: "تم جاؤ۔ میں اماں کے ساتھ آؤں گا۔"

دربان نے کہا: "ٹھیک ہے کدخدا، تم جاؤ۔ رمضان یہیں ٹھہر جائے گا اور میرا ہاتھ بٹائے گا۔ ایک ہفتے بعد اسے بھیج دوں گا۔"

کدخدا نے رمضان کی ماں کے کپڑے اٹھائے، رمضان کی واپسی کا کرایہ دربان کو دیا اور دربان سے وعدہ لیا کہ وہ ایک ہفتے بعد رمضان کو بیل روانہ کر دے گا۔

رمضان اور دربان اندر چلے گئے۔ دربان بولا: "جب تک تمہاری اماں نہیں آتی، تم یہیں، اسی کمرے میں ٹھہرو گے۔"

رمضان نے روٹی اور دہی کی تھیلی دربان کی چارپائی کے نیچے رکھ دی اور کھڑکی کے پاس جا بیٹھا۔ دربان نے رمضان کی واپسی کا کرایہ لالٹین کے نیچے چھپا دیا اور بستر پر جا کر سو گیا۔ رمضان باہر آ کر دروازے کے پاس کرسی پر بیٹھ گیا اور کاہو کھانے لگا۔

۱۱

کدخدا گاؤں میں داخل ہوا۔ اسلام گاڑی کو تالاب کے کنارے کھڑا کر کے دھو رہا تھا۔ پاپاخ نے دیوار پر سے چھلانگ لگائی اور بھونکتا ہوا کدخدا کے قریب آ کر اس کی بُو سونگھنے لگا۔ مشدی بابا کی بیٹی چھت پر چڑھ گئی اور دیکھنے لگی کہ کدخدا آ گیا ہے اور اسلام سے باتیں کر رہا ہے۔ وہ نیچے اتری، برتن اٹھائے، تیزی سے گلیوں میں سے گزرتی ہوئی تالاب تک پہنچی اور برتن دھونے اور پانی بھرنے میں مشغول ہو گئی۔

اسلام نے پوچھا: "رمضان کیوں نہیں آیا؟"

کدخدا بولا: "کہتا ہے جب تک اماں نہیں آئے گی، میں بھی نہیں آؤں گا۔"

اسلام ٹھہر گیا، یک ٹک مچھلیوں کو گھورنے لگا، پھر بولا: "آخر کب آسکے گا؟"

کدخدا نے کہا: "دربان نے کہا ہے کہ ایک ہفتے بعد اسے بھیج دوں گا۔"

مشدی بابا کی بیٹی نے حساب لگایا: "ایک ہفتے میں کے دن ہوتے ہیں؟" اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

اسلام بولا: "کاش تم اسے ساتھ لے آئے ہوتے! تمہیں معلوم ہے یہاں کچھ لوگ اس کا انتظار کر رہے ہیں؟"

اس نے مشدی بابا کی بیٹی کی طرف اشارہ کیا۔

دونوں نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ مشدی بابا کی بیٹی اٹھ کھڑی ہوئی، برتن سمیٹے اور چل دی۔

گلی میں داخل ہوا تو اس نے پاپاخ اور اسلام کی کالی بکری کو دیکھا جو حیرت سے اسے گھور رہے تھے۔

۱۲

دربان رات کو سو جاتا تھا اور صبح سویرے جب کوئی مریض آکر دروازہ کھٹکھٹاتا تو جاگ اٹھتا اور جا کر دروازہ کھولتا۔ دربان نے کدخدا سے قول دیا تھا کہ ایک ہفتے بعد رمضان کو جلد واپس بھیج دے گا۔ پچھلے دن اس نے رمضان سے کہا: "میں نے حساب لگا لیا تھا۔ تمہاری ان کی چھٹی اتنی جلدی نہیں ہوگی۔ تمہارے بابا نے مجھے اس کے لیے اور پیسے نہیں دیے ہیں۔ تم کل گاؤں جا کر کچھ اور پیسے لے آؤ۔"

رمضان مان گیا اور طے ہوا کہ صبح سویرے اسپتال سے روانہ ہو جائے گا۔ رات ہمیشہ کی نسبت جلدی اتر آئی۔ دربان اور رمضان بھی وقت سے پہلے کوٹھری میں چلے گئے اور سونے کے ارادے سے دروازہ بند کر لیا۔ تیز ہوا چل رہی تھی۔ انہیں تھوڑی دیر بعد کھڑکی میں جھک کر اپنے بچوں کو پکارنے کی آواز سنائی دی۔ "دیکھ رہے ہو، ہوا کیا کر رہی ہے؟"

ہوا جاتے میں بکھری ہوئی کتابیں اور خون آلود روئی کو سمیٹ کر اڑا اڑا کر باہر لے جا رہی تھی۔

دربان رات کا کھانا کھانے کے بعد کمبل اوڑھ کر سو گیا۔

رمضان دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور درختوں کی شاخوں کو کھڑکی کے شیشے پر رگڑ کھاتے ہوئے دیکھنے لگا۔

آوازیں ایک دوسرے میں گھل مل گئی تھیں اور ہر چند منٹ بعد اوپر کی منزل سے ڈاکٹر کے دروازہ کھولنے، کھانسنے اور گالیاں دینے کی آوازیں آتی تھیں۔ رمضان کو یہ آوازیں سنتے سنتے نیند آگئی۔

Scanned with CamScanner

آدھی رات کا وقت ہوگا کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔ آور آ رہی تھی۔ جانی پہچانی آواز آ رہی تھی۔ ہوا کے ساتھ ساتھ گھنٹیوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ سننے لگا۔ آواز قریب، اور قریب ہوتی گئی اور پھاٹک کے باہر آ کھڑی ہوئی۔ پھر کوئی ہاتھ آہستہ سے دروازے کی چٹخنی پر پڑا اور نرمی سے کھٹکھٹانے لگا۔ رمضان نے دیکھا۔ دربان کی آنکھ نہیں کھلی تھی۔ اس نے کوٹھری کا دروازہ کھولا اور ڈیوڑھی میں چلا گیا۔ اسے ڈاکٹر کی آواز سنائی دی جو اپنے بستر پر بیٹھا کھانس رہا تھا۔

رمضان آگے بڑھا۔ پھاٹک کے پیچھے سے کسی کے سانس لینے کی آواز آ رہی تھی۔ پھاٹک کھولا تو اسے اپنی ناں دکھائی دی جو نیا نویلا لباس پہنے تھی۔ رمضان خوش ہو کر باہر نکلا اور اپنی ناں کا ہاتھ تھام لیا۔ دونوں تیز قدموں سے چلتے ہوئے دور نکل گئے۔ ہوا اور تیز چلنے لگی اور انھیں آگے کو دھکیلنے لگی۔ دور سے دوسری گھنٹیوں کی آوازیں آنے لگیں۔

رمضان نے پوچھا: "ناں ہم کہاں جا رہے ہیں؟ بیل؟"

ناں بولی: "نہیں، بیل نہیں۔ بنفشہ زار۔"

۱۳

اگلی صبح کدخدا، اسلام اور مشدی بابا گاڑی میں سوار ہوئے اور سڑک کے کنارے جا کر انتظار کرنے لگے۔

پاپاخ اور اسلام کی بکری بھی گاڑی کے پاس آ کھڑے ہوئے۔ بیل کے رہنے والے ہر چند گھنٹے بعد گھروں سے باہر آتے، تالاب کے کنارے جا کر نگاہ ڈالتے اور واپس چلے جاتے۔

غروب کے آس پاس مشدی بابا نے ترشی سے پوچھا: "آیا تو نہیں؟ تم کہتے تھے آئے گا؟"

کدخدا نے مضطرب ہو کر جواب دیا: "کہتا تو یہی تھا کہ بھیج دوں گا۔ ابھی تک تو کچھ پتا نہیں۔"

جب رات ہوئی تو مشدی بابا کی بیٹی چھت سے نیچے اتر آئی، بڑی سی موم بتی جلائی اور باہر نکل آئی۔ وہ اسے لے کر پہاڑی کی طرف چل دی کہ اسے نشان گاہ پر روشن کر سکے۔

○○

(فارسی عنوان: "هزاداران بیل")

جمال میر صادقی

فارسی سے ترجمہ: نیر مسعود

کنکریٹ کے انباروں کے ادھر

ایک دن صبح عارفی صاحب دفتر جانے کے لیے گھر سے نکلے تو اُن کے ساتھ یہ عجیب معاملہ پیش آیا۔

عارفی صاحب شہر کے شمالی علاقے میں جدید وضع کے ایک نو تعمیر مکان میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتے تھے۔ اُن کی عمر چالیس پینتالیس کی رہی ہو گی۔ چھوٹا قد، ڈھلکے ہوئے کندھے، پھولا ہوا پیٹ، ڈھلا ڈھلا بدن؛ چلنے میں اُن کے ہاتھ دونوں طرف بے جان سے جھولتے رہتے تھے۔ عارفی صاحب تھوڑا آگے جھک کر تیز تیز قدموں سے چلتے تھے۔ اُن کے بدن کی خمیدگی ان کی پرچھائیں میں بھی ظاہر ہوتی تھی اور عارفی صاحب کو ایسا نظر آتا تھا کہ کوئی کبڑا، ٹھنگنا، چوڑا چکلا آدمی بھی اُن کے برابر ہی آگے آگے چل رہا ہے۔

عارفی صاحب کشمشی رنگ کا معمولی کوٹ پتلون پہنے اور ہلکی بادامی ٹائی باندھے ہوئے تھے۔ قمیص کا کلف دیا ہوا سفید کالر کوٹ سے ایک انگل اوپر نکلا ہوا تھا۔ عارفی صاحب اپنے لباس اور ظاہری ٹیپ ٹاپ کی زیادہ پروا نہیں کرتے تھے۔ اگر اُن کی جوان بیٹی ان کا خیال نہ رکھتی تو انھیں مہینوں قمیص بدلنے یا کوٹ پتلون پر استری کرنے کا دھیان بھی نہ آتا۔

عارفی صاحب حسبِ معمول اپنا بڑا سا بھاری بیگ تھامے، آگے کو جھکے ہوئے، گلیوں اور مکانوں کو ایک ایک کر کے پیچھے چھوڑتے، لمبے لمبے قدم بڑھاتے لپکے چلے جا رہے تھے۔

انھوں نے عادت بنا لی تھی کہ سویرے سویرے اٹھ بیٹھتے اور جلد سے جلد گھر سے نکل کھڑے ہوتے تھے تاکہ بسوں کی بھیڑ بھاڑ میں نہ پھنسیں اور ہمیشہ ٹھیک وقت پر دفتر پہنچ کر حاضری

Scanned with CamScanner

رجسٹر پر دستخط کر دیں۔

عارفی صاحب کا مکان شاہراہ سے دور پڑتا تھا۔ راستے میں ڈامر کی بہت سی لمبی لمبی پیچ دار گلیاں پڑتی تھیں جو عارفی صاحب کو اُن کے گھر سے لیتیں اور اپنے پیچ و خم میں گھماتی پھراتی ہوئی سڑک کے سب سے قریب والے بس اسٹاپ پر پہنچا دیتی تھیں۔ اس طرح عارفی صاحب کو اتنا وقت مل جاتا تھا کہ اسٹاپ پر ذرا سستا کر سانسیں بھی درست کر لیں اور ٹھیک وقت پر دفتر پہنچنے کا اطمینان بھی کر لیں؛ تب وہ آرام کے ساتھ اسٹاپ پر کھڑے ہو کر بس کی راہ دیکھنے لگتے تھے۔

اُس صبح جب عارفی صاحب گلیوں اور نئے بنے ہوئے ہم وضع مکانوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے سڑک پر آئے تو اُن کے قدموں نے ہمیشہ کی طرح انھیں بس اسٹاپ پر پہنچا دیا۔

اسٹاپ پر کوئی نہیں تھا۔ عارفی صاحب پہلے آدمی تھے۔ سڑک کی بتیاں ابھی تک جل رہی تھیں۔

عارفی صاحب اپنی مقررہ جگہ پر کھڑے ہو گئے۔ وہ ہاتھ میں اپنا بڑا سا کالا بیگ سنبھالے ہوئے تھے اور اُن کی نگاہیں ڈامر کی لمبی سُرمئی سڑک پر جمی ہوئی تھیں۔ سڑک آگے بڑھتی ہوئی ایک اونچی خوب صورت بلڈنگ کا چکر لگا کر دور ہوتی چلی گئی تھی۔ عارفی صاحب کی جیبی گھڑی کی ٹک ٹک اور سینے میں دل کے دھڑکنے کی صدا کے سوا جو اُن کے کانوں میں ہلکی ہلکی آ رہی تھی، کہیں کوئی آواز نہیں تھی۔ وہ اپنے گرد و پیش سے بے خبر تھے۔ ہرے بھرے درخت ہوں یا شاندار عمارتوں پر سنہرا رنگ بکھیرتا ہوا حسین چمکیلا سورج، انھیں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ سڑک کے کنارے والی نہر کی سُریلی آواز جو اُن کے چاروں طرف گنگنا رہی تھی، اُن کو نہیں سنائی دے رہی تھی۔ ان کے چہرے کو تھپکتی ہوئی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کی طرف ان کی ذرا بھی توجہ نہیں تھی۔ ان کو نظر نہیں آ رہا تھا کہ درختوں کی پتیاں کس طرح سبز پرندوں کی مانند ہوا کے جھونکوں سے ہلتی ہوئی ٹہنیوں میں اٹکھیلیاں کر رہی ہیں۔ یہاں تک کہ سڑک کے اُس پار سنگتراش کی دکان میں سرخ گلابوں کا خوب صورت گل دان بھی ان کی نگاہوں کو اپنی طرف نہ کھینچ سکا۔ عارفی صاحب سڑک کے ڈامر کی پختگی اور چکنائی کی دید میں محو تھے۔ گر وہ سر اٹھاتے بھی تو اُن کی نظر سامنے والی بلڈنگ کی آخری منزل سے اوپر نہ جاتی، اور صبح کا نیلگوں آسمان اور اس میں آزادی سے اڑتے اور فضا کو مسخر کرتے ہوئے پرندے ان کو نظر نہ آتے۔ ان کی نگاہیں ڈامر کی صاف ستھری پٹی پر جمی ہوئی تھیں اور وہ بس کا انتظار کر رہے تھے۔

بس سڑک کے موڑ پر نظر آئی تو عارفی صاحب چوکنّے ہو گئے۔ وہ ایک قدم آگے نکل آئے اور اُن کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ انھوں نے بس کو تعریفی نظروں سے دیکھا:

"کیا نکیلی چیز ہے! بے آواز، تیز رفتار؛ نہ گھڑگھڑ، نہ کھڑکھڑ؛ بالکل جیسے اُڑن گھوڑا!"

عارفی صاحب کا جی چاہنے لگا کہ جلد سے جلد بس کی سیٹ پر بیٹھ کر اونگھنا شروع کر دیں۔

Scanned with CamScanner

کیسی نرم نرم آرام دہ سیٹیں ہوتی ہیں! مشینی صنعت کا شاہکار!

بس ان کی طرف بڑھ رہی تھی۔ عارفی صاحب اس کو دھیرے دھیرے قریب آتے دیکھ رہے تھے۔ دفتری یادداشتوں اور سرکاری خطوں سے بھرے ہوئے بیگ کو مضبوطی سے پکڑ کر وہ بس کے رکنے کا انتظار کرنے لگے۔

سنسان سڑک دن کی روشنی میں چمک رہی تھی۔ بس کے انجن کی ہلکی ہلکی گھرگھراہٹ ان کے نزدیک آتی جارہی تھی۔

نرم ہوا نے عارفی صاحب کے چہرے کو سہلایا، آس پاس کے درختوں پر سوئے ہوئے پرندوں نے جاگ کر پر پھڑپھڑائے، نہر کا مدھم شیریں نغمہ ان کے کانوں کو بھلا لگا، اس پار شگفتہ گل دان میں سرخ گلاب نے ان کی طرف شعلے کی طرح زبان لپکائی، ان کے سر پر ایک پرندہ زور زور چہچہانے لگا۔

اچانک عارفی صاحب اچھل پڑے۔ ان کی آنکھیں پھیل گئیں اور وہ بوکھلا کر کئی قدم پیچھے ہٹ گئے۔ بس قبل تاریخ کے کسی حیوان کی طرح سیدھی ان کی طرف بڑھتی چلی آرہی تھی۔ اگر وہ ہٹ کر نہر کے ادھر والے فٹ پاتھ پر نہ چڑھ گئے ہوتے تو بس نے انھیں روند ہی ڈالا تھا۔

عارفی صاحب نے نہر کے کنارے فٹ پاتھ پر سے بس کو دیکھا کہ اسٹاپ کے اندر گھستی چلی آرہی ہے۔ اس کے زبردست آہنی پیکر سے پورا اسٹاپ بھر گیا تھا۔

عارفی صاحب کے دیکھتے دیکھتے بس نے بڑے آرام سے نہر کو پار کیا اور فٹ پاتھ کا رخ کر کے ان کی طرف بڑھی۔ عارفی صاحب پھر کئی قدم پیچھے ہٹے، اور بس کی طرف ہاتھ جھٹک کر بڑے غصے سے چیخے:

"ابے گدھے! کہاں چڑھائے دے رہا ہے؟"

لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ بس اب بھی انھیں کی طرف چلی آرہی ہے تو وہ فٹ پاتھ پر جاکھڑے ہوئے۔ کچھ دیر کے لیے رکے اور مڑ کر دیکھنے لگے۔ بس گھوم کر فٹ پاتھ پر آگئی تھی اور اس کا رخ پھر ان کی طرف ہو گیا تھا۔ اس وقت ان پر انکشاف ہوا کہ بس کے اندر کوئی بھی نہیں ہے۔ بغیر ڈرائیور اور بغیر کنڈکٹر کے وہ ان کی سمت چلی آرہی تھی اور اس کے انجن کی گھرگھراہٹ تیز ہو گئی تھی۔

عارفی صاحب مڑ کر بھاگے۔ ڈامر کا فٹ پاتھ بالکل ہموار تھا۔ عارفی صاحب سرپٹ دوڑ رہے تھے اور ان کے قدموں کی آواز فٹ پاتھ پر گونج رہی تھی۔ ان کے بڑے سے سیاہ بیگ کا کھٹکا کھل گیا تھا اور اب وہ ان کے پیروں سے ٹکراتا ہوا جھولتا جا رہا تھا کہ ہر چھلانگ کے ساتھ عارفی صاحب کا ہاتھ آگے پیچھے جھٹکے کھا رہا تھا۔

کوئی سو قدم کی دوڑ لگانے کے بعد عارفی صاحب رکے، پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ بس اسی طرح ان

کا تعاقب کر رہی تھی۔ عارفی صاحب جلدی سے مُڑے اور پھر بھاگ کھڑے ہوئے۔

وہ جتنا بھی تیز دوڑتے، بس کی اُن کی گھرگھراہٹ انھیں اپنے پیچھے ہی سنائی دیتی۔ وہ جب بھی مڑ کر دیکھتے، اُس کا بڑا سا عفریتی ہیولا ان کو اپنے سر پر منڈلاتا دکھائی دیتا۔ عارفی صاحب زقند بھرتے اور پہلے سے بھی تیز بھاگنے لگتے۔

دھوپ ان کے قدموں میں بجھتی جا رہی تھی۔ اس کی خوش گوار گرمی سے ان کو اتنی طاقت اور حرارت مل گئی تھی کہ اور بھی تیز دوڑ کر بس سے کچھ اور دور ہو جائیں۔ ایک سڑک طے کرنے کے بعد ان کی سانس پھولنے لگی۔ انھیں ایک تنگ سی گلی نظر آئی اور وہ لپک کر اس میں مڑ گئے۔ گھرگھراہٹ اُن کی پشت پر اسی طرح موجود تھی۔

وہ گلی میں تھوڑی ہی دور تک بھاگے ہوں گے کہ اُن کا دم ٹوٹ گیا اور وہ رک گئے۔ گرمی کے مارے وہ پسینے پسینے ہو رہے تھے۔ انھوں نے جیب سے رومال نکال کر چہرہ پونچھا۔ رومال تہہ کیا اور واپس جیب میں رکھ لیا۔ ٹائی کی گرہ ڈھیلی کی اور اطمینان کی سانس لی۔ جھکے اور اپنے دُکھتے ہوئے پیروں کو دبانے لگے۔ وہ ایک دیوار کے موکھے میں بیٹھ گئے، تھکا ہوا بدن دیوار سے ٹکا لیا۔ بیگ دیوار سے لگا کر رکھ دیا۔ پاؤں پھیلائے اور اُن کا منہ کھُلا

"اوف ف ف۔۔۔۔"

گھرگھر کی آواز سن کر وہ چونک پڑے۔ بس گلی کے اندر گھُسی چلی آ رہی تھی۔ عارفی صاحب نے اُسے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا، دیوار کے پاس سے بیگ اٹھایا اور پھر بھاگنے لگے۔

اُن کی راہ میں جدید ساخت کے ہم وضع مکان اور پکّے راستے پڑ رہے تھے جنھیں تعمیر کے تازہ ترین اصولوں کے مطابق تیار کیا گیا تھا۔

عارفی صاحب گلیوں سے ہوتے اور مکانوں کے برابر سے گزرتے اُڑے چلے جا رہے تھے اور بس ان کا پیچھا کر رہی تھی۔ مکانوں کی اونچی دیواروں نے دھوپ کو گلیوں میں اترنے سے روک دیا تھا اور گلیوں میں ان کا مستقل سایہ پھیلا ہوا تھا۔ خوب صورت، صاف ستھرے مکانوں کے سامنے دوڑتے دوڑتے اور سایہ دار گلیوں میں داہنے سے بائیں اور بائیں سے داہنے مڑتے مڑتے عارفی صاحب کا سر گھومنے لگا تھا اور بس اُسی طرح ان کے پیچھے پیچھے چلتی نظر آ رہی تھی۔

راستے میں ہر طرف گلیاں تھیں اور مکان؛ ہر طرف نئی نئی سر بہ فلک عمارتیں تھیں۔ دوڑتے ہی میں ان کو کھڑکیوں کے شیشوں کے پیچھے عورت مرد دکھائی دے رہے تھے جو مکانوں کی صفائی ستھرائی اور جھاڑ پونچھ میں لگے ہوئے تھے۔ ویکیوم کلینر اور واٹر پمپ کی آوازیں بلند تھیں۔ مرد عورت لپک جھپک کر اِدھر اُدھر آ جا رہے تھے اور اپنے اپنے کام میں منہمک تھے اور کسی دوسری چیز کی طرف متوجہ نہیں تھے۔ اُن کے جذبات سے عاری چہرے شیشوں کے پیچھے بار بار ظاہر اور غائب ہو رہے تھے۔

Scanned with CamScanner

عارفی صاحب نے ان کو آوازیں دیں، مدد کے لیے پکارا اور ہاتھ ہلا ہلا کر ان کو متوجہ کرنا چاہا، لیکن کھڑکیوں کے دبیز شیشوں اور بھاری دیواروں اور گلینڈر اور پمپ کے شور نے اُن کی فریاد کو بے اثر کر دیا۔ لوگ گھروں کے اندر اپنے اپنے کاموں میں ایسے لگے ہوئے تھے کہ انھیں کسی اور بات کی خبر نہ تھی۔ کسی نے سر تک نہیں اٹھایا کہ عارفی صاحب کو دیکھے اور بس کی آواز سنے۔ عارفی صاحب ان کو، ان کی سرگرمیوں کو، ان کی آمد و رفت کو دیکھ سکتے تھے لیکن ان میں سے کوئی بھی عارفی صاحب کو نہیں دیکھ رہا تھا۔ عارفی صاحب کی نگاہوں کے سامنے گویا سینما کے پردے پر ایک فلم چل رہی تھی اور لوگ شیشوں کے پیچھے متحرک تصویروں کی طرح آ جا رہے تھے اور اپنے کاموں میں لگے ہوئے تھے۔

بس نئی سڑکوں کو عبور کرتی، درختوں، مکانوں سے کتراتی، گلیوں کے پیچ و خم سے نکلتی عارفی صاحب کے پیچھے پیچھے چلی آ رہی تھی۔ حواس باختہ عارفی صاحب جب بھی مڑ کر دیکھتے بس کو اپنے پیچھے پاتے۔ جس راہ بھی مڑتے اور جس طرف بھی بھاگتے، بس انھیں پیچھے ہی دکھائی دیتی۔

عارفی صاحب اچانک پلٹ پڑے۔ انھوں نے زمین پر سے اینٹ کا ٹکڑا اٹھا کر بس پر کھینچ مارا اور تہدید کے انداز میں اس کی طرف ہاتھ ہلانے لگے۔ ایک بار وہ ہانپتے ہوئے بیچ سڑک پر کھڑے ہو گئے اور رونے چلانے لگے۔ لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ بس اُن کی تمام دھمکیوں، التجاؤں اور فریادوں سے بے نیاز کسی طرح ان کی طرف چلی آ رہی ہے اور قریب ہے کہ ان کو کسی دیوار سے مسل دے تو وہ پھر مڑے اور بھاگنے لگے۔

ہانپتے کانپتے ایک پوری سڑک طے کر کے وہ خوش نما مکانوں اور پکی سڑکوں سے بچھڑے ایک کھلے ہوئے احاطے میں جا نکلے۔ ہر طرف عمارتی کھمبے گڑے ہوئے تھے۔ باربردار مشینیں ایک کے پیچھے ایک آتیں اور سامان ڈھیر کر کے چلی جاتیں۔ ہر طرف بجری، کنکریٹ، بالو، ریتی، چونے کے بڑے بڑے ڈھیر نظر آ رہے تھے۔

عارفی صاحب کی ناک میں مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو آئی اور اُن کو اپنے بچپن کے دن یاد آ گئے جب وہ دوسرے بچوں کے ساتھ مٹی کے ابھاروں پر چڑھتے اور خوشی سے چیختے اور گرد اڑاتے ہوئے اوپر سے نیچے پھسلتے تھے۔

انھیں اپنی پشت پر بس کی گھڑگھڑاہٹ سنائی دی اور وہ بدحواس ہو کر آگے کو دوڑے اور کنکریٹ کے ایک انبار پر چڑھتے چلے گئے۔

چاروں ہاتھ پیروں سے وہ کنکریٹ کے انبار پر چڑھ رہے تھے اور ہانپ رہے تھے۔ بڑے سے بیگ کو وہ اپنے پیچھے پیچھے کنکریٹ پر گھسیٹ رہے تھے۔ کنکریٹ کے ریزے ان کے پیروں سے مل کر کھڑکھڑاتے نیچے لڑھک رہے تھے۔

وہ خود کو گھسیٹتے ہوئے انبار کی چوٹی تک لے گئے۔ اب وہ تھک کر چُور ہو چکے تھے۔ اُن کی

Scanned with CamScanner

انھوں نے دیکھا کہ کنکریٹ کے انباروں کے اُس طرف ایک سبز میدان دور تک چلا گیا ہے اور سارے میں حسین سنہری دھوپ پھیلی ہوئی ہے۔ جا بجا پرانے ہرے بھرے درختوں کے خوب صورت باغ لگے ہوئے ہیں۔ دور سے چڑیوں کی چہکار اور بہتے پانی کی آواز آ رہی ہے۔ عارفی صاحب بے اختیار اُس میدان کی طرف لپکے۔ لیکن چند قدم بھی نہ بڑھے ہوں گے کہ تھکن سے اُن کے گھٹنے جواب دے گئے۔ وہ کنکریٹ کے انبار پر لڑھکنے لگے اور بے ہوش ہو گئے۔

عارفی صاحب کو ہوش آیا تو اُن پر بس کی بڑی سی سیاہ پرچھائیں پڑ رہی تھی اور بس کے انجن کی آواز اُن کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

انھوں نے بس کو دیکھا کہ ان کے پاس ہی کھڑی ہے اور نزدیک سے دیکھنے پر اور بھی خوب صورت نظر آ رہی ہے۔ اس کی چوڑی چکلی باڈی کو دیکھ کر رعب پڑتا تھا۔ اس کے انجن کی ہلکی ہموار گھرگھراہٹ فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔

عارفی صاحب کی تعریفی نظریں بس پر جم گئیں اور اُن کے ہونٹ ہلے:

'کیا ڈزائن ہے، کتنی حسین! صنعت کا شاہکار۔۔۔!'

وہ اُٹھ کر بیٹھ گئے اور بس کے بڑے بڑے خوش وضع پہیے اور اس کی چمچماتی ہوئی پلیٹ پر ہاتھ پھیرنے اور انگلیاں دوڑانے لگے۔ بمپر پر ہاتھ ٹیک کر وہ کھڑے ہوئے اور بس کی چمک دار باڈی میں اپنا عکس دیکھ کر ہنس پڑے۔ اس کے سامنے کھڑے ہو کر انھوں نے ٹائی کی گرہ درست کی اور اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ کپڑے جھاڑے اور بس کے دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

بڑا سا وزنی بیگ ہاتھ میں لٹکائے اور اپنی جیبی گھڑی کی ٹک ٹک سنتے ہوئے وہ بس پر چڑھے اور کھڑکی کے پاس کی آرام دہ گدے دار سیٹ پر بیٹھ گئے۔ اُن کو اپنا سارا بدن دُکھتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

بس چل دی۔ عارفی صاحب نے کھڑکی کے شیشے میں سے آخری بار دھوپ میں چمکتے ہوئے سبزہ زار اور پرانے ہرے بھرے باغوں کا منظر دیکھا۔ چڑیوں کی چہکار اور پانی کی سُریلی آواز سنی۔ پھر انھوں نے سیٹ کی رمِ پشت سے ٹیک لگا لی اور آنکھیں بند کر لیں۔

بس نے کنکریٹ کے انباروں کا چکر لگایا اور جدید وضع کے صاف ستھرے مکانوں اور ڈامر کی سڑکوں کی طرف بڑھنے لگی۔

گھروں سے اُٹھتی ہوئی دھوئیں کی لکیروں نے شہر پر ایک کالا بادل پھیلا دیا تھا۔

اس کالے بادل کے نیچے تیز رفتاری سے بڑھتی ہوئی بس شہر کے چھوٹے چھوٹے ہم وضع مکانوں کی اوّلین قطاروں کے نزدیک پہنچ رہی تھی۔ اس کے پیچھے پانی کی آواز اور چڑیوں کی چہکار مدھم پڑتی جا رہی تھی۔

○○

(فارسی عنوان: "این سوی تل ہای شن")

غلام حسین نظری

فارسی سے ترجمہ: اجمل کمال

سایہ وش

جب ہم کسی خیالی شہر کے بارے میں بات کرتے ہیں، تو یقیناً اس شہر میں ایک چوک بھی ہوتا ہے، جو ظاہری بات ہے کہ خیالی ہی ہوتا ہے۔ لیکن خیالی شہروں میں خیالی چوکوں کا وجود ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔۔ یعنی ہمارا سروکار حقیقت کی ایسی شکل سے ہوتا ہے جو حقیقی ہے پھر بھی حقیقت نہیں رکھتی۔ مجموعی طور پر، یہی معلوم ہوتا ہے کہ خیالی شہر (حقیقت کے اس حصے سے، جو ہمیں میسر ہے) اور اصل خیالی (حقیقی) ہوتے ہیں۔

ایک خیالی شہر میں، جس میں ایک خیالی چوک بھی موجود ہے (البتہ یہاں ہمارا مقصد کسی شہر کا نقشہ تیار کرنا نہیں ہے)، سڑکیں اپنی طوالت کو گلیوں میں گم کر دیتی ہیں، اور گلیاں دیواروں اور مکانوں سے گھری ہوئی ہوتی ہیں، اور مکان لوگوں سے بھرے ہوتے ہیں ۔۔ اور سب کے سب خیالی۔

ایک خیالی شہر کے خیالی مرکز سے، ایک خیالی شخص چلنا شروع کرتا ہے۔ آپ اتفاق کریں گے کہ اس شخص کی راہ کا بیان کرنا کس قدر مشکل ہے۔ فرض کر لیتے ہیں کہ وہ ایک سڑک سے گزر کر ایک گلی میں جا پہنچتا ہے۔ اور یہ ہمیں معلوم ہی ہے کہ گلیاں دیواروں اور مکانوں سے گھری ہوئی ہیں۔ اور قاعدے سے یہ آدمی اسی گلی کے کسی مکان میں رہتا ہو گا۔ لیکن خیالی شخص کہیں مقید نہیں ہوتا، خیالی شخص کسی چیز سے یا کسی جگہ میں محصور یا محدود نہیں ہوتا۔ خیالی شخص تمام زمانوں میں اور تمام مکانوں میں موجود ہوتا ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ خیالی اشخاص خیالی شہروں کی ترتیب اور شکلوں کو درہم برہم کر دیتے ہیں۔ اور چوں کہ ہمارے پاس خیالی اشخاص کا

Scanned with CamScanner

کوئی واضح تصور نہیں ہے، ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ خیالی اشخاص کا وجود خیالی شہروں کے وجود کی اگر تردید نہیں تو کم سے کم تہدید ضرور کرتا ہے۔

میں ایک حقیقی شخص ہوں -- اس میں کوئی شک نہیں ہے (خواہ آپ اس بات کو عارضی طور پر بھلا ہی کیوں نہ بیٹھے ہوں)۔ میں شہر کے مرکز سے چلنا شروع کرتا ہوں۔ ہر چیز حقیقی ہے۔ آپ اتفاق کریں گے کہ میری راہ کا بیان کرنا ایک آسان کام ہے۔ لیکن ناقص بیان یا بیانات مجھے کبھی پسند نہیں رہے۔ میں ایک سڑک سے گزر کر ایک گلی میں داخل ہوتا ہوں۔ ور یہ ہمیں معلوم ہی ہے کہ گلیاں دیواروں اور مکانوں سے گھری ہوئی ہیں۔ اور قاعدے سے مجھ جیسے آدمی کو اسی گلی کے کسی مکان میں مقیم ہونا چاہیے۔ مگر افسوس، میں اس گلی کا رہنے والا نہیں ہوں۔ اس شہر کے کسی بھی مکان کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہاں تک کہ گلیوں کا سنگی فرش بھی میرے قدموں کو قبول نہیں کرتا۔ شہر ایک خاص لہجے میں مجھے جواب دیتا ہے۔ میں مارا مارا پھرتا ہوں۔ ایک مونڈ بارہ مدار میں مارا مارا پھرتا ہوں۔ شہر کے سرے پر، جہاں مکان ختم ہو جاتے ہیں اور شہر کی حقیقت، بغیر کسی سرحد کے، بیابان کے ابہام اور خیال ہی میں گم ہو جاتی ہے، اس جگہ جہاں شہر کا دروازہ فرض کیا جاتا ہے (کاش شہروں کے دروازے ہوا کرتے)، میں اسی بند گلی میں پھنس جاتا ہوں جس سے حقیقی لوگ حقیقی شہروں میں دوچار ہوتے ہیں: ایک طرح کا جبری انتخاب۔ خوش قسمتی سے مجھے اپنے حقیقی ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔ مجموعی طور پر، یہی معلوم ہوتا ہے کہ حقیقی شہر (حقیقت سے روگردانی کے ساتھ ساتھ) دراصل حقیقی احیالی ہوتے ہیں اور حقیقی اشخاص کے وجود کی تردید کرتے ہیں -- حقیقی اشخاص ناگزیر طور پر خیالی شہروں کو کوچ کر جاتے ہیں۔

میں ایک خیالی شہر میں -- جس کا ہنوز کوئی نام نہیں ہے -- ایک شان دار زندگی گزار رہا ہوں: میری بیوی دلنشیں، میرا پیشہ فیصِرز، میری بیش کتابیں، اور میرا عالی شان محل --- اس عالی شان محل میں، ہم اپنے مشترک دوستوں کی پذیرائی کرتے ہیں۔ ان دوستوں کا، میں نے اور میری بیوی نے، بڑی دقت اور احتیاط سے انتخاب کیا ہے، اس طرح کہ ہم سب آزادی کے مفہوم کا گہرا -- اور یکساں -- ادراک رکھتے ہیں۔ جب ہمارے گھر میں دعوت ہوتی ہے، گھڑسواری اور پیراکی کے بعد، ہم بیٹھ کر بائم کھیل کھیلتے ہیں۔ ہماری گفتگوئیں اُن اعلیٰ انسانی صفات کی یاد میں ہوتی ہیں جنھوں نے ہماری چھوٹی سی جماعت کو ایک شیریں خواب میں -- کہ نہ نیند میں ہیں اور نہ بیدار -- گم کر دیا ہے۔ فقط ایک چھوٹے سے غیر اہم معاملے میں، جو تذکرے کے بھی قابل نہیں، میرا عقیدہ برخلاف تو نہیں، بس ذرا سا مختلف ہے: میرے دوستوں کا کہنا ہے کہ حقیقی شہروں کی معروضیت دراصل موضوعیت میں تبدیل ہو جاتی ہے، جب کہ میں کسی خشک اور مقدس مومن کی طرح (اور میرے دوست اس قدر آزاد خیال ہیں کہ جانتے ہیں اس معاملے میں مجھ سے بحث نہیں

Scanned with CamScanner

کرنی چاہیے) یہ پختہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ خیالی شہروں کی موضوعیت در اصل معروضیت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

oo

(فارسی عنوان: سایہ وش)

اسماعیل فصیح

فارسی سے ترجمہ: میر مسعود

خواب

۱

رات کے اندھیرے میں مجھ کو ایک خواب دکھائی دیتا ہے کہ میں نے اپنے ایک ہم شکل کو قتل کر دیا ہے، یا اپنے ہم زاد کو قتل کر دیا ہے۔ کسی جگہ، آئینے کے سامنے، میں نے چھرے کا پھل اس کے گلے میں اتار دیا ہے۔ خون کا فوارہ اُبلتا ہے۔ وہ ایک چیخ مارتا ہے۔ آہستہ سے پھڑپھڑاتا ہے۔ اس کے ہاتھ اٹھے کے اٹھے رہ جاتے ہیں۔ وہ چھرے سے چھوٹ کر زمین پر گرتا ہے اور دم توڑ دیتا ہے۔

میں اس کو خون میں لتھڑے ہوئے بالوں سے پکڑ کر نیم تاریک راہ داری کے سرد چکنے فرش پر گھسیٹتا ہوا، ویران مکان میں سے، تاریکی میں سے، یادوں میں سے، آرزوؤں میں سے گھسیٹتا ہوا، قلبِ شب تک لے آتا ہوں۔ رات بے رحم اور بے اماں ہے۔ اور میں اس جسد کو باغ کی پشت کے کھنڈر میں بڑی احتیاط کے ساتھ ایک گندے گڑھے میں ڈال دیتا ہوں۔

میری مٹھی میں جکڑے ہوئے خون آلود چھرے سے اب تک لہو ٹپک رہا ہے۔ اور لاش کی پتھرائی ہوئی آنکھیں میرے درونی غصے اور کینے کا شکار ہو کر خاموش پڑی ہیں۔

لاش کو گڑھے میں ڈال کر میں اندھیری میں کھڑا رہتا ہوں اور خاک پر پڑے ہوئے بے جان بدن سے کہتا ہوں:

تو نے میری زندگی برباد کر دی۔ میری بڑی سے بڑی تمنا کو خاک میں ملا دیا۔ میرے خوابوں کو، میری چاہتوں کو، اور میرے ہر ہنر اور ہر خوبی کو ہیچ کر دیا۔

Scanned with CamScanner

میں یہ کہتا ہوں اور لاش کی آنکھ کے ڈھیلے میں چھرا بھونکتا ہوں۔ کب سے جمع ہوتے ہوئے کینے اور غیظ و غضب کے ساتھ چھرا، اور اندر اتارتا ہوں اور دھاردار فولاد سے آنکھ کی پتلی، مدقے، جمتے ہوئے خون، گوشت کے ریشوں، نسوں اور ہڈیوں کو کاٹتا چلا جاتا ہوں اور مغز تک، جسمانی ذلالتوں کے مرکز تک، اور زمین کی مٹی تک چھرا اتار دیتا ہوں۔

پھر احتیاط کے ساتھ لاش پر پٹرول چھڑکتا ہوں۔ اسے آگ دکھاتا ہوں۔ جلا کر راکھ کرتا ہوں اور راکھ کو فضا میں منتشر کر دیتا ہوں۔

۲

جھٹ پٹے کا سماں ہے۔ میں سرخ شراب کا جام ہاتھ میں لیے، ہلکا پھلکا، برہنہ اور تنہا، ٹب کے گرم پانی میں پھیل کر لیٹ جاتا ہوں۔

سوتے جاگتے میں خواب دیکھتا ہوں کہ اپنے ہم زاد سے بے تکی باتیں کر رہا ہوں۔ اس سے کہتا ہوں:

کوئی چارہ نہ تھا۔ یہ تو کرنا ہی تھا۔ میں اس عذاب کو ختم کرنے پر مجبور ہو گیا تھا، ورنہ، اگر یہ نہ کرتا تو، میری اور تیری مسلسل جاں کنی کبھی ختم ہونے میں نہ آتی۔ چلتی رہتی، برسوں چلتی رہتی، یہاں تک کہ ہم، دو فرتوت بوڑھے، ایک دوسرے کا ماتم کرنے بیٹھ جاتے اور میری تیری زندگی میں سے ایک گدلی، بدرنگ، سیاہ تلچھٹ کے سوا کچھ نہ رہ جاتا۔ لیکن اب تو آزاد ہے، میں بھی آزاد ہوں۔ ہم ایک دوسرے کی قید سے آزاد ہو گئے ہیں۔ ہم دونوں نے اپنی اپنی اصل کو پا لیا ہے۔

۳

برہنہ اور تنہا، ٹب کے گرم چپچپے پانی میں پڑا ہوا، میں خواب دیکھتا ہوں کہ سچ مچ میں آزاد ہوں۔ اس جسم سے رہائی کا احساس میرے اندر موجیں مار رہا ہے۔ میں اوج پر پہنچ رہا ہوں۔ امنگیں میری روح کو پھر سے زندہ کر رہی ہیں۔ دہری آزادی کے اس کیف اور سرمستی نے مجھ کو نہ صرف میرے ہم زاد سے آزاد کیا ہے، بلکہ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں خود اپنی بھی داستان، اپنی بھی تاریخ سے الگ ہو گیا ہوں۔

ٹب کے گرم ساکت پانی میں پڑے پڑے اب میں یہ خواب دیکھتا ہوں کہ جس نے میرے ہم زاد کا خون کیا ہے وہ میں نہیں ہوں، کہ میں ایک موہوم اور [illegible] گرفت وجود ہوں، کہ میں رمز و تخیل کی خلق کی ہوئی ایک حسین لافانی روح ہوں۔

لیکن صبح ہوتے ہوتے اور کھڑکی کے ذریعے زندگی کی آوازوں کے ساتھ، خواب اور بیداری

کے درمیان مجھے اپنا سر گھومتا معلوم ہوتا ہے۔ میں آنکھیں کھولتا ہوں اور مجھ کو حمام کی چھت اور دیواریں ناچتی دکھائی دیتی ہیں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں کہیں نیچے ہی نیچے گرتا چلا جا رہا ہوں۔

اور اب مجھ کو راہ داری میں اُن کے قدموں، اُن کے بھاری بُوٹوں کی آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔

۴

حوالات میں طویل طویل جرحوں اور اقبالی بیان کے بعد، جب مجھے کوٹھری میں بند کر کے سب چلے جاتے ہیں، میں لکڑی کی بنچ پر پڑے پڑے گھڑی بھر سو جاتا ہوں اور خواب دیکھتا ہوں کہ در حقیقت میں نے کسی کا خون نہیں کیا ہے، کسی کو، انگلی بھی نہیں چھوائی ہے، سوا اپنے۔ وہ میں تھا، اور کوئی نہیں تھا۔ میں نے اپنے آپ کو قتل کیا ہے۔ ایک لمحے میں، اُس ایک لمحے میں جب میں آئینے کے اندر تھا اور آئینے نے مجھ کو اشارہ کیا تھا، میں نے چھرا اپنے گلے میں اتار دیا تھا، اور باہر کھینچ لیا تھا، اور پکار کر اپنے بدن سے کہا تھا:

"تُو نے سب کچھ تہس نہس کر دیا۔ یہ تیری پھٹی پھٹی بھوکی آنکھیں، یہ تیرے پیٹ سے بھی زیادہ بھوکا تیرا دل، یہ تیرے بھوکے ہاتھ، یہ تیرے بیہودہ گوہونٹ، یہ تیری چھوٹی چھوٹی خود پرستیاں اور اوچھی حرکتیں، ان سے تُو نے سب کچھ ملیامیٹ کر دیا۔ جس شے میں بھی حسن کی رمق تھی، تُو نے اسے مٹا دیا۔"

اور میں نے اپنی گردن کی ایک ایک نس پر، پیشانی پر، چہرے کے عضلات پر چُھرا چلا دیا اور اپنی جان لے لی۔ پھر ہلکی سی تھرتھراہٹ کے ساتھ آئینے سے الگ ہوا اور زمین پر گر گیا۔ بس، لمحہ بھر کی بات تھی۔

تنہا، حوالات کے ایک گوشے میں، میں خواب دیکھتا ہوں کہ میرا دم ذرا ذرا کر کے نکل رہا ہے اور دل کی آخری دھڑکنوں کے ساتھ میری روح آزاد اور سبک بار ہو جاتی ہے اور میرے سکڑے ہوئے بے بس بدن کو فنا کے مکڑجال میں الجھا کا الجھا چھوڑ دیتی ہے، اور مجھے معلوم ہے کہ اب میں اس ذلیل منحوس بدن میں واپس نہیں آؤں گا۔

۵

رات کو، شہرداری کے اسپتال میں، میں خواب دیکھتا ہوں کہ میں پہلے کی طرح ہو گیا ہوں میں اپنے گھر، اپنی بیوی اور بچے کے پاس لوٹ آیا ہوں۔ کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔ قتل، گرفتاری، جرح، حوالات، کچھ بھی نہیں۔ زندگی ہمیشہ کی طرح ہے۔ میں دن بھر کا تھکا ہارا کام پر سے واپس آیا ہوں۔ گاڑی گیرج میں مقفل کر دی ہے۔ رات ہو گئی ہے۔ میں نے پیٹ بھر کر کھا پی لیا ہے۔

Scanned with CamScanner

اپنے کمرے میں کتابوں کے درمیان اکیلا بیٹھا ہوں۔ دوسرے کمرے سے ٹیلی ویژن کی آواز آ رہی ہے۔ ہمیشہ کی طرح میرے ہاتھ میں کتاب ہے۔ پڑھ بھی رہا ہوں، نہیں بھی پڑھ رہا ہوں۔ اور وہ جو میرا ہم شکل تھا، جو میرا ہم زاد تھا، اور میرا دشمن تھا، دیواری آئینے میں سے مجھ کو دیکھ رہا ہے، مجھے اشارے کر رہا ہے۔ کھڑکی کے پیچھے سے اشارے کر رہا ہے، کچھ طعنے ہیں۔ کچھ تمسخر کے ساتھ اور میں اس کی وہی لعنتی آواز سنتا ہوں جو سرد زمستانی ہوا میں میری روح کے اندر سے اٹھا کرتی تھی، اس شخص کی آواز جو میرا عدو تھا، آواز جو میری روح کو کھرچتی رہتی تھی۔ وہ رات کی کھڑکی میں سے مجھ پر ہنستا ہے۔ میں اسے دیواری آئینے میں سے دیکھتا ہوں کہ مجھ پر ہنس رہا ہے۔ اور آج رات میں اس کو بہت احتیاط کے ساتھ اشارے سے بلاتا ہوں، دروازے کا کھٹکا کھول دیتا ہوں اور اس کا انتظار کرتا ہوں۔ اسے دیکھتا ہوں کہ دروازہ کھول کر آہستہ آہستہ کمرے میں آ رہا ہے۔ ہم میز پر آمنے سامنے بیٹھتے ہیں، ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے ہیں۔ میں نصیبی شراب کی طرف کانپتا ہوا ہاتھ بڑھاتا ہوں، وہ کھانا اسی طرف کھسکاتا ہے۔ اور میں دیکھتا ہوں کہ یہاں میرے اس کے مابین جو کچھ بھی ہے اس کا مقدر ہے اور میرا ہاتھ چہرے کی طرف بڑھتا ہے۔

۶

مقدمے کا دن۔

مقدمے کے دوران، بعد ظہر کی بے کیف گھڑیوں میں، عدالت کے تپتے ہوئے کمرے میں، وکیلِ دفاع، وکیل سرکار اور جج کی سپاٹ آوازوں، مقدمے کی لا انتہا اور پیچ در پیچ بحثوں کے درمیان، میں دھوپ کی عینک کے پیچھے آنکھیں موند لیتا ہوں اور خواب دیکھتا ہوں کہ مجھ کو شہر کے میدان میں ننگا کر کے پھانسی پر لٹکا دیا گیا ہے۔ پھانسی کا تماشا دیکھنے آئے ہوئے لوگوں کو میرا اٹھا، بے ڈھنگا بدن نظر آ رہا ہے۔ موت کی نیند میں مجھ کو جج کی آواز سنائی دیتی ہے:

تم نے ایک بے گناہ آدمی کا خون کیا، اس کی لاش جلا دی، اس کی راکھ اڑا دی، اور دعویٰ کرتے ہو کہ وہ تمہارا اپنا بدن تھا، اور تم نے سب کچھ اس سے بچنے کے لیے کیا تھا۔ کون تھا وہ آدمی؟ اسے جینے کا حق نہیں تھا؟ کیا نام تھا اس کا؟

میں سر ہلا دیتا ہوں۔ میں نے اپنے نام، اپنی زندگی، اپنی تاریخ سمیت اپنے آپ کو گڑھے میں ڈال کر بھول گیا تھا۔

۷

پھانسی سے پہلے والی رات۔

Scanned with CamScanner

میں اپنی تنہا کوٹھری میں اپنی روح کے ساتھ مزے سے بیٹھا ہوا ہوں۔ خواب دیکھتا ہوں کہ ایک ختم نہ ہونے والے راستے پر چل رہا ہوں۔ موت کی نیرنگیوں کے درمیاں چلا جا رہا ہوں۔ بہشت کی لپٹ آتی ہے، بہشت کی لپٹ مجھے پکارتی ہے۔ میں گرتا پڑتا آگے بڑھتا ہوں اور اپنی بیداری کو برقرار رکھتا ہوں؛ عظیم، حسین بیداری جس میں نجات کا آہنگ ہے، جو اس شہر، اس جہان میں میرے جسم، میری روح، میرے عمل کے تمام مکانات سے ارفع ہے۔ اور آج رات اس تنگ زنداں میں، اپنے گوشت پوست میں، خواب میں، یہ بات مجھ کو ڈراتی نہیں کہ کل مجھ کو میدانِ شہر میں پھانسی دے دی جائے گی۔ یہ تصور تک مجھے نہیں ڈراتا کہ مجھ کو اُلٹی پھانسی سے بھی بدتر اذیتیں دی جا رہی ہیں۔

لیکن اس سب سے برار گنا بدسر نوشت میرا انتظار کر رہی ہے۔

۸

پھانسی کی صبح۔

گھڑیاں کی آواز سے میری آنکھ کھلتی ہے۔ کچھ دیر نیند اور بیداری کے درمیان جھولتا رہتا ہوں۔ کہاں ہوں؟

میں دیکھتا ہوں کہ مجھے گھر لے آیا گیا ہے۔ میں اپنے مکان میں، اپنی خواب گاہ میں ہوں۔ حیران و پریشان واش بیس کے پاس آتا ہوں۔ آئینے کے سامنے کھڑا ہوتا ہوں۔ منھ پر پانی ڈالتا ہوں۔ برش سے چہرے پر صابن ملتا ہوں۔ سیفٹی ریزر میں نیا بلیڈ لگاتا ہوں۔ خون کے تالوں کے درمیان چمکتی ہوئی اپنی پتلیوں کو گھور گھور کر دیکھتا ہوں۔

کچن سے چائے کی بھینی بھینی مہک آتی ہے۔ میری بیوی کے گنگنانے کی آواز آتی ہے۔

پھانسی، موت، کچھ نہیں۔

زندہ رہنا ہے۔

○○

(فارسی عنوان: "خواب")

اسماعیل فصیح

فارسی سے ترجمہ: نیر مسعود

ولادت

بچے کا سر باہر آیا اور تسلے میں تھوڑا خون گرا۔ میری دادی نے زچہ کے دونوں ہاتھ کس کر پکڑ لیے اور کہا:

"زور لگاؤ۔ کہو یا علی، یا فاطمہ زہرا۔"

زچہ اب بھی چیخ چیخ کر روئے جا رہی تھی۔ میری طرف کسی کا دھیان نہ تھا۔ میں بارش میں بھیگتا ہوا آیا تھا اور دروازہ بھیڑ کر کھڑا ہوا تھا۔ مجھ کو دور سے بچے کے چپچپے بال دکھائی دیے، پھر اس کی گردن اور نچلا بدن نظر آیا۔ خون پھر گرا۔ میں نے دیکھا بچہ دھیرے دھیرے دنیا میں آ رہا ہے۔

"یا علی ی ی ی۔"

اس کے بعد، کوئی ایک گھنٹے بعد، سب کام پورا ہو چکا تھا۔

باہر موسلادھار بارش اور طوفانی رات تھی۔ میں جا کر نہر سے دادی کے لیے لوٹے میں پانی لے آیا اور دادی احاطے سے متصل چبوتریا پر ہاتھ دھونے بیٹھ گئیں۔ اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ کبھی کبھی بجلی کوند جاتی اور گرج سنائی دیتی۔ احاطہ چمڑے کے کارخانے کے پیچھے کا ایک کھنڈر تھا جس کے کونے میں دو کمرے بنے ہوئے تھے۔ انھیں میں سے ایک کمرے میں ایک عورت کے یہاں زچگی ہوئی تھی۔ آدھی رات کے وقت ایک ہمسائی نے میری دادی خانم جان کو بلوایا تھا۔ خانم جان مجھے بھی اپنے ساتھ لیتی آئیں۔ وہ ساٹھ سال کی ہو گئی تھیں۔ میں چھ سال کا تھا۔

خانم جان نے ہاتھ دھو کر پونچھے۔ اٹھ کر پھٹا پرانا لحاف زچہ پر ڈال دیا۔ زچہ نے آنکھیں کھول دیں۔ خانم جان بولیں:

Scanned with CamScanner

"اللہ نے تمہیں سنہرے بالوں والا بچہ دیا ہے۔"

"کیا؟" زچہ بولی، اس پر نقاہت طاری تھی، "کیا کہہ رہی ہیں؟"

خانم جان بولیں:

"کہہ رہی ہوں تم نے سنہرے بالوں والا بچہ جنا ہے۔ پھر شبِ جمعہ دنیا میں آیا ہے۔ اس کے وزن برابر چھوہارے خیرات کر دینا۔"

عورت نے پوچھا:

"زندہ بھی ہے؟"

"ہمیں؟ زندہ ہے کیا مطلب؟" خانم جاں بولیں، "رونے کی آواز نہیں سن رہی ہو؟"

کمرے کے گوشے میں ہمسائی نے آہ بھری اور بولی:

"بہ حقِ پنجتن۔"

وہ بچے کے قنداق* میں لگی ہوئی تھی۔ خانم جان نے کہا:

"زندہ ہے۔ اچھا پیارا سا ہے۔"

زچہ بولی:

"آپ کو جناب عباس کی قسم۔"

"توبہ ہے،" خانم جان نے کہا، "کیسی باتیں کر رہی ہو؟ چنگا بھلا ہے۔ میں نے کہا خانم آقا قصے کے پارچے کو بیچ میں چاک دے کر بچے کی قیمتی کفنی** بنا لیں۔"

"تو جیتا رہے گا؟"

"ہاں بھئی ہاں۔ یہ کیا بک رہی ہو؟"

"میرے بچے جیتے نہیں،" عورت بولی، "۔۔۔ سب جاتے رہے۔"

دروازے کے پیچھے ہوا چیخ رہی تھی۔ بارش اور تیز ہو گئی تھی۔ میں چھت کے ایک کونے کو گھور رہا تھا۔ وہاں پانی رسنے لگا تھا۔

خانم جان نے بھنویں اچکا کر ہمسائی کی طرف دیکھا۔ ہمسائی بولی:

"کیا جانے، خانم۔ سچ تو کہتی ہے۔"

خانم جان نے زچہ سے کہا:

"یہ تو زندہ سلامت ہے۔ یا اُم البنین، سب کی مرادیں پوری ہوں۔"

زچہ نے پوچھا:

---

*قنداق: کپڑے کا تھیلا جس میں نومولود کو گردن تک بند کر دیتے ہیں۔ (مترجم)

** "پیرہنِ قیامت" یا "پیراہنِ رستاخیز": بچے کا پہلا لباس جو اس کی سلامتی کے لیے پہنایا جاتا ہے۔ (مترجم)

"بچہ کہاں ہے؟"

خانم آقا اسے قندق میں کر رہی ہیں، خانم جان نے بتایا، کل قنداق میں مشکی سر چاول باندھ کر دو تین دن یوں ہی رہنے دینا، پھر دروازے پر فقیر کو دے دینا۔

زچہ نے آنکھیں بند کر لیں اور دیر تک نوحہ میں، یا غش میں، رہی۔ بارش کے وڑیڑوں کی آواز کمرے میں گونج رہی تھی۔

ہمسائی خانم آقا -- آشیخ حسن قلیونی کی بیوی -- نے بتایا کہ زچہ کا نام موچول ہے۔ موچول کا شوہر روح اللہ خاں کیل گھر میں کام کرتا تھا۔ بھلا آدمی تھا۔ یہ لوگ نئے نئے یہاں آئے تھے۔ اس سے پہلے نوام الدولہ کی بزریا میں رہتے تھے۔ موچول حاجی آقا جواد واعظ کے گھر کی ایک بروجردی نوکرانی کی لڑکی تھی۔ روح اللہ خاں آج ابھی تک گھر نہیں لوٹا تھا۔ ہمسائی نے بتایا کہ روح اللہ تھوڑا شرابی ہے مگر ماشاءاللہ بٹا کٹا مرد بچہ ہے۔ اس کی پہلی بیوی شادی کے پہلے ہی سال زچگی میں مر گئی تھی۔ موچول اس کی دوسری بیوی تھی۔

خانم جان نے زچہ سے کہا:

گھبرا نہیں بیٹی۔ یہ بچہ تمہارا جیتا رہے گا۔ خوب تندرست بھی ہے۔"

زچہ نے رونا شروع کر دیا۔ پھر دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا:

"یا جنابِ عباس، آپ کے حوالے---"

خانم جان بولیں:

"سو جا بچی، آرام کر لے۔"

آپ کو کیا پتا؟" وہ بولی، "کیسی نصیبے کی مار ہے کہ چھے چھے بچے جاتے رہیں۔"

"چھے چھے؟"

"چھے سال میں چھے۔ سب جاتے رہے۔"

خانم جان بولیں:

"اللہ کی پناہ!"

آشیخ حسن قلیونی نے اپنے حجرے سے اذان دینا شروع کی۔ زچہ بولی:

فقط آخر والا علی سات مہینے جیا۔ اس کا نام میں نے 'علی بہمان' رکھا تھا۔ مگر---

خانم جان نے کہا:

بچہ مرتا ہے تو سیدھا جنت میں جاتا ہے۔ ماں کے لیے جنت میں گھر بناتا ہے۔

عورت کہنے لگی:

باقی کوئی تین دن، چار دن سے زیادہ نہیں جیا۔ جتنے اتنے سے پیدا ہوئے تھے۔ سارے ڈیل سے گھنائے ہوئے۔ تمام میں چھالے اور دودوڑے۔ سر اور چھاتی پر بھی چھالے ہی چھالے۔

ایک تو نکلا ہی مرا ہوا۔ کیا کیا جھیلا ہے! قوام الدولہ کی بزریا میں صغرا خانم دائی تھی، اس نے سنبھال لیا، نہیں تو میں بھی گئی تھی۔ علی، وہی جو سات مہینے جیا، آپ نے دیکھا نہیں، چاند سا بچہ تھا۔ پیاری پیاری آنکھیں، گل گوتھنا، ذرا سی ناک، اتنا سا دہانہ۔ وہ بھی جب ہوا ہے تو بدن پر چکتے اور سفید داغ تھے۔ پسلی الگ چلتی تھی۔ ساتویں مہینے پاؤں پاؤں چلنے لگا تھا۔ تین رات بخار میں بھنتا رہا۔ پھر وہ بھی گزر گیا۔"

"اللہ پر بھروسا رکھ، بیٹی،" خانم جان نے کہا۔

"داغ ہی داغ،" عورت بولی، "پھوٹی قسمت، نصیبوں جلی۔ پیچھے پیچھے بچے جاتے رہیں اور آدمی کچھ نہ کر پائے۔"

"شش، نہ،" خانم جان نے کہا، "آخر پنجتن اور امام بھی تو ہیں۔"

عورت کہنے لگی:

"جب ہی بچہ جنتی تھی، اس کا باپ قنداق کو اٹھا کر جھنجھوڑنے لگتا، بڑے تیہے سے پوچھتا یہ ایسا کیوں ہوا ہے؟ اتنا سا کیسے ہے؟ یہ لعنتی داغ دھبے کا ہے کے ہیں؟--- پھر بچے مرتے تو میرا جینا دو بھر کر دیتا تھا۔ تاؤ دکھاتا تھا، مارتا کوٹتا تھا۔ یا ابوالفضل العباس، یہ ایک میرا جیتا رہے، یہ ایک نہ مرنے پائے۔"

"اتنی بے چین نہ ہو، بچی،" خانم جان بولیں۔

زچہ دبلی پتلی مختصر سی عورت تھی۔ چہرے پر زردی گھنڈی ہوئی، ناک پتلی اور نوک پر سے اٹھی ہوئی تھی۔ بڑی بڑی کالی آنکھیں، الجھے ہوئے سیاہ گھنے بال۔ عمر کا کچھ پتا نہ چلتا تھا، شاید بیس سال۔ چالیس کی بھی ہو سکتی تھی۔

ہمسائی اپنا کام پورا کر چکی تھی اور اب ماں اور بچے کے درمیان جاجم کے ایک کونے پر اکڑوں بیٹھی ہوئی تھی۔

زچہ نے خانم جان کو بتایا:

"علی جب چار مہینے کا تھا تو ایک رات میں اس کو درگاہ شاہ عبدالعظیم میں لے گئی، اس کو ضریح سے باندھ دیا اور خوب خوب روئی، اتنا روئی کہ آنکھوں سے خون بہنے لگا۔"

خانم جان بولیں:

"خیر، اب تو یہ گلدستہ سا بچہ مل گیا ہے، اس کے لیے دعا کرو۔"

"ہاں، لیکن یہ جیتا بھی رہے گا؟" زچہ نے پوچھا، "اس کو بھی تو موت نہیں لے جائے گی؟ جیسے اوروں کو---"

"ہاں بھئی، جیتا رہے گا۔"

"زندگی،" ہمسائی نے آہ بھری، "مصیبت، بدنصیبی، دکھوں کا گھر۔ مرنے والے چین

Scanned with CamScanner

سے ہیں۔ خاک یہ دو دن کی زندگی۔۔۔"

زہرہ نے جھجکتے جھجکتے پوچھا:

"یہ بھی اتنا سا ہے نا؟ ستوانسا۔۔۔"

خانم جان نے کہا:

"نہیں۔۔۔ ستوانسے بچے تو بڑے تیز، ہوشیار ہوتے ہیں۔ بڑھتے بھی جلدی ہیں۔"

زہرہ اور زور زور سے رونے لگی۔ آنسوؤں سے میری آنکھیں سلگنے لگیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ عورت روئے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کا بچہ مر جائے، مگر مجھ کو یقین تھا کہ اس کا بچہ مر جائے گا اور کوئی کچھ نہیں کر سکے گا۔

ہمسائی نے ایک اور زوردار آہ بھری۔

"بچہ کہاں ہے؟" زہرہ نے پوچھا، "میں بھی تو دیکھوں۔"

"صبر کرو، بیٹی،" خانم جان بولیں، "ٹھنڈک تو ہو جانے دو۔"

خانم جان نے ہمسائی کی طرف دیکھا اور پھر کچھ نہیں کہا۔

"اس کی حالت۔۔۔" زہرہ بولی، "وہ ٹھیک ٹھاک تو ہے نا؟"

وہ کچھ پوچھنا چاہتی تھی مگر پوچھتے ڈر رہی تھی۔ خانم جان نے کہا:

"ٹھیک ہے، بیٹی۔"

ہمسائی نے پلٹ کر خانم جان کو دیکھا۔ زہرہ کو کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے لالٹین کی روشنی میں بچے کا چہرہ دیکھا۔ ننھا منا پیارا سا گورا گورا بچہ تھا، لیکن اس کی بائیں کنپٹی پر اور ہونٹ پر نیلے داغ یا بڑے بڑے گھاؤ تھے۔ ہونٹ سے اوپر اور آدھے منہ پر ایک بڑا سا لال چکتا بھی تھا۔ اس کی سانس پھنس پھنس کر آ رہی تھی۔

زہرہ نے ہتھیلیوں سے اپنے آنسو پونچھے اور کہنے لگی:

"جب علی مر گیا تھا تو جی چاہتا تھا خود بھی زہر کھا کے جان دے دوں۔ دنیا سے، جینے سے جی اٹھ گیا تھا۔ باپ اس کا دو دو رات، تین تین رات گھر نہیں آتا تھا۔ میں خود بچے کو گودی میں اٹھا کر ناجویہ کے قبرستان لے گئی۔ دفن کر دیا۔ میری آنکھوں کے سامنے قبر کھدی۔ پھر اس کی قبر میں ڈال دیا گیا، مٹی ڈال دی گئی۔ میرے بچے کو کیڑے، سانپ، چیونٹیاں کھائیں۔ اللہ! کلیجا خون ہو کر آنکھوں سے نکلا جاتا تھا۔"

خانم جان نے میری طرف دیکھا۔ معلوم ہوتا تھا مجھے ساتھ لا کر پچھتا رہی ہیں۔ مجھ کو رونا چلا آ رہا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ خانم جان جھوٹ بول رہی تھیں۔ بچے مر کر جنت میں نہیں جاتے۔ اور وہ بچے ان کے لیے آخرت میں کوئی گھر ور نہیں بناتے۔ مجھ کو یقین ہو گیا تھا کہ میں خود بھی ایک دن مر جاؤں گا اور مجھے بھی زمین میں گاڑ دیا جائے گا۔ میرے بدن کو بھی کیڑے اور سانپ اور چیونٹیاں

Scanned with CamScanner

کھا جائیں گی اور کوئی کچھ نہیں کر سکے گا۔

خانم جان مڑیں اور بولیں:

"کیسی باتیں کر رہی ہو، بی بی۔ بس چپ ہو جاؤ۔ زچائیں ایسے کلام نہیں کرتیں۔ بدشگونی ہوتی ہے۔"

"جب علی مرا ہے،" زچہ بولی، "میں پھر پیٹ سے تھی۔ یہی والا تھا۔ اسی کی وجہ سے زہر کھانا چاہتی تھی۔ جانتی تھی یہ بھی مر جائے گا۔ ہر رات، ہر رات مرنے کے حواب آتے تھے۔ دیکھتی تھی بچہ مر گیا۔ اُف، اللہ! سب بچے مر جاتے ہیں۔ کسی نے عمل کر دیا ہے۔ مجھ پر لعنت پڑ گئی ہے۔ قسمت پھوٹی ہوئی ہے۔۔۔ جب باپ کو پتا چلا علی مر گیا تو دن رات مجھ پر ستم توڑنے لگا۔ ہر وقت پیے رہتا۔ پھر ایک دن رات گئے گھر میں آیا۔ نشے میں چاقو کھینچ کر چلا میری گردن کاٹنے۔ میں بھاگ کر ہمسائی کے گھر جا چھپی۔

ہمسائی نے ایک آور آہ بھری اور بولی:

"ہم بد نصیبوں کا جینا مرنا برابر ہے۔"

نوزائیدہ بچے نے رونا شروع کیا اور دھیرے سے ہاتھ چلائے۔ خانم جان نے بناوٹی خوشی سے کہا:

"اب تو اُس کے بدلے میں پیارا سا سنہرے بالوں والا پا گئیں؟ آواز سن رہی ہو؟"

زچہ نے سر نہیں گھمایا، جیسے ڈر رہی ہو۔ بولی:

"بچہ مجھ کو دکھائیں گی نہیں؟"

"چھے رات دن بچے کو زمین پر لٹانا چاہیے،" خانم جان بولیں، "تم نے یہ حدیث نہیں سنی؟ ایک دن رات تو بچے کو ہلانا بھی نہیں چاہیے۔ ساتویں رات خود زچہ بچے کو اٹھا کر پالنے میں لٹائے۔ یہ برکت کی رات ہوتی ہے۔ اس میں چاہیے کہ مولا مشکل کشا کے نام کی مٹھائی اور میوے فقیروں میں بانٹے۔"

زچہ روئے جا رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے بچے مر کیوں جاتے ہیں۔ کمرے کی فضا عجیب منحوس سی ہو گئی تھی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ بچہ مرا ہی چاہتا ہے۔ میری نظروں میں ولادت ایک بُری اور نامناسب اور بیہودہ چیز ہو کر رہ گئی تھی، اور موت یقینی۔۔۔ اور مکروہ۔

کمرے کا دروازہ دھڑ سے کھلا اور ایک آدمی اندر آ گیا۔ بارش اور ہوا کے شور میں کسی کو احاطے کا پھاٹک کھلنے کی آواز یا اس کے پیروں کی چاپ سنائی نہیں دی۔ میں تو دروازے کے قریب ہی بیٹھا تھا، مجھ کو بھی اس کی آہٹ نہیں ملی۔ وہ لمبا چوڑا، سیاہ پوش آدمی تھا۔ دروازے کی

چوکھٹ پر وہ رکا۔ اس کے ساتھ ہی کمرے میں ہوا کے جھونکے اور پانی کی بوچھار آئی۔ اس نے کمرے کی حالت دیکھی اور اس کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

وہ چھبیس ستائیس سال کا بدشکل آدمی تھا۔ گھنی مونچھیں تھیں اور پھیلی ہوئی ڈاڑھی، بدن پر سیاہ رنگ کا ڈھلا ڈھالا کوٹ پتلون، بدرنگ کالی تسلی کلاہ، کوٹ کے نیچے میلی چکٹ بنیان، سر سے پیر تک بھیگا ہوا۔ اس کی کلاہ کے کناروں سے پانی ٹپک رہا تھا، منہ سے شراب کے بھبکے نکل رہے تھے۔ پتلون کو آگے سے کھجائے جا رہا تھا۔ کچھ دیر تک وہ کمرے کو متجسس نظروں سے دیکھتا رہا، پھر پوچھنے لگا:

"کیا ہوا خانم آغا؟" اور اس نے کوٹ کے نچلے استر سے اپنا چہرہ پونچھا۔

"مٹھائی کھلواؤ، روح اللہ خان،" ہمسائی بولی، "بیٹا ہوا ہے۔"

اس نے ہمسائی کو مشکوک نظروں سے دیکھا، پھر دو تین بار کھنکار کر گلا صاف کیا، پھر بولا:

"ہو گیا؟ کب ہوا؟" اس کی آواز پھنسی پھنسی اور عجیب سی تھی۔

ہمسائی نے اپنی چادر پھر سے کھول کر سر پر ڈال لی اور بولی:

"ابھی، ایک گھنٹہ بھی نہیں ہوا۔ میں نے آ شیخ حسن کو بھیجا تھا کہ مدد کے لیے عالیہ خانم کو بلا لائیں۔"

"ہاں، میں چلی آئی،" خانم جان بولیں، "بچہ جنوا دیا۔ ٹھیک ٹھاک ہے، ماشاءاللہ۔"

اس نے اچٹتی ہوئی نظر زچہ پر ڈالی، پھر دیر تک بچے کی طرف دیکھتا رہا، جوتے اتارے اور کمرے کے اندر چلا آیا۔ میں نے دروازہ بند کر دیا۔ اس نے بستر کی طرف دیکھے بغیر ہاتھ سے اپنی بیوی کی جانب اشارہ کیا اور ہمسائی سے پوچھا:

"یہ کیسی ہے؟"

نقاہت کی وجہ سے زچہ کا سر نیچے کو ڈھلکا ہوا تھا۔ ہمسائی کے بجائے خانم جان نے جواب دیا:

"کمزوری بہت ہے، لیکن سب ٹھیک ہو جائے گا، بحق مرتضیٰ علی۔"

آدمی نے کوٹ اتار کر کمرے کے ایک گوشے میں پھینکا اور کئی بار کھنکار کر دوسرے گوشے میں چولھے کے پاس تھوکنے لگا۔ زچگی کے اس دردناک زنانہ منظر اور موت کی ان گفتگوؤں کے بعد ایسی وحشت کے مرد کا آ دھمکنا ایک بے رحمانہ منظر معلوم ہو رہا تھا۔ وہ بچے کے قریب جا کر جھکا، پھر اس نے زمین پر گھٹنے ٹیکے۔ وہ پتلون کو آگے سے کھجا رہا تھا۔

ہمسائی نے پھر سے سر پر چادر درست کی اور کہا:

"ہاں، تو روح اللہ، کیا کھلا رہے ہو؟"

"جو کہیے، بہن،" وہ بولا۔

Scanned with CamScanner

ماں بہت کم زور ہو گئی ہے، خانم جان اس کے قریب آ کر بولیں، "اسے آرام کی ضرورت ہے۔" وہ زرار کیں، پھر بولیں، "کوئی ایسی بات نہ ہونے پائے کہ وہ ڈر جائے۔ تکان بالکل نہ ہونا چاہیے۔ بچہ بھی الحمدللہ ٹھیک ٹھاک ہے۔ ماشاءاللہ بڑا پیارا بچہ ہے۔"

شوہر نے ایک نظر خانم جان کو دیکھا، پھر زیرِ لب کہا:

"بڑی تکلیف کی آپ نے، خیر، دیکھیے۔"

اس کی پھنسی پھنسی بیمار سی آواز سے ڈر معلوم ہوتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کے گلے اور سینے کے اندر خراشیں ہی خراشیں ہیں۔

"بس خدا کا شکر ہے،" خانم جان بولیں، "سب کچھ خیر خیریت سے ہو گیا۔ ہم اب چلتے ہیں۔"

وہ اٹھ کھڑی ہوئیں، سر پر رومال لپیٹا، پھر اپنی چادر زچہ پر ڈال دی اور چپکے چپکے اسے کچھ ہدایتیں دینے لگیں۔

آدمی اب بچے کو گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر کچھ گھبراہٹ اور خشونت کی سی کیفیت تھی۔ وہ آگے سے پتلون کو، اپنے پیٹ کو اور جانگھ کو لگاتار کھجا رہا تھا۔

"لاالٰہ الااللہ،" اس نے زیرِ لب کہا۔

"اٹھو، تم بھی کپڑے بدل کر آرام کرو،" خانم جان نے اس سے کہا، "ماں کو بھی آرام کی ضرورت ہے۔"

"لاالٰہ الااللہ،" مرد بولا، "یہ والا بھی ——"

اس نے اپنی بات پوری نہیں کی۔ وہ اپنی مونچھ کا کونا اور ہونٹ چبا رہا تھا۔ اسے بھی پتا تھا کہ بچہ مر جائے گا، مگر یہ شاید وہ بھی نہ جانتا تھا، نہ اس کی سمجھ میں آ رہا تھا کہ کیوں۔

زچہ نے اب ہاتھوں سے منہ چھپا لیا تھا اور بے تحاشا رو رہی تھی۔

ہم پانی برستے میں گھر کو لوٹے۔ خانم جان بار بار "ستغفراللہ" کہہ رہی تھیں۔ تنگ اندھیری گلیوں میں بارش کی وجہ سے کیچڑ ہی کیچڑ تھی۔

میں نے سر اٹھایا اور پوچھا:

"خانم جان، اس کے بچے مر کیوں جاتے ہیں؟"

بارش کے چھینٹے میرے منہ پر پڑ رہے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں بارش ہی سے باتیں کر رہا ہوں۔

خانم جان بولیں:

"مجھے کیا پتا۔ یہ بچوں کے سمجھنے کی باتیں نہیں ہیں۔"

میں جان گیا تھا کہ یہ کوئی ایسی بات ہے جو میری سمجھ میں آنا چاہیے مگر نہیں آ رہی ہے۔ اور اب میرا دل اسے سمجھنا چاہتا بھی نہیں تھا۔

خانم جان بولیں:

"جینا مرنا خدا کے ہاتھ میں ہے۔"

پانی ہمارے چہروں پر بے دردی سے طمانچے مار رہا تھا۔ ہمارے پاس چھتری وتری کچھ نہیں تھی۔ میں نے خانم جان کی ردا کا گوشہ تھام رکھا تھا۔

"خانم جان،" میں نے پوچھا، "وہ آدمی کھانسے کیوں جا رہا تھا؟"

"میں کیا جانوں؟" خانم جان بولیں، "ہوگی کوئی بیماری۔"

میں نے پوچھا:

"یہ بچہ بھی اس کا مر جائے گا؟ سے تا؟"

خانم جان بولیں:

"شد ہنک ہے۔"

"میں نے خود دیکھا تھا،" میں بولا، "اس کے منہ پہ یہ بڑے بڑے دھبے تھے۔ اس کے ابا کو بھی پتا ہے۔"

"شاید---" خانم جان بولیں، "اللہ چاہے تو بچ جائے گا۔"

لیکن مجھ کو پتا تھا کہ بچہ مر جائے گا اور کوئی کچھ نہ کر سکے گا۔

اس رات مجھ کو نیند نہیں آئی۔ مرنے کا خیال آ رہا — پیدا ہونے کا اور مرنے کا۔

مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ پھر اس عورت کے یہاں بچہ ہوگا، اور اب کے اس کی زندگی اور بھی کڑی، اور بھی تلخ ہوگی۔ کیتلے میں بچے کا سونا، عورت کا رونا، وہ بچے جو مر گئے، خانم جان کی تسلی کی باتیں--- موت کے ساتھ-- بارش میں مجھے نیند آ گئی۔

اور رات لمبی تھی۔

OO

(فارسی عنوان: "تولد")

اسماعیل فصیح

فارسی سے ترجمہ: اجمل کمال

عشق

غروب کے وقت بازارچے کا آسمان تنگ اور زخم کھایا ہوا لگتا تھا؛ اُفق گویا خون آلود تھا۔ شام کے وقت کالے بادل گھر آئے تھے اور پھر طوفان آگیا تھا۔ رات کے ختم ہوتے ہوتے ہوا شوکت خانم کے احاطے میں لگے ہوئے انگور کے درخت کی شاخوں پر آ رکی تھی اور سوکھی ہوئی ٹہنیوں کو لہرا لہرا کر اوپر کی منزل پر بنے ہوئے کرائے کے کمرے کی کھڑکی کے شیشوں سے ٹکرا رہی تھی۔ (کھڑکی کا ایک شیشہ چٹخا ہوا تھا اور اس پر اخباری کاغذ چپکا دیا گیا تھا۔) کمرے میں ایک عورت اور اس کا شوہر تیل سے جلنے والی بخاری کے پاس بیٹھے تھے۔

عورت ہاتھ میں سوئی دھاگا لیے ایک سفید کپڑے کے کناروں کو ٹرپ کر بچے کا پوتڑا بنا رہی تھی۔ لیکن آج اس کا دھیان کہیں اور تھا۔ کچھ کچھ دیر بعد وہ کنکھیوں سے اپنے شوہر کی طرف دیکھ لیتی، پھر اپنے آپ میں کھو جاتی۔ جانتی تھی کہ بدبختی پھر پیش آنے والی ہے۔ دو ہفتے ہو گئے تھے کہ پیٹ کے بچے نے — پہلے والے کی طرح، جو تیسرے مہینے میں جاتا رہا تھا — جنبش نہیں کی تھی۔ پیڑو درد کر رہا تھا، لیکن وہ نہیں چاہتی تھی کہ ابھی اس کے شوہر کو پتا چلے۔ اسے اسپتال سے اور پیٹ کے چیرے جانے سے ڈر لگتا تھا۔

وہ اکیس برس کی تھی اور شمال کی رہنے والی تھی۔ شوہر تیس سال کا تھا اور اسی بازارچے کا تھا۔ اندر شہر میں کتابوں کے بازار میں چھوٹی سی دکان کرتا تھا: چھوٹا سا کاروبار، چھوٹی سی زندگی۔ بالاخانے پر دو کمرے کرائے پر لے رکھے تھے۔ اس محلے کے اس طرف کے مکان کی پشت قبلے کی طرف تھی۔ یہ اُن احاطوں میں سے تھا جن میں، تیس سال پہلے کی کارواں سرایوں کی طرح، ہر

Scanned with CamScanner

کرایےدار کے واسطے ایک کمرہ ہوتا تھا۔ حال ہی میں مکان میں بجلی پہنچی تھی، سامنے کی دیوار پکی ہوئی تھی، لوہے کا پھاٹک اور گھنٹی لگی تھی، اور سب کچھ۔ مگر احاطہ ابھی تک بوڑھی شوکت خانم کی ملکیت تھا۔ اس رات بالاخانے کی کھڑکی طوفان کے جھونکوں کی زد میں تھی۔ عورت اور اس کا شوہر دونوں اپنے آپ میں گم تھے اور اندر سے تھکے ہوئے تھے۔

عورت نے ایک آہ بھری۔ بولی: 'خدا کرے بارش ہو جائے تو کچھ سکون ملے۔'

مرد نے رسالے پر سے سر اٹھایا۔ کھڑکی پر سرسری سی نظر ڈالی۔ بولا: 'ہو گی۔'

پھر دونوں بہت دیر تک خاموش رہے۔

عورت بولی: 'کچھ رات پہلے جب بارش ہو رہی تھی اور ایسا ہی طوفان تھا، تم کوئی بات کرنا چاہ رہے تھے۔۔۔'

مرد نے جمائی لی۔ کہنے لگا: 'میری بہن کا قصہ تھا۔'

"لیلیٰ کا؟"

'ہاں۔'

'ویسے کس طرح مری تھی وہ؟'

مرد نے ٹانگیں پھیلا لیں۔ ایک لمبا سانس لیا۔ بات شروع کرنے کو تھا کہ کھڑکی کے شیشوں سے بارش کے ٹکرانے کی آواز آئی۔ ذرا دیر میں تیز بارش نے پورے بازار کو شرابور کر دیا۔ مرد اٹھ کر کھڑکی کے پاس گیا اور اس کے پٹ بند کرنے لگا جو ہوا کے زور سے کھل گئے تھے۔ وہ دروازے کے باہر سے اپنے جوتے اٹھا کر اندر لے آیا۔ پھر باہر بالکنی میں جا کر قمیص اور موزے اور دوسرے کپڑے اکٹھے کرنے لگا جو اس شام اس کی بیوی نے دھو کر جنگلے پر پھیلا دیے تھے۔

ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا: 'مال دار لوگ بارش سے خوش ہوتے ہیں۔'

بیوی نے کہا: 'ہاں۔ خوشی انھیں کی ہے۔ اور بدبختی ہم بےچاروں کی۔ لاؤ مجھے دے دو۔"

اس نے اس پرانے کپڑے کو الگ رکھ دیا جس کا وہ قنداق بنا رہی تھی۔ اٹھ کر شوہر کے ہاتھ سے گیلے کپڑے لیے اور ایک ایک کر کے الماری کے گرد اور اوپر پھیلانے لگی۔

کچھ نم سی گیلے کپڑوں کی بو کمرے میں پھیل گئی۔ مرد ساکت اور سوچ میں گم تھا۔ عورت نے اس کی آنکھوں میں دیکھا کہ وہ گزری باتوں کو، جو بلاشبہ دور دراز کی، بری اور تلخ باتیں تھیں، ذہن میں دہرا رہا ہے۔ کپڑے پھیلا کر وہ بخاری کے پاس لوٹ آئی۔ کیتلی اور چائے دانی بخاری پر رکھی ہوئی تھی۔ عورت کے ننگے پیر جاجم پر چلتے ہوئے ہلکی سی آواز پیدا کر رہے تھے۔ بجلی کا ایک چھوٹا سا بلب کمرے میں زرد روشنی بکھیر رہا تھا۔ چھت فقط شہتیروں اور چٹائی کی بنی ہوئی تھی۔ شہتیروں کی کچی لکڑی لٹکتی اور باہر کو نکلی ہوئی گرہوں کے پاس سے پھٹ رہی تھی۔ دیواروں کا

پلستر اکھڑا ہوا اور گندا تھا۔ دیوار پر بہت سی چوکھٹوں والے عکس اور شمائل لگے ہوئے تھے: رستم کے زانو پر سر رکھے ہوئے سہراب کی تصویر، ملکہ فرخ لقا کا چہرہ، حضرت ابراہیم، اسماعیل کو قربان کرنے کی تیاری کر رہے ہیں، اور فرشتے اتر رہے ہیں، شیشے پر بنا ہوا نقش جس میں فرشتے سورج کی شعاعوں پر سوار ہیں، اور باسر کی بنی ہوئی ایک بڑی سی تصویر جس میں ایک آسمانی فرشتہ ایک باغ میں تخت پر بیٹھا ہے اور رد گرد اس کے مصاحب اور فرشتے خدمت میں حاضر ہیں۔ تمام تصویروں پر وقت کی گرد کے علاوہ بے اعتنائی کا غبار بھی جما ہوا تھا۔ عورت چائے کے سامان کی سینی طاقچے سے اتار لائی اور اسے فرش پر رکھ دیا۔ دو پیالیوں میں چائے ڈالی۔ ایک پیالی، شکر کی ٹکڑیوں کے ساتھ، شوہر کے سامنے رکھی۔ اپنے لیے شکر لی، پیالی اٹھائی اور اسی قنداق کے کپڑے کے پاس لوٹ آئی۔ پھر بیٹھ کر سوئی دھاگا اور کپڑا ہاتھ میں لے لیا۔

بولی: "تمہاری بہن کا کیا قصہ تھا؟ تم نے کبھی مجھے نہیں بتایا۔"

مرد نے ایک ہما سگریٹ سلگایا اور گیلے کپڑوں کی بُو اور بارش کے شور کے درمیان قصے کا آغاز کیا۔ عورت کے ساتھ ساتھ گویا تصویروں کے سب لوگ، مقدس ہستیاں اور فرشتے بھی سننے لگے۔ کہنے لگا:

o o o

ہم دو بھائی بہن تھے۔ میری بہن لیلیٰ مجھ سے تین سال بڑی تھی۔ میری ایک اور بڑی بہن بھی ہوئی تھی جو بچپن ہی میں مر گئی تھی۔ ابا سند قرآن خواں تھے، اور جب میں تین سال کا تھا، سِل کے مرض میں چل بسے تھے۔ ابا کے مرنے کے بعد ہماری زندگی اچھی نہیں گزری۔ ہم، ہمیشہ کی طرح، اسی کمرے میں رہتے رہے۔ اماں کپڑے دھونے اور مکان کی صفائی کے کام کرتی تھیں۔ کبھی کبھی کمرے کا دو دو تین تین مہینے کا کرایہ چڑھ جاتا۔ یہی شوکت خانم مالک مکان تھی۔ ابا مرحوم کی وجہ سے ہمارا لحاظ کرتی تھی۔ اماں کو یہ کمرہ پسند تھا۔ یہاں سے اٹھنا نہیں چاہتی تھیں۔ ہم یہاں جانے پہچانے تھے اور محفوظ تھے۔ مجھے اور بہن کو ہمیشہ اُن سید ابوالفضل خاں کے بچے کہا جاتا تھا۔

میرا اور بہن کا بچپن اسی کمرے میں گزرا۔ انیس سو اکتالیس سے اکاون تک، اسی جنوبی تہران میں۔ ہمارے دن تنگ دستی اور بدبختی میں بسر ہوتے تھے۔ بہن بیمار نہیں تھی، لیکن روحانی طور پر ہر چیز کے بارے میں بے حد حساس تھی، اور اس میں ایک عجیب طرح کی خوش باشی تھی۔ ہمیشہ مجھ سے عشق کے بارے میں باتیں کرتی رہتی تھی، فرشتوں کے عشق کے قصے سناتی تھی اور مجھے بہت چاہتی تھی۔ روز ایسا ہوتا کہ گود میں لے کر مجھ سے باتیں کرتی رہتی، کہانیاں سناتی رہتی۔ ہم کھڑکی میں سے، اسی کھڑکی میں سے، بازار چے اور کاج کے درختوں کے اوپر کے آسمان کو دیکھا کرتے۔ مگر کبھی کبھی مجھے احساس ہوتا تھا کہ میری بہن کو کوئی ایسا غم ہے جو بازار چے کے دوسرے لوگوں کو نہیں ہے۔ حسین بھی بہت تھی۔ کاش، اس کی کوئی تصویر ہوتی۔

لیلیٰ۔۔ جہاں تک مجھے یاد ہے، چھ سات سال کی عمر سے۔۔ آسمانوں میں فرشتوں کی زندگی اور باغِ بہشت کی خوب صورتی کی باتیں کیا کرتی تھی۔ دس سال کی عمر کو پہنچنے تک یہ باتیں رفتہ رفتہ ایک حسین دیو مالا یا شاید ایک طرح کے یوٹوپیا کی شکل اختیار کر چکی تھیں۔ فرشتوں اور بہشت کے بارے میں باتیں کرتے کرتے وہ کسی انسان کو اپنے ساتھ خوابوں میں لے جاتی تھی۔ اسے یقین تھا: ان گندے لوگوں سے دور ایک تنہا، پُرسکون اور حسین مقام موجود تھا۔ کبھی وہ ان تصویروں میں بنے ہوئے فرشتوں کی طرف اشارہ کرتی کہ کیسے چھوٹے چھوٹے، نرم اور نازک ہیں، اور بادلوں اور سورج کی شعاعوں میں سفر کر سکتے ہیں۔ کبھی اس کا جی چاہتا کہ ہم سب اس گھر سے اپنا اسباب اٹھا کر کہیں چلے جائیں، کسی ایسی جگہ جہاں پیڑ ہوں، پھول ہوں، دریا ہو اور آزادی ہو۔ اور رفتہ رفتہ ان باتوں نے لیلیٰ کے لیے خواب اور خیال کی صورت اختیار کر لی۔

لیکن ہماری کھڑکی کے نیچے شوکت منزل کا احاطہ حقیقی تھا۔ دن بھر ہمیں ہمسایوں کے، پانی کے حوض پر، محلے اور باہر کے مکان کی گندگی پر، جھگڑے اور تکرار کرنے کی آوازیں آیا کرتیں۔ اور راتوں میں مدہوشوں کی صدائیں، اور بازار کے نیچے غنڈوں کی جانوری کا شور، شادیوں اور ماتموں کا غل، جمعداروں اور اذانوں کی پکاریں، اور گلی میں لڑکوں کی گالی گفتار سنائی دیتی۔ مگر یہ سب زندگی نہیں تھی۔ یہ سب کچھ اچھا نہیں تھا۔ اماں کی آہ و زاری بھی اچھی نہیں تھی، جو کپڑے دھو دھو کر ہمیشہ تھکن اور تنگی کے عالم میں ہوتی تھیں اور کہتی تھیں: جو مر گیا وہی راحت میں ہے، آخر ہم بھی مٹی کے نیچے جا سوتے ہیں۔ یہ زندگی نہیں تھی۔ میری بہن کہتی تھی: خدا نے ہمیں اس دنیا میں اس لیے پیدا نہیں کیا کہ بلاوجہ غمگین رہیں اور آخر مٹی کے نیچے جا سوئیں۔ خدا نے ہمیں اس لیے پیدا کیا تھا کہ ہماری روح فرشتوں کی طرح آزاد رہے۔ اور فرشتوں ہی کی طرح سب سے پیار کریں۔ زندگی پاکیزہ اور بے آلائش تھی۔ ہر صبح وہ ایسی بہشت کے خواب مجھ سے بیان کیا کرتی۔ کبھی میں بھی اس کے خواب میں ہوتا، کبھی نہ ہوتا۔ لیکن خواب ہمیشہ ہوتے تھے۔

ابا، میں نے بتایا، دین دار آدمی تھے۔ بُرے آدمی نہیں تھے۔ سنا تھا لیلیٰ کو بہت چاہتے تھے۔ میری بہن کی روح کی تشنگی کا سرچشمہ ایک حد تک ابا کی جدائی بھی تھا۔ ان کا انتقال اسی کمرے میں ہوا تھا۔ مجھے ان کا مرنا یاد نہیں ہے۔ سنا ہے آخر آخر انھوں نے بہت تکلیف اٹھائی۔ ان کے مرنے کی رات بھی مجھے یاد نہیں۔ بس ذہن میں بہت دھندلی اور شکستہ سی ایک چیز سی ہوئی ہے کہ اس کمرے میں ابا کے چہرے پر سفید چادر ڈال دی گئی تھی۔ بعد میں میری سمجھ میں آیا کہ اسی کمرے میں ابا کے مرنے کا منظر لیلیٰ کے لیے کس قدر دردناک رہا ہوگا، اور کس قدر گہرا۔ ابا جب تک زندہ تھے، رات کو اسے کہانیاں سنایا کرتے تھے۔۔ آخری رات تک۔ قرآن کے قصوں میں سے: آدم، نوح، یوسف اور مریم کے قصے۔ لیلیٰ کی روح کی حساسیت کا باقی حصہ، اور اس کا فرشتوں سے لگاؤ، ابا کی سنائی ہوئی انھیں کہانیوں کی بدولت تھا۔ اور بعد میں اس کی زندگی کی

Scanned with CamScanner

آخری پرتوں کا منظر جو اسی کمرے میں، لیلیٰ کی آنکھوں کے سامنے، تمام ہوئیں۔

کبھی کبھی میرے لیے لیلیٰ کے اس فرشتوں جیسے عشق کو باور کرنا مشکل ہو جاتا۔ میرے لیے لڑائی جھگڑے، فریادیں، کھینچا تانیاں، رنجشیں، زبان درازیاں اور بدسلوکیاں، یہاں شوکت خانم کے احاطے میں، ہماری حقیقی اور اصل زندگی کا حصہ تھیں۔ خاص طور پر شوکت خانم کا بیٹا عبداللہ جو غنڈا تھا اور بے حد کمینہ تھا۔ جب کبھی گھر میں داخل ہوتا تو اپنے چھوٹے یتیم بہن بھائیوں کی بات سے بات ٹھکائی کیا کرتا۔ ایک بار اس نے محلے کی ایک عورت کے شوہر کو بہت مارا، کیوں کہ اس پر کرے کا دو مہینے کا کرایہ چڑھ گیا تھا، اور پھر اسے اٹھا کر حوض میں پھینک دیا۔ لیکن ان تمام دقتوں کے باوجود لیلیٰ کبھی میرا دل برا نہ ہونے دیتی۔ آدمیوں کی فطری سیکی پر، یا اپنی باتوں اور خوابوں پر کبھی شک نہ کرنے دیتی۔ کہتی تھی کہ لوگ، خواہ وہ عبداللہ ہی کیوں نہ ہو، نہیں جانتے کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ اگر جانتے تو ایک دوسرے کو سمجھتے، ایک دوسرے پر مہربان ہوتے، ایک دوسرے سے محبت کرتے۔ ایک گنگ سوال ہمیشہ میرے سر میں چکر کاٹتا رہتا تھا: آخر کیوں میری بہن، اپنی تمام فرشتوں کی باتوں اور عشق کے تذکرے کے باوجود، خود دنیا میں تنہا ہے؟ کیوں خوف زدہ ہے؟ کیوں چھپتی پھرتی ہے؟ کیا اس کی روح کی تہہ میں وہ دوسری چیزوں سے واقف نہیں ہے؟ ایسے بھی وقت آتے تھے جب میں خوف زدہ ہو کر سوچتا کہ ضرور عبداللہ کی دنیا حقیقی ہے اور میری بہن کی دنیا محض خیالی۔

ایک رات جب میں احاطے سے واپس آ رہا تھا، مجھے شوکت خانم کے کمرے میں سے آوازیں سنائی دیں۔ میں دبے پاؤں آگے بڑھا اور جھانک کر دیکھا۔ عبداللہ کمرے کے ایک کونے میں آئینے کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چاقو تھا۔ شوکت خانم بیٹے کے برابر میں بیٹھی رو رہی تھی اور اپنا سر اور منہ پیٹ رہی تھی۔ عبداللہ کسی وجہ سے طیش میں تھا۔ وہ بار بار چاقو سے خود کو مار رہا تھا، مگر زیادہ زور سے نہیں۔ اس کی ماں منت اور زاری کر رہی تھی، آسمان سے دعا کر رہی تھی، اور کہہ رہی تھی کہ چاقو کا ایک وار مجھ پر بھی کر دو۔ باقی بچے ڈر کے مارے لحافوں میں دبکے ہوئے تھے۔ کہا جاتا تھا کہ عبداللہ شادی کرنا چاہتا ہے۔ ان حرکتوں سے وہ زور ڈالنا چاہتا تھا کہ اس کے لیے بیوی تلاش کی جائے۔

مختصر یہ کہ اس قسم کے تماشوں اور ایسے لوگوں کے درمیان ہماری زندگی گزر رہی تھی: اسی کمرے میں، انھیں تصویروں اور شمائلوں کے ساتھ۔ اور میری بہن ہمیشہ اس خواب اور خیال میں رہتی، یا اس خواب اور خیال کی صورت میں دیوانگی میں مبتلا رہتی، کہ لوگ فرشتے ہیں، یا انھیں فرشتہ ہونا چاہیے۔ اگر کسی لڑکی کی روح خواب اور خیال سے بھری ہوئی ہو تو وہ کیا کرے؟

پھر لیلیٰ بیمار پڑ گئی۔ جو بات لیلیٰ کی بیماری کا سبب بنی، گرمیوں کی ایک صبح اسی احاطے میں پیش آئی۔ مجھے وہ صبح اچھی طرح یاد ہے۔ میں اس وقت آٹھ سال کا تھا۔

لیلیٰ نے مجھے نیند سے جگایا، اور سراسیمگی کے عالم میں میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی کھڑکی کے پاس لے آئی۔ احاطے میں، حوض کے کنارے، نالے کی اینٹوں کے سامنے کسی چیز کی طرف اشارہ کرنے لگی۔ شوکت خانم کے احاطے میں دن رات ہر قسم کی باتیں پیش آیا کرتی تھیں۔ آج جو چیز احاطے کے میدان میں پڑی تھی، کپڑے کے ایک سفید پارچے میں لپٹی ہوئی تھی۔ اس کی شکل بچے کے قنداق کی سی تھی اور وہ خون آلود تھی۔ شوکت خانم اور پڑوس کی ایک عورت قنداق کے پاس کھڑی کھسر پھسر کر رہی تھیں۔ مجھے ان کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے دھیمی آواز میں لیلیٰ سے پوچھا: 'کیا ہے؟ بچہ ہے؟' لیلیٰ بولی: 'پتا نہیں۔' پوچھا: 'مُردہ ہے یا زندہ؟' بولی: 'پتا نہیں۔' بعد میں پتا چلا کہ کافی فاطمہ کا بچہ ہے۔

کافی فاطمہ شوکت خانم کی خادمہ تھی۔ ہم سب نے دیکھا تھا کہ وہ حاملہ ہو گئی ہے۔ فاطمہ پست قد اور لاغر تھی اور اس کی ایک آنکھ بہی ہوئی تھی۔ وہ بے ماں باپ کی تھی۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ کہاں سے آئی تھی؛ یقیناً سڑک کے کنارے پڑی ملی ہو گی۔ جب سے مجھے یاد تھا کافی فاطمہ شوکت خانم کی خدمت میں تھی۔ بعد میں شوکت خانم نے اُسے نکال دیا۔ کافی فاطمہ میری بہن کی ہم سن تھی، تھوڑی سی بہت بڑی ہو گی۔ حمل کے آخری مہینوں میں احاطے اور بازارچے کے تمام لوگ اسے فحش، تمسخر آمیز اور نفرت بھری نظروں سے دیکھنے لگے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا کیوں تھا۔ اُن دنوں کی ایک اور بات بھی میری سمجھ میں نہیں آتی، کہ آخر شوکت خانم اُسے گھر سے نکال کیوں نہیں دیتی تھی۔ اس کا سبب یقیناً عبداللہ کا خوف یا لحاظ رہا ہو گا۔ وہ وحشی کچھ بھی کر سکتا تھا۔ کوئی بات ضرور تھی: بچہ عبداللہ ہی کا تھا۔ مگر میں یہ بات اُس وقت نہ سمجھ سکتا تھا اور نہ جانتا تھا۔ کافی فاطمہ کا شک یہ تھا کہ خود کو حاملہ ہو جانے دیا۔

میری بہن نے کہا: 'ہاں، کافی فاطمہ ہی کا ہے۔' میں نے پوچھا: 'اب یہ لوگ کیا کریں گے؟' لیلیٰ نے کہا: 'پتا نہیں۔' اُس کے ہونٹ لرز رہے تھے اور گالوں پر آنسو بہہ رہے تھے۔

شوکت خانم نے کھسر پھسر کرنا بند کیا، جھک کر خون آلود قنداق کو اُٹھایا، اور باہر کی کوٹھری کی طرف چل دی۔ قنداق کو خود سے دور کر کے یوں اٹھائے ہوئے تھی جیسے اسے اس نجس اور نابکار چیز سے شرم آ رہی ہو۔ حرام کے بچے کا، مُردہ ہو یا زندہ، کیا کیا جا سکتا ہے؟ میں اس تماشے میں اتنا کھو چکا تھا کہ لیلیٰ کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا جو میرے برابر میں کھڑکی کے پاس کھڑی تھی۔ شوکت خانم بیرون خانے کے زینے سے اُتر کر نیچے چلی گئی۔ پڑوس کی بوڑھی عورت حوض کے کنارے دانتوں میں انگلی دبائے کھڑی تھی۔ مجھے ایک گم شدہ لمحے میں کوٹھری کے اندر سے جیسے بچے کے رونے کی سی آواز سنائی دی ہو۔ پھر یہ آواز گم ہو گئی۔ شوکت خانم زینہ چڑھ کر اوپر آ گئی؛ اس کے ہاتھ میں لتھڑا ہوا پارچہ تھا۔ پڑوس کی بوڑھی عورت حوض کے کنارے بیٹھ گئی اور دعا کرنے لگی۔ شوکت خانم نے پارچے کو پیر دھونے کی جگہ میں ڈال کر جھکی اور حوض میں سے

Scanned with CamScanner

دو لوٹے بھر کر بیرون خانے کی کوٹھری میں واپس چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد پھر آئی اور دو لوٹے بھر کر لے گئی۔ تب میں نے اپنے پاس کسی کے فرش پر گرنے کی آواز سنی۔ میری بہن تھی۔

لیلیٰ کم و بیش ایک سال بستر پر پڑی رہی۔ کبھی معلوم نہ ہو سکا کہ اُسے تکلیف کیا ہے۔ شوکت خانم کے احاطے کی اِن تمام بدبختیوں اور زندگی کے شوروشغب کے درمیان کسی چیز کی اہمیت نہیں تھی۔ اماں نے دو ایک بار لیلیٰ کو اٹھایا، اس کے سر پر چادر ڈالی اور دواخانے لے گئیں جو اُس وقت بازار پہ آشیزبادی اور اسپریہ کے پاس تھا۔ اس کے بعد، چوں کہ اُنھیں دن میں فرصت نہیں ملتی تھی، زیادہ تر گھریلو دوائیں دیتی رہیں اور دعا کرتی رہیں۔ شروع میں سب کا خیال تھا کہ میری بہن کو مرگی ہو گئی ہے۔ پھر کہنے لگے میریا ہو گیا ہے۔ نہیں، زرد یرقان ہو گیا ہے۔ بعضے کہتے تھے کہ ابا سے سِل ورثے میں ملی ہے۔ اماں کہتی تھیں کہ کچھ نہیں ہے کیوں کہ ڈاکٹر صرف طاقت کی دوائیں دیتے تھے۔ بس، اس کے بعد کچھ نہیں۔ میری بہن کی بیماری بیماری اور سب کی زندگی میں گویا گھل مل گئی۔

اُس سال خزاں اور جاڑے میں مَیں پہلی جماعت میں جایا کرتا تھا اور دن کے وقت لیلیٰ کو، جو گھر میں رہتی تھی، دیکھنے کا کم ہی اتفاق ہوتا تھا۔ احاطے کے رہنے والوں کی نظر میں وہ "سید ابوالفضل خاں کی بچاری بیمار لڑکی" تھی۔ سب اُسے پسند کرتے تھے۔ اُس کی پاکیزگی اور نجابت کی باتیں سب کی زبان پر تھیں۔ لیکن اُسے دیکھتا کوئی نہیں تھا۔ بستر سے اٹھنے کے بعد بھی وہ شاذ ہی نیچے احاطے میں آتی تھی۔ مجھے یاد ہے، صرف صبح سویرے، دوسرے لوگوں کے بیدار ہونے سے پہلے، وہ نیچے غسل خانے جاتی اور وضو کرتی تھی۔ اور بس۔ ابھی پورے گیارہ برس کی بھی نہیں ہوئی تھی۔

اس کے بعد میری بہن کی سرگزشت اس دنیا میں ایک عورت کے طور پر شروع ہوئی۔

مجھے ٹھیک سے یاد نہیں کہ اُس کی شادی کی باتیں کب یا کہاں سے شروع ہوئیں۔ عبداللہ کے لیے دلہن کی تلاش بہت دنوں سے جاری تھی؛ کسی اچھی، شریف اور باادب لڑکی کی — سب سے بڑھ کر باادب۔ میرے خیال میں عید کے آس پاس یہ باتیں ہونا شروع ہوئیں۔ لیلیٰ ابھی بیماری سے اٹھی تھی، مگر ہمیشہ سے زیادہ کمزور اور پژمردہ تھی۔ اور تنہا اور خاموش۔ کمرے کے کونے میں ڈری سہمی، صبر کیے پڑی رہا کرتی۔

میں ڈرتا تھا اور میرا دل جلتا تھا۔ نہیں جانتا تھا کہ آخر کیا ہوگا۔ جب ہم اکیلے ہوتے اور باتیں کرتے تو لیلیٰ مجھے تسلی دیتی۔ ہمیں کبھی خوف زدہ نہیں ہونا چاہیے۔ نہ غمگین ہونا چاہیے۔ مگر مجھے صاف دکھائی دے رہا تھا کہ لیلیٰ کو خوف اندر سے کھائے جا رہا ہے اور وہ کسی نئے عذاب میں گرفتار ہے۔

میں نے کبھی کبھار شوکت خانم کے احاطے میں شادیاں ہوتے دیکھی تھیں۔ شادی کا مطلب

ساز اور ڈھول اور رقص اور مسرت تھی۔ میں یہ باور نہیں کر سکتا تھا کہ لیلیٰ بھی دلہن بنے گی، دوسری لڑکیوں کی طرح اس کی بھی شادی ہوگی، اس کے سر کے اوپر سے شیرینی نچھاور کی جائے گی، وہ بھی عروسی چوکی پر بیٹھے گی، کسی کی بیوی بنے گی، حاملہ ہوگی اور بار بار بچے جنے گی، زندگی میں گم ہو جائے گی۔ مگر ٹھیک ہے، ہر لڑکی کو اپنے گھر کا ہونا ہی پڑتا ہے۔

ہماری ایک بوڑھی خادمہ تھیں، جنھیں ہم خالہ خانم کہتے تھے۔ بوڑھی تھیں مگر بہت زندہ دل اور چنچل۔ ان دنوں وہ بہت آتیں اور خاطریں کرتیں۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر لیلیٰ کی شادی ہو جائے تو اس کی حالت ٹھیک ہو جائے گی۔ لیلیٰ کی عمر بھی کوئی مسئلہ نہیں تھی۔ خالہ خانم کا کہنا تھا کہ نو برس کی عمر کے بعد لڑکی کی شادی جائز ہے۔ ابا نے لیلیٰ کا شناختی کارڈ نہیں بنوایا تھا۔ (پہلی لڑکی کے جاتے رہنے پر ابا نے اس کا کارڈ منسوخ نہیں کرایا تھا اور سستی کے سبب یہی کارڈ لیلیٰ کے لیے رکھ لیا تھا۔) اس طرح اس شناختی کارڈ کی رو سے لیلیٰ کی عمر سترہ سال تھی۔ خالہ خانم اور عبداللہ کی ماں ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھیں۔ سو آخر انھیں کا کہا پورا ہوا۔ لڑکے کا خاندان رتبے میں اونچا تھا اور دباؤ بھی سخت تھا۔

ماں نرم پڑ گئیں۔ نسبت ٹھہر گئی۔ پھر شاید صرف اس احمقانہ سبب سے کہ محرم اور صفر کے آنے سے پہلے شادی ہو جائے، تقریب کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ طے پایا کہ نکاح اور رخصتی ساتھ ساتھ ہو۔

تقریب سے ہفتہ بھر پہلے شوکت خانم آئیں اور آ کر ماں کو مٹھی بھر پیسے دیے۔ اس رقم سے اماں نے میری بہن کے واسطے آئینہ، چراغ، لباس، سنگھار کا سامان، گھر کا اسباب اور کچھ چھوٹی موٹی چیزیں خریدیں۔ شادی کی خبر تمام محلے میں پھیل چکی تھی۔ اماں اب کام پر نہیں جاتی تھیں، گھر ہی میں رہتی تھیں۔ بعد دوپہری کے لیے خالہ خانم آئیں۔ مہر اور شادی کی دوسری جو تفصیلیں طے ہوئیں وہ تو اب مجھے یاد نہیں۔ صرف اتنا یاد ہے کہ دونوں طرف کے لوگ ناخوش تھے؛ خالہ خانم اور اماں کا کہنا تھا کم ہے، شوکت خانم جو کچھ دے بیٹھی تھی اسی پر کڑھ رہی تھی۔ ان دنوں جب بھی عبداللہ محلے میں آتا، شوکت خانم اور ہمسائیاں تالیاں بجا کر اس کا استقبال کرتیں اور شاد و آباد، شاد و آباد پکارتیں۔ میری بہن خاموش رہتی تھی۔

جشن کے واسطے شوکت خانم نے محلے کی دیوار پر گارا بھر دیا اور سفیدی کرا دی۔ حوض خالی کر کے برسوں سے خراب پڑے فواروں کی مرمت کی گئی اور حوض میں نیا پانی بھر دیا گیا۔ جشن محلے ہی میں ہونا قرار پایا تھا۔ مجھے ان مسعود دنوں کی پوری تفصیل یاد نہیں رہی۔

جشن کے دن سے کچھ پہلے ہر صبح جتنی ہمسائے جمع ہو کر حویلی میں خوشی کا اظہار کرنے اور ڈھول تاشے بجانے لگتے۔ تقریب کے دن، دوپہر کے قریب، شادی کے سازوسامان اور پھلوں اور مٹھائیوں سے بھرے چند خوان لائے گئے۔ دوپہر کے بعد ایک آرائش گر عورت آئی اور اس

نے لیلیٰ کے بال سنوارے اور چہرے کا سنگار کیا۔ خوب ڈھول تاشے بجے۔ شیفون اور بیل کے سفید لباس میں میری بہن کا چہرہ ملکوتی معلوم ہو رہا تھا۔ پھر آقا آیا اور نکاح پڑھایا گیا۔ میں اس کے وسطے خوش تھا۔ وہ خود اپنے چھوٹے سے حسین چہرے کے ساتھ تصویر کے اُنھیں فرشتوں جیسی لگ رہی تھی جن کے بارے میں ہمیشہ باتیں کیا کرتی تھی۔

رات کو، یعنی شادی کی رات کو، مغرب کے وقت سے شوکت خانم مہمانوں کا استقبال کر کے مردوں کو احاطے میں اور عورتوں کو کمروں میں بٹھا رہی تھی۔ حوض کے کنارے تخت بچھے ہوئے تھے، موسیقار تھا، گیس کی لالٹینیں تھیں، گہما گہمی اور قہقہے تھے، شاہ داماد کی شان میں تالیاں بج رہی تھیں، دولہا دلہن کے سروں پر سے شیرینی اور سکے نچھاور کیے جا رہے تھے۔ سب خوش تھے۔ شوکت خانم گھڑی گھڑی دروازے میں آتی اور عبداللہ خاں کے سر پر سے شیرینی اور چاندی کے سکے نچھاور کرتی اور کہتی کہ شاہ داماد کی سلامتی کے لیے سب مل کر تالی بجائیں۔ وہ بہت بھیڑ اور سرخوشی کے عالم میں تھی۔ میں نے چند بار اپنی بہن کو دیکھا۔ لیلیٰ مجھے فقط تھکی ہوئی دکھائی دی، یا شاید تھکی ہوئی سے کچھ زیادہ۔ میں نہیں جانتا کہ اس کی طبیعت دوبارہ خراب ہو رہی تھی یا نہیں۔ میں خود تکان اور نیند کا شکار تھا، اور حوض کے کنارے موسیقار کے ننھے اور چاندی کے سکے جمع کرنے کے شوق کی وجہ سے میرا دھیان بٹ گیا تھا۔ جب تقریب کے ختم ہونے کے قریب میں نے لیلیٰ کی طرف دیکھا تو لگا جیسے وہ بے ہوشی کے عالم میں ہو۔ اس کی آنکھیں بمشکل کھل پا رہی تھیں۔ میرا دل چاہتا تھا کہ کوئی آ کر اس کی مدد کرے اور کسی کمرے کے کونے میں لے جا کر لٹا دے۔ مگر سب خوشی اور ہنگامے میں مشغول تھے۔

مجھے یاد ہے بعد میں رات کو اچانک بارش ہوئی — تیز ہوا اور طوفان، بالکل آج رات کی طرح۔ پوری محفل درہم برہم ہو گئی۔ سب لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور احاطے سے چلے گئے۔ شوکت خانم اور باقی لوگ لپک کر شیرینی کے خوان اور قالین اندر کمروں میں لے جانے لگے۔ مہمان مردوں میں سے کچھ واپس چلے گئے۔ قریب کے لوگ اندر کمروں میں چلے آئے اور عورتوں نے سروں پر آنچل ڈال لیے۔ بعد میں میں نے سنا کہ عورتیں 'اے یار مبارک باد' گا رہی ہیں اور کم سن دولہن سر شب بستر پر جا رہی ہے۔ پھر شوکت خانم نے کچھ اور عورتوں کے ساتھ آ کر عبداللہ اور میری بہن کو سہارا دے کر اٹھایا۔ وہ چاہتی تھیں کہ دولہا دلہن ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر چلیں۔ وہ سب تالیاں بجا بجا کر قہقہے لگا رہی تھیں۔

عبداللہ میری بہن کے ساتھ چلتا ہوا اس کی نسبت دیوسیکل معلوم ہو رہا تھا۔ لیلیٰ گیارہ سال کی تھی، مگر یک کم زور اور بیمار گیارہ سالہ لڑکی۔ یہ لوگ اُس کے ساتھ کیا کرنے والے تھے؟ عورتیں دولہا دلہن کو لاتے ہوئے 'لی لی لی لی' کا شور مچا رہی تھیں، شیرینی بکھیر رہی تھیں، گلاب چھڑک رہی تھیں۔ وہ ان دونوں کو اُس کمرے میں لے گئیں جو اُن کے لیے آراستہ کیا گیا تھا۔ اور کون سا

کمرہ یہی، اسی کمرے کو اُن کے حجلۂ عروسی کے طور پر تیار کیا گیا تھا۔ میں سہ پہر سے اس کمرے میں داخل نہیں ہوا تھا، شادی کے جشن میں لگا ہوا تھا۔ اب آیا اور کمرے پر نگاہ ڈالی۔ کمرے کے وسط میں مسہری، پرانی چوبی چھپرکھٹ پر نیا بستر لگا دیا گیا تھا۔ طاقچے میں آئینہ، چراغ اور گلاس رکھا تھا۔ آئینے کے دونوں طرف دو لالٹینیں جل رہی تھیں۔ جب عورتیں میری بہن کو لے کر کمرے میں داخل ہوئیں تو میں خوش ہوا کیوں کہ میں نے دیکھا کہ اس نے دروازے کی چوکھٹ پار کرتے ہوئے ہجوم میں سے میری آنکھوں کو ڈھونڈ نکالا اور امید بھری مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھا۔ اُس نگاہ اور اُس مسکراہٹ کو میں کبھی نہیں بھولوں گا۔

شوکت خانم نے دولہا دلہن کے اندر آنے کے بعد کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ محفل ختم ہوئی۔ صرف چند عورتیں جو رہ گئیں آ کر کمرے کے دروازے کے باہر بیٹھ گئیں۔ روایت کے مطابق ماں کو کمرے میں نہیں آنے دیا گیا تھا۔ میں نے انھیں ایک مرتبہ باہر جاتے میں دیکھا تھا۔ وہ برآمدے سے ہٹ کر زینے پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ کچھ نہیں کر رہی تھیں۔ شاید رو رہی تھیں۔ سب لوگ اس کمرے میں گویا کسی اہم بات کے پیش آنے کے منتظر تھے۔ ان میں ایک شیطنت آمیز کھسر پھسر چل رہی تھی۔ کسی کو یہ فکر نہ تھی کہ ہم بچوں کو سلا دے، یا جو بچے کمرے کے فرش پر سو گئے تھے انھیں اٹھا کر ٹھیک سے لٹا دے۔ سب کے سب باتوں میں لگے تھے۔ کمرے کے اندر سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ آدھا گھنٹا گزر گیا اور کچھ نہ ہوا۔ میں بہن اور دشمنوں کے خیال میں گم تھا۔ شدت سے خدا سے دعا مانگ رہا تھا کہ یہ لوگ اُس کا خیال رکھیں۔ پھر کمرے کا دروازہ اندر سے کھلا۔

عبداللہ کمرے سے باہر آیا۔ اُس کے چہرے پر تمسخر اور خوشی کی مسکراہٹ تھی۔ اس کے بھاری جسم پر سفید قمیص اور پنڈلیوں والا سرخ پاجامہ تھا۔ عورتیں اسے دیکھتے ہی ٹھٹھے لگانے اور لی لی کرنے لگیں۔ تالیاں بجانے لگیں۔ اس کے سر پر سے شیرینی اچھالنے لگیں۔ اب اماں بھی اندر آ گئی تھیں۔ وہ اور خالہ خانم اور شوکت خانم تیزی سے دلہن کے کمرے میں داخل ہوئیں۔ میں بھی دوڑ کر ان کے پیچھے چلا۔ مگر ابھی دروازے کی چوکھٹ تک بھی نہ پہنچا تھا کہ شوکت خانم نے مجھے پرے دھکیل دیا اور خود کامیابی اور ناز کے تاثر کے ساتھ کمرے سے نکلی۔ اس کے ہاتھ میں ایک خون آلود کپڑا تھا جسے وہ کسی مقدس اور پاکیزہ چیز کی طرح اوپر کو اٹھائے ہوئے تھی۔ اس کپڑے کو بلند کر کے اس نے سب لوگوں کو دکھایا۔ میری بہن باکرہ تھی۔ عورتوں نے خوشی کے نعرے بلند کیے۔ میں تب کچھ نہ سمجھا۔ مگر خون کو دیکھ کر خوف کی ایک شدید لہر میرے بدن میں دوڑ گئی۔ میں خدا سے دعا کرنے لگا کہ میری بہن خیریت سے ہو۔ اس رات مجھے خدا کی طرف سے کچھ جواب نہ ملا۔ کمرے کے اندر سے ماں کی چیخ سنائی دی اور میں دوڑ کر اندر پہنچا۔۔۔ اندر مجھے ایک ہولناک منظر دکھائی دیا۔۔۔

○ ○ ○

مرد خاموش ہو گیا۔ اس کی بس کے قصے نے اُسے اور اس کی بیوی کو غمگین کر دیا تھا۔ وہ دوبارہ اٹھا اور کھڑکی کے پٹ جو تیز ہوا اور طوفان کے زور سے کھل گئے تھے بند کیے۔ بیوی نے پوچھا: "آخر گیارہ سال کی بیمار بچی کو اس طرح شوہر کے سپرد کیوں کر دیا؟"

"کیا معلوم؟"

"اُسی رات چل بسی؟"

"ہاں، شادی کے بستر ہی میں۔"

عورت نے آہ بھری۔ "لاالٰہ الااللہ۔ عجب دیوانی دنیا ہے۔"

بارش کی بوچھاڑ کھڑکی کی پشت سے ٹکرائی۔

عورت بولی: "لگتا ہے اس دنیا میں راحت اور خوش بختی کسی کے حصے میں نہیں آئی۔" اب اسے پھر اپنے پیٹ کے مُردہ بچے کا خیال آ گیا تھا۔ کہنے لگی: "اس زندگی کے، کچھ معنی ہیں نہ مطلب۔"

اس کے شوہر نے جمائی لی اور بولا: "اگر مطلب یا معنی ہوتے بھی تو یہ خوش بختی کی وجہ تو نہ ہوتی۔ کسی اور چیز کی وجہ ہوتی۔"

"کس چیز کی؟"

کچھ دیر دونوں چپ رہے۔ پھر مرد بولا: "کیا معلوم؟ شو، اب سو رہیں۔"

عورت نے قنداق کا پارچہ اور سوئی دھاگا بقچے میں ڈال کر ایک طرف رکھ دیا۔

وہ اور زیادہ غمگین ہو گئی تھی۔ شام کے وقت اُس کے ذہن میں بُرے خیالات اور تلخیاں تھیں۔ اب اس کے شوہر کی باتوں نے اسے اور گہرے اندوہ میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس کمرے میں کیسی کیسی باتیں ہو گزری تھیں۔ کمرے کی دیواروں پر لگی تصویریں اسے ایک، تی سے سکوت کے ساتھ تک رہی تھیں۔ ان سب ہستیوں کے چہرے بھی ساکت اور گنگ تھے۔ رستم کے زانو پر سر رکھے ہوئے سہراب کی تصویر، ملکہ فرخ لقا کا چہرہ، حضرت ابراہیم اسماعیل کو قربان کرنے کی تیاری میں اور فرشتے اُترتے ہوئے، شیشے پر بنے ہوئے نقش میں سورج کی شعاعوں پر سوار فرشتے، اور بڑی تصویر میں ایک آسمانی فرشتہ ایک باغ میں اپنے مصاحب فرشتوں کے گھیرے میں تخت پر بیٹھا ہوا۔ یہ سب گویا اس کمرے میں اس حاملہ عورت کو خاموشی کے ساتھ گھور رہے تھے۔ صرف انھوں نے لیلیٰ کے قصے کو باور کیا تھا۔

عورت بولی: "سب خدا کے ہاتھ میں ہے۔۔ ہم کیا کر سکتے ہیں؟" پھر اٹھ کر بستر بچھانے لگی۔

اس نے فیصلہ کیا کہ باہر بارش میں جا کر وضو کرنے کے بجائے یہیں کمرے میں تیمم کر

Scanned with CamScanner

لے۔ اور بھی کیا۔ پھر چادر سے سر ڈھانک کر نماز پڑھنے لگی۔ جب عشا کی نماز پڑھ رہی تھی تو اس کا شوہر اٹھ کر باہر گیا، واپس آیا، دروازہ بند کیا، کپڑے بدلے اور بستر پر لیٹ گیا۔ نماز پوری کر کے عورت نے بتی بجھائی اور خود بھی آ کر لیٹ رہی۔

تاریکی میں اُس کے خیالات اور بھی ابتر ہو گئے تھے۔ نماز پڑھ کر بھی اسے اپنی روح کی تطہیر اور کشمکش سے نجات نہیں ملی تھی۔ اُس کی نند کی موت کے قصے نے اس پر اور اس کے سینے پر ایک اور سایہ ڈال دیا تھا۔ اگر لیلیٰ ۔ مری ہوتی، زندہ رہ گئی ہوتی اور حاملہ ہو گئی ہوتی تو کیا ہوتا؟ میں دو بار حاملہ ہوئی۔ تب کیا ہوا؟ آخر کیا؟ اس کا شوہر ساکت تھا۔

وہ ایک دوسرے کی طرف پشت کیے لیٹے تھے۔ کمرے میں پھیلے ہوئے گیلے کپڑوں کی بُو ہر طرف منڈلا رہی تھی مگر اب دونوں اس بُو سے مانوس ہو چکے تھے۔ عورت بہت دیر کھڑکی کی پشت سے ٹکراتی اور نالے میں پڑتی بارش کی آواز سنتی رہی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کا شوہر سو چکا ہے مگر پھر اسے اس کی آواز سنائی دی۔

مرد نے کہا: "سنتی ہو، اگر لڑکی ہوئی تو پتا ہے کیا نام رکھیں گے؟"

عورت نے اندھیرے میں آہ بھری۔ وہ جانتی تھی۔ بولی: "اگر۔۔۔" اس کا گلا رُندھ گیا۔

اس کے جی میں آئی کہ بچے کے جاتے رہنے کی بات ابھی شوہر کو بتا دے۔ پھر خیال آیا کہ نہیں، آج رات نہیں، کل دیکھا جائے گا۔ چپ رہی۔ کمرے کی تاریکی میں نمی کی بُو پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے پیٹ پر مُردہ بچے کا دباؤ پڑ رہا تھا۔ وہ جاگتی رہی

بارش تمام رات کھڑکی سے ٹکراتی رہی۔

oo

(فارسی عنوان: "عشق")

فریدون تنکابنی

فارسی سے ترجمہ: نیر مسعود

جُم چیز

۱

میرا باپ کوئی پڑھا لکھا قابل آدمی نہیں تھا۔ زبان کے قواعد بھی ٹھیک سے نہیں جانتا تھا؛ البتہ فعلِ نہی سے خوب واقف تھا: "نہ کرو"، "نہ جاؤ"، "نہ بولو"، اور اگر بس چلتا تو، "سانس نہ لو"۔

میں چھوٹا تھا اس لیے وہ میرے پیچھے زیادہ پڑا رہتا تھا، لیکن یہ مجھ کو کچھ ایسا بُرا بھی نہیں لگتا تھا۔ میں سمجھتا تھا یہ اس کی پدری محبت ہے۔ سچ پوچھیے تو میں خود اُس سے کچھ کچھ محبت کرتا تھا۔ لیکن جب میں ذرا بڑا ہوا اور اپنی مرضی پر چلنے کی خواہش کرنے لگا تو مجھے اُس سے وحشت ہونے لگی۔ ہر قدم پر وہ میرے راستے میں آ کھڑا ہوتا، اُس کی آنکھیں لال پیلی ہونے لگتیں، ہاتھ اوپر اُٹھتا اور منہ کھل جاتا:

"نہ!"

وہ دن تو بھلائے نہیں بھولتا جب میں بچوں کے ساتھ گلی میں کھیل رہا تھا اور ہم سب اپنی دُھن میں مست خوب بُلڑ مچا رہے تھے کہ میرا باپ نازل ہو گیا۔ وہ اچانک آن پہنچا تھا اور اُس پر نظر پڑتے ہی میرے ہاتھ پاؤں ایسے پھولے کہ گھر بھاگ جانے کا بھی ہوش نہ رہا۔ اُس نے مجھے دونوں کان پکڑ کر اٹھا لیا اور گھر کے اندر لے آیا۔ اسی طرح کانوں سے لٹکائے لٹکائے صحن پار کر کے اُس نے مجھے کمرے کے گوشے میں پٹخ دیا۔ درد کے دو ستون میرے دھڑ کو تھامے ہوئے تھے اور مجھے جھکنے بھی نہیں دے رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دو دہکتی ہوئی سلاخیں کانوں کے راستے میرے بدن میں اُتار دی گئی ہیں۔ ایک عذاب تھا۔ لیکن مجھے اس کی زیادہ پروا نہیں تھی؛ اصل عذاب وہ

Scanned with CamScanner

خفت تھی جو مجھے اٹھانا پڑی۔ مجھ کو حقارت سے دیکھتے ہوئے بچوں کی صورتیں ابھی تک میری نگاہوں میں پھر رہی ہیں؛ اور اُن کی ہنسی، جو وہ روک رہے تھے؛ اور ترحم، جو وہ اپنی آنکھوں سے ظاہر کر رہے تھے۔

اُسی دن سے میں تنہا ہو گیا۔ گھر کے کونے میں دیوار کے پیچھے سے مجھے بچوں کے چیخنے چلانے، دوڑنے دھوپنے اور ہانپنے کی دور جاتی، قریب آتی آوازیں سنائی دیتیں اور میرا جی چاہتا لپک کر اُن میں جا ملوں، لیکن کوشش نہیں کرتا تھا، باپ کے ڈر کی وجہ سے نہیں بلکہ میں بچوں سے جھینپنے لگا تھا۔ اب اُن کے ساتھ مزہ نہ آتا، ہماری برابری جو ختم ہو گئی تھی۔ مجھے پتا تھا اب سے بچے میری ہنسی اُڑایا کریں گے، اور انھیں اس کا حق بھی تھا۔

میرا باپ جب تک گھر میں رہتا اس کی زبان تالو سے نہ لگتی۔ مسلسل بولے جاتا تھا۔ کیا کیا پند و نصائح، صداقت اور پارسائی کے کیا کیا درس ہوتے تھے۔ اس کی فصیح و بلیغ اور لفظی معنوی صنعتوں سے گراں بار تقریریں زیادہ تر دونوں وقت کے کھانے پر ہوتی تھیں۔ منہ میں کھانا ہو، اور ہر دو جملوں کے بیچ میں ایک لقمہ۔ اور ہم سب کو پہلے ہی سے معلوم رہتا کہ اب وہ کیا کہے گا۔ اس لیے ہم اُس سے ایک دو جملے آگے چلتے اور انتظار کرتے تھے کہ وہ یہی بات پوری کر کے ہماری چھٹی کرے۔ ہم پست ہو کر رہ جاتے تھے۔

تنخواہ ملتی تو وہ اسے آدھوں آدھ کر لیتا۔ آدھی اپنے ڈبے میں رکھتا، آدھی میری ماں کو گھر کے خرچ کے لیے دیتا تھا۔ وہ ماں کو کبھی اپنی صحیح صحیح تنخواہ نہیں بتاتا تھا۔ میرا قیاس ہے کہ اس حصہ بانٹ سے پہلے ہی وہ کچھ رقم مار لیتا تھا، یعنی اپنے ساتھ بھی دغا کر جاتا تھا۔ کیسی مزے کی بات ہے، ہے کہ نہیں؟ اس کی کچھ اوپری آمدنی بھی تھی جو ہم نے نہ تو کبھی دیکھی، نہ اس کا کچھ اتا پتا پایا۔ یہ ساری رقم وہ خود پھونک دیتا تھا۔ اُسے جوئے کی لت جو تھی؛ پرانا جواری تھا۔ اگر کسی رات وہ اپنے آپے میں مگن ہوتا — اگر اس کے لیے مگن کی صفت استعمال کی جا سکتی ہو — تو ہم سمجھ جاتے کہ جیت کر آیا ہے۔ اُس رات اس کی تقریروں کی فصاحت و بلاغت اور طوالت بہت بڑھ جاتی اور وہ ان میں ضرب الامثال بھی کھپانے کی کوشش کرتا جیسے حق بہ حق دار رسید، نابردہ رنج گنج میسر نمی شود، راستی آور کہ شوی رستگار۔ لیکن جب کسی رات وہ ہار جاتا اور تیوریاں چڑھ جاتیں، یا ماں کے بقول کھسیانا سا ہوتا تو اُس کی تقریروں میں زہد و تقویٰ کی حکایتیں اور گندی دنیا کی گندے لوگوں کی شکایتیں زیادہ ہوتی تھیں۔ کہتا تھا:

ظلم و جبر زمانے بھر پر چھا گیا ہے۔ کسی کے پیٹ میں ایک آنت بھی سیدھی نہیں ہے۔ بس جھوٹ، جھوٹ، جھوٹ!

ایک رات وہ بہت دیر میں گھر لوٹا؛ سر اور چہرے پر خون، کپڑے تار تار۔ کہنے لگا بس سے اتر رہا تھا کہ بس چل پڑی اور وہ اس کی چپیٹ میں آ گیا۔ بعد میں پتا چلا کہ اس رات وہ دوسرے

Scanned with CamScanner

جواریوں سے اُس کی بے ایمانی پکڑی تھی اور جم کر اس کی مرمت کی تھی۔

جب اُس کے پاس پیسے ختم ہو جاتے تو سیدھے سبھاؤ ماں سے مانگتا نہیں تھا، چُرا لیتا تھا۔ اور سب سے بدتر یہ کہ چوری ہم کو لگاتا تھا اور ایک فرض شناس باپ کی حیثیت سے ہمیں تنبیہ بھی کرتا تھا۔ مجھ کو اُس کی اس حرکت کا یقین نہ آتا لیکن ایک دن اُس نے مجھ کو بھی لے ڈُلا۔ اُس دن گھر میں وہ، ماں، اور میں، صرف تین آدمی تھے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ گھر ہی میں اِدھر سے اُدھر ٹاپتا پھر رہا ہے۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ کسی پھیر میں ہے اور گھر سے باہر جانے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ آخر موقع ملتے ہی میری آنکھ بچا کر وہ اپنی حرکت کر گزرا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کون سی حرکت۔ فقط یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس کا کام بن گیا ہے اور اب اسے کوئی پریشانی نہیں۔ جھٹ پٹ کپڑے بدل گھر سے نکل گیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد ماں مجھے ڈھونڈھتی ہوئی آئی:

'میرے بٹوے سے پیسے تم نے نکالے ہیں؟'

میرا استدلال ہو گیا۔ بھانڈا پھوٹ گیا اور معمّہ حل ہو گیا تھا۔ اس کے اس نیچ پن، ناقابلِ یقین نیچ پن پر خود مجھے شرم آ رہی تھی، اور اس پر بھی کہ ماں کو پتا چل جائے گا تو وہ کیسا خوار ہو گا۔ لیکن ماں نے میری اس خجالت، پریشانی اور بوکھلاہٹ کو، اور اس طرح ہکا بکا رہ جانے کو میرے مجرم ہونے کا ثبوت سمجھا۔ اس نے میری ساری جیبوں کی تلاشی لی، لیکن پیسے نہیں نکلے، نہ میرے پاس رقم چھپانے کا کوئی ٹھکانا تھا، نہ میں گھر سے باہر گیا تھا کہ کہیں پیسے خرچ کر دیے ہوں۔ پھر وہ رقم اتنی بڑی تھی کہ میری عمر کا لڑکا اُسے چرانے کی ہمت ہی نہیں کر سکتا تھا۔

دوپہر کو میرا باپ گھر آیا تو ماں نے پیسے غائب ہو جانے کا ماجرا کہہ سنایا، اور یہ بھی کہہ دیا کہ میں سمجھتی ہوں فلاں نے چرائے ہیں، اس کے سوا گھر میں کوئی تھا ہی نہیں۔ باپ اچانک بندوق کی گولی کی طرح مجھ پر آیا۔ گھونسے، لاتیں، تھپڑ مار مار کر اُس نے میرا کچومر نکال دیا۔ مجھ کو اُس کی فقط آواز سنائی دے رہی تھی کہ چیخ چیخ کر ایک ہی رٹ لگائے ہوئے تھا:

'مجھے چوٹّی اولاد نہیں چاہیے، مجھے چوٹّی اولاد نہیں چاہیے۔'

o o o

ہمارے گھر میں تفریح کا کوئی سامان نہ تھا۔ باپ ہم کو نہ سیر کرانے لے جاتا، نہ سنیما۔ ہمارے یہاں نہ ریڈیو تھا نہ ٹیلی وژن۔ وہ کہتا تھا یہ سب تباہ اور گمراہ کرنے والی چیزیں ہیں اور ان سے دین ایمان خراب ہوتا ہے۔ کتابیں پڑھنے کی ہم کو اجازت نہیں تھی۔ پہلی ہی بار جب اُس نے میرے ہاتھ میں کتاب دیکھی تو میری وہ دُرگت بنائی کہ اب مجھے کتاب کی صورت سے وحشت ہوتی ہے۔ وہی سی کتاب اس نے میرے سر پر اتنی بار رسید کی کہ تین ہفتے تک میں چوندھیایا رہا۔ اس رات اُس نے ڈٹ کر پلاؤ کھایا، لیکن میرے حلق سے نوالہ نہ اترا۔

Scanned with CamScanner

اسی لیے میری عادت پڑ گئی تھی کہ چُپ چاپ کسی کونے میں بیٹھا رہتا اور سوچا کرتا۔ اس پر بھائی بہن مجھ کو ڈانٹتے پھٹکارتے تھے، ماں بھی خفا ہوتی تھی۔ وہ غصے سب سے زیادہ وہ میرے ہی پیچھے پڑا رہتا تھا، لیکن اُن کو بھی کوئی چین سے تھوڑی بیٹھنے دیتا تھا، مگر یہ کہ وہ سب خود ہی اُس سے دور دور رہتے تھے۔ دکھاوا تو یہ تھا کہ جیسے گھر کیسا، اُس کو بہت چاہتے ہیں، مگر میں جانتا تھا سب دل سے یہی چاہتے ہیں کہ اُس کے تن پر سر نہ رہے۔ دو وقت کھانے پر وہ سب بڑے صبر اور سنجیدگی سے اس کی اُکتا دینے والی، گھسی پٹی اور تاؤ دلانے والی بے سر پیر کی تقریریں سنتے، کبھی کبھی جھوٹی ہنسی ہنستے، سر ہلاتے اور اگر منہ میں نوالہ نہ ہوتا تو اُس کی ہاں میں ہاں بھی ملاتے، لیکن اندر اندر اُن کا خون کھولتا رہتا اور وہ دانت پیسا کرتے تھے۔

ماں کو سب اُس کے لچھنوں کا پتا چل گیا تھا اور وہ سمجھنے لگی تھی کہ بٹوے سے پیسوں کا نکل جانا، یا گھر سے قیمتی سامان کا اٹھ جانا کس کی کارستانی ہے، لیکن وہ بھی چپ چاپ سب جھیل رہی تھی اور گویا کسی معجزے کے انتظار میں تھی۔ ان لوگوں میں اتنی جرأت بھی نہ تھی کہ دل سے باپ کے مرنے کی تمنا کریں۔ فقط ان کا جی چاہتا تھا، بغیر اس کے کہ اس خواہش کا خیال لائیں، کہ باپ کسی معجزے کے اثر سے مر جائے اور انھیں چین سے بیٹھنے دے۔

میں باپ کی ڈانٹیں کھاتا تھا لیکن میں نے اس کا غور سے جائزہ بھی لیا۔ اس کے چہرے کی شکنوں، ہاتھوں کی جنبشوں سے، کبھی لپک جھپک کر، کبھی ڈھیلے قدموں چلنے سے آشنا ہوا تو وہ مجھ کو ایک مجبور، تہی دست اور کچلا ہوا سا آدمی نظر آیا۔ بیوی بچے اُس کے ہاتھ پاؤں پکڑ کر اسے باہر گلی میں پھینک سکتے تھے، اُس کی گدی میں ہاتھ دے کر دروازے تک کھدیڑ سکتے تھے اور زبردستی اُسے گھر سے نکال باہر کر سکتے تھے۔ لیکن ایسا کرتے نہیں تھے، کر ہی نہیں سکتے تھے، اتنی ہمت جو نہیں تھی۔ سچ پوچھیے تو مجھ میں بھی اس کی ہمت نہ تھی، لیکن اتنا میں جانتا تھا کہ اگر وہ شروعات کر دیں تو مجھ میں بھی ہمت آ جائے گی۔ میں اُس سے بہت کم ڈرتا تھا اس لیے کہ میں اسے بہت زیادہ جانتا تھا۔ اُن کے دلوں سے خوف نکالنے کے لیے ضروری تھا کہ انھیں اس کو سمجھنے کے لیے تیار کروں۔ مگر مجھ کو اُن سے بات کرنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ اگر باپ کو پتا چل جاتا کہ اس کے پیٹھ پیچھے میں کیا کہتا پھر رہا ہوں تو ہم سب کی شامت آ جاتی۔ ایک بار جب میں نے بڑی ہمت کر کے اشاروں کنایوں میں اپنے بھائی سے کچھ باتیں کیں تو اس نے متوحش ہو کر مجھے دیکھا اور کہنے لگا:

"پاگل ہو گئے ہو؟ کیسی باتیں سوچ رہے ہو؟"

ہاں، ہم سب اُس سے بے طرح ڈرتے تھے، اُس سے بے طرح نفرت کرتے تھے۔

۲

جب میں بڑا ہو گیا تو اس خیال سے کہ مجھ کو ڈر نہ لگا کرے، میں نے فیصلہ کر لیا کہ خود میں

Scanned with CamScanner

دوسروں کو ڈرایا کروں گا۔ یا سچ پوچھیے تو اس حرکت سے میرا کوئی خاص مقصد نہیں تھا۔ یہ میرے لیے محض ایک قسم کی تفریح، ایک مزے دار مشغلہ تھا، لیکن آپ شاید اسے مردم آزاری کی چھپی ہوئی خواہش، یا کوئی انتقامی جذبہ، یا خالص بد نفسی سمجھیں، یا کم تری کے احساس سے چھٹکارا پانے کی کوشش۔ جو چاہے سمجھ لیجیے، میرے لیے سب برابر ہے۔

خزاں اور سرما کے موسموں میں، جب فضا ابر آلود اور تاریک اور بند بند سی ہوتی، میرا یہ کھیل زیادہ مزہ دیتا۔ کپڑوں کے اوپر میں برساتی پہن لیتا اور اس کے کالر اوپر اٹھا کر اپنا چہرہ چھپا لیتا، کسی ایک آدمی کو چن لیتا، اس طرح کہ جو بھی راستے میں آ جاتا میں اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگتا، تین قدم کا فاصلہ دے کر۔ وہ تیز چلتا تو میں بھی تیز چلتا؛ وہ رک جاتا تو میں بھی رک جاتا؛ وہ کسی گلی میں مڑتا، میں بھی مڑ جاتا۔ اگر وہ کسی مکان کے اندر چلا جاتا تو میں مکان کے سامنے تھوڑی دور پر بجلی کے کھمبے یا کسی درخت کے تنے کی ٹیک لگا کر کھڑا ہو جاتا۔ وہ کھڑکی سے منڈیا نکالتا اور دیکھتا کہ میں اب بھی وہاں موجود ہوں۔ اور میں ہمیشہ اناڑی پن سے، بناوٹی اناڑی پن سے، ایسا ظاہر کرنے کی کوشش کرتا گویا میں اس کی طرف بالکل متوجہ نہیں ہوں اور میرا سارا دھیان اپنی طرف ہے، اور اپنے کام کی طرف جو میں نے ابھی نہیں کیا ہے۔

ایک بار تو اُن میں سے ایک آدمی ایسا ڈرا کہ اُس نے گھر بھر کو خبر کر دی اور چھوٹے بڑے سب کے سب کھڑکی سے جھانک جھانک کر مجھے دیکھنے لگے۔ اور میں ایسا بن گیا جیسے مجھے کوئی نظر ہی نہ آ رہا ہو۔ بس کبھی کبھی کنکھیوں سے اُن کی جانب دیکھ لیتا تھا۔ آخر اُن میں کا ایک ہمت کر کے باہر نکلا اور مجھ سے پوچھنے لگا:

"کہیے، کوئی کام ہے؟"

سچ پوچھیے تو میں ڈرا کہ بات بڑھ رہی ہے، لیکن میں بوکھلایا بالکل نہیں۔ سوچا اسے دو ٹوک وراوٹ پٹانگ جواب دیے جائیں۔ میں نے پوچھا:

"کیا مطلب؟"

وہ بولا:

"آپ اتنی دیر سے یہاں کھڑے جو ہیں۔"

میں نے ظاہری تعجب سے پوچھا:

"یہاں میرے کھڑے ہونے کی منادی ہے؟ یا میں آپ کا راستا روک رہا ہوں؟"

میرا اندازہ ٹھیک تھا۔ وہ سٹپٹا کر رہ گیا۔

"نہیں نہیں، یوں ہی، میں نے سوچا شاید آپ کی کچھ مدد کر سکوں۔"

میں نے جواب دیا:

"بہت بہت شکریہ۔ جب ضرورت ہو گی آپ کو اطلاع کر دوں گا۔"

Scanned with CamScanner

وہ برخوردار میرے اس جواب سے بھک کر رہ گیا اور خوب ڈرا۔ ہنسی روکتے روکتے میں بے ہوش ہوا جا رہا تھا۔ قریب تھا کہ ایک زوردار قہقہہ میری ساری سنجیدگی کا بھانڈا پھوڑ دے، لیکن یہ سوچ کر کہ اگر اس وقت مجھ سے ذرا بھی چوک ہوئی تو یہ لوگ، پچھلے تمام حرکتوں کا حساب وصول کر لیں گے، میں نے خود کو سنبھالا۔

جو آدمی مجھ سے بات کر رہا تھا وہ ڈر ہوا تو بہت تھا لیکن اتنی آسانی سے ہار ماننے والا بھی نہیں تھا۔ اُس نے پھر سوال کیا:

"کسی کا مکان ڈھونڈ رہے ہیں؟"

"جی،" میں نے کہا۔

"کس کا؟"

"اسی گلی میں مکان ہے،" میں بولا، "مجھے معلوم ہے۔"

وہ بولا:

"مالک مکان کا راستا دیکھ رہے ہیں؟"

میں نے یوں ہی کہہ دیا:

"جی نہیں، کچھ آنے والوں کا انتظار ہے۔"

میں نے دیکھا اس کا چہرہ فق ہو گیا اور وہ چونے کی طرح سفید پڑ گیا۔ پھر وہ کچھ نہیں بولا، چُپ چاپ گھر کے اندر چلا گیا۔

اندھیرا ہو گیا تو میں نے اپنا راستا لیا۔ تھک گیا تھا۔ لیکن جیسے ہی اُس آدمی کا خیال آتا، ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جاتے۔ بے چارے! رات بھر جاگتے رہے ہوں گے۔ ایسے ایسے بہت قصے ہیں۔ سب سنا کر آپ کا دماغ پریشان نہیں کرنا چاہتا۔ بس ایک واقعہ جو سب سے طویل اور مزے کا ہے — اور آخری بھی — بیان کرتا ہوں۔ یہ وہ واقعہ ہے جس نے میری ان ساری حرکتوں کی ڈوری میرے ہاتھ پر رکھ دی اور اس پُرلطف مگر خطرناک کھیل سے میرے باز آنے کا سبب بنا۔

مغرب کا وقت ہوگا کہ میں بس سے اُترا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور ڈوبتے سورج کی مدھم روشنی بھی اُن سے نہیں چھن رہی تھی۔ بارش ہو چکی تھی اور زمین پر کیچڑ تھی، لیکن اس وقت پانی تھما ہوا تھا۔ میرے آگے ایک شخص بہت سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہوا چل رہا تھا تاکہ کیچڑ کے چھپاکے اس کے کپڑے نہ خراب کریں۔ معلوم نہیں کیوں میری بدذاتی نے زور کیا اور میں نے اس کو دق کرنے کی ٹھان لی۔ وہ اچھی شخصیت کا خوش پوشاک آدمی تھا۔ جوان ہی تھا، پینتیس چالیس کے لگ بھگ عمر، منا کٹا، گوری رنگت، منڈا ہوا چہرہ، سر پر بال مگر چندیا صاف۔ قریب تھا کہ میں اس سے آگے نکل جاؤں، لیکن میں نے اپنی رفتار دھیمی کر دی، برساتی کے کالر اوپر اٹھائے،

ٹھوڑی ان میں چھپالی اور سر کو اس طرح جھکا لیا کہ بھنوؤں کے نیچے سے اسے دیکھتا رہوں۔

آخر وہ مڑ کر میری طرف متوجہ ہو۔ پہلے اُس نے کچھ زیادہ خیال نہیں کیا، لیکن چند قدم اور چلنے کے بعد وہ سمجھ گیا کہ میں اس کا پیچھا کر رہا ہوں۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ میں نے سیدھے اُس کی آنکھوں میں دیکھا، لیکن پھر نظریں ہٹا لیں اور ایسا ظاہر کیا کہ موٹروں کو دیکھ رہا ہوں۔ اس نے اپنی رفتار تیز کر دی جیسے کسی ناگوار چیز کو جھٹکنا چاہتا ہو۔ وہ بس اڈے پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ ٹکٹ خریدا اور کھڑا رہا۔ میں نے بھی ٹکٹ لے لیا اور اس کے ایک دو آدمی پیچھے کھڑا ہو گیا۔ اب میں نے گردن بڑھا بڑھا کر اُس کو اس طرح دیکھنا شروع کیا کہ آخر وہ پھر میری طرف متوجہ ہو گیا۔ بس آئی۔ ہم دونوں سوار ہو گئے۔ میں اس کے پیچھے بیٹھا۔ اب جب میں اس کو نظر نہیں آ رہا تھا تب بھی وہ پریشان تھا۔ جانتا تھا کہ میں اس کا تعاقب کر رہا ہوں لیکن اس سے کچھ سنائے نہیں بن رہی تھی۔ چند اسٹاپوں کے بعد وہ اُتر گیا۔ پتا نہیں اسے وہیں اترنا تھا یا مصلحتاً اتر پڑا تھا۔ بس سے اترتے وقت اس نے مجھ کو ڈری ڈری نظروں سے دیکھا۔ میں نے ظاہر کیا کہ سڑک کی سیر دیکھ رہا ہوں اور اس اسٹاپ پر اترنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ میں نے سوچا اسے کچھ اطمینان ہو جائے، ذرا خود کو بہلا لے اور چین کی چند سانسیں لے لے، تاکہ دوبارہ مجھ کو دیکھنا اسے اور بھی کھلے۔ اسی میں تو مزہ تھا۔

جیسے ہی وہ آگے بڑھا میں جھٹ سے اٹھا اور اس کے پیچھے لگ گیا۔ وہ سڑک پار کر کے رکا، پھر مڑ کر دیکھنے لگا۔ میں گاڑیوں کی اوٹ میں ہو گیا تھا۔ ٹھیک اُس وقت جب وہ مطمئن ہو کر مزے مزے چلا جا رہا تھا، اسے اپنے پیچھے پیروں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے بے یقینی کے ساتھ گردن گھمائی اور مجھے دیکھا کہ تین قدم کے فاصلے پر بظاہر اپنی دُھن میں مست اس کے پیچھے پیچھے چلا آ رہا ہوں۔ اس نے قدم بڑھائے۔ میں نے بھی قدم بڑھائے۔ وہ رکا اور اپنے جوتوں کی ڈوریاں کھول کر پھر سے باندھنے لگا۔ میں نے ایک سگریٹ نکالی اور ماچس جلانے کے بہانے وہیں ٹھہر گیا۔ یکبارگی وہ ایک جنرل مرچنٹ کی دُکان میں گھس گیا۔ میں وہیں، ایک طرف کھڑے ہو کر اس کے باہر نکلنے کا انتظار کر سکتا تھا، لیکن اسے زیادہ ستانا چاہتا تھا اس لیے خود بھی دُکان کے اندر چلا گیا۔

"ذرا سنیے گا،" میں نے کہا۔

وہ بھڑک کر پلٹا، سمجھا میں اُس سے کچھ کہہ رہا ہوں، لیکن میں دُکان دار کی طرف متوجہ تھا۔

"آپ کے یہاں فون ہو گا؟"

"جی نہیں،" دُکان دار نے جواب دیا۔

"آس پاس بھی کہیں نہیں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہے کیوں نہیں،" دُکان دار بولا، "یہ کیا چوراہے پر، ذرا آگے بڑھ کر۔"

پھر دُکان دار نے ایک بڑی سی گڑیا اُس کے سامنے رکھ دی اور پوچھا:

"یہ ٹھیک رہے گی؟"

"ہاں ہاں، بس یہی ٹھیک ہے" اس نے بوکھلاہٹ میں جواب دیا، "کتنے کی؟"

"پچپن تومان۔"

میں باہر نکل آیا۔ برساتی کے کاڑ کے پیچھے میں اپنی ہنسی چھپائے ہوئے تھا۔ آج اس کی بچی "پاپا" کی اس غیر معمولی مہربانی کا سبب نہ سمجھ پائے گی۔ وہ مجھ کو شاید یہ بتانا چاہتا تھا کہ وہ ایک تین چار سال کی بچی کا باپ ہے۔

میں ٹیلی فون بوتھ کے اندر چلا گیا۔ ریسیور اٹھا کر میں نے یوں ہی کچھ نمبر گھمائے اور ایسا ظاہر کیا کہ کسی سے بات کر رہا ہوں۔ وہ بغل میں بنڈل دبائے دکان سے باہر نکلا۔ اُس نے کنکھیوں سے بوتھ کی طرف دیکھا اور مجھے گفتگو میں مشغول دیکھ کر خوش بھی ہوا، وحشت زدہ بھی، اور دوسری سمت روانہ ہو گیا۔ میں نے ریسیور رکھ دیا اور اس کے پیچھے چل کھڑا ہوا۔ میں نے اپنی رفتار بڑھائی یہاں تک کہ میرے اُس کے تین قدم کا فاصلہ رہ گیا۔

پانی پھر برسنا شروع ہو گیا تھا۔ ذرا ہی دیر میں ہم دونوں بھیگے ہوئے چوہے ہو گئے۔ اندھیرا ہو چکا تھا۔ سڑک پر کھمبوں کے بلب اور گاڑیوں کے ہیڈلیمپ روشن ہو گئے تھے۔ اچانک وہ ایک گلی میں مڑا اور بھاگنے لگا۔ پیچھے پیچھے میں بھی۔ لیکن میں نے اس کا خیال رکھا کہ ہمارے درمیان فاصلہ زیادہ رہے اور وہ کسی دوسری گلی میں مڑ جائے۔ وہ مڑا اور میں اُس موڑ کو چھوڑتا ہوا آگے بڑھا اور ایک مکان کے چھجے میں چھپ کر چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔

دس منٹ گزر گئے۔ وہ برآمد نہیں ہوا۔ میں نے پانچ منٹ اور انتظار کیا۔ اب میرا حوصلہ جواب دینے لگا تھا۔ سوچ ہی رہا تھا کہ چھوڑوں اور اپنا راستا پکڑوں کہ وہ گلی کے نکڑ پر دکھائی دیا۔ اُس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہر طرف دیکھا، گلی کے اُس سرے سے اس سرے تک، درختوں اور بجلی کے کھمبوں کے پیچھے۔ جب دیکھا کوئی نہیں ہے تو لپکتا ہوا، مگر آہٹ کیے بغیر، باہر آیا اور اُس گلی سے ذرا ہٹ کر مقابل کی ایک اور گلی میں گھس گیا۔ یہ والی گلی آگے بند نہیں تھی اس لیے میں بھی آہٹ کیے بغیر اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ تین قدم کا فاصلہ رہ گیا تو میں نے زمین پر اپنے جوتے کو رگڑ دیا۔

وہ یوں اُچھلا جیسے گولی لگ گئی ہو۔ میں اس کی حالت خوب سمجھ رہا تھا اور مزے لے رہا تھا۔ اُس کے دانت کٹ کٹ بول رہے تھے، ہاتھ جھلا رہے تھے۔ بس نہیں تھا کہ میری بوٹیاں اُڑا دے۔ عین عین اس آدمی کی سی حالت تھی جسے ملک الموت دکھائی دے گیا ہو۔ بالکل حواس باختہ تھا۔ اگر وہ وہیں زمین پر بیٹھ کر بھوں بھوں رونا شروع کر دیتا تو مجھ کو تعجب نہ ہوتا۔ گر ایک دم جھپٹ پڑتا اور مجھ کو دیوار سے لگا کر میرا گلا گھونٹنے لگتا تو بھی مجھے تعجب نہ ہوتا۔ اسی لیے جب وہ ٹھہر کر میری طرف مڑا تو میں نے رک کر اپنا داہنا ہاتھ پتلون کی جیب میں ڈال دیا۔ جاں کا میاب

رہی۔ وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ اس نے رومال نکالا اور زور زور سے ناک صاف کرنے لگا۔ اب مجھ کو اُس سے آگے بڑھ جانا پڑا۔ لیکن مجھے بالکل پسند نہیں تھا کہ وہ میرے پیچھے رہے، اس لیے کچھ آگے بڑھ کر میں نے پھر رک کر سگریٹ اور ماچس نکالی۔ اب وہ پھر میرے آگے آگے چلنے پر مجبور ہو گیا۔

گلی ختم ہوئی اور ہم ایک چلتی ہوئی روشن سڑک پر نکلے۔ اُس نے بھیڑ میں مِل جانے کی کوشش کی، لیکن وہ خود سمجھتا تھا کہ اس سے کچھ حاصل نہیں۔ اب، جیسے اچانک کوئی نئی بات ذہن میں آ گئی ہو، اس نے سڑک کے کنارے جا کر ٹیکسی کو آواز دی۔ خوش قسمتی سے پہلی ٹیکسی بھری ہوئی نکلی اور اس سے مجھے موقع مل گیا کہ کچھ پرے جا کر اس طرح کھڑا ہو جاؤں کہ اس کی نظر مجھ پر نہ پڑے، اور وہ بھی فرار کے منصوبے میں کچھ ایسا محو تھا کہ یا تو مجھ کو بھول ہی گیا تھا یا میری طرف دھیان نہیں دے سکا تھا۔ وہ ایک ٹیکسی میں بیٹھ گیا اور ٹیکسی چل دی۔ جیسے ہی وہ میرے سامنے سے گزرنے لگی، میں نے ہاتھ اٹھا دیا۔ ٹیکسی رک گئی۔ ڈرائیور نے پوچھا:

"کہاں جائیے گا؟"

میں نے رواروی میں پوچھا:

"یہ سامنے والی صاحب کہاں جا رہے ہیں؟"

اور وہ احمق ڈرائیور! اگر اس کی سواری پیچھے سے اس کے ایک دھپ رسید کرتی تو میں اسے برحق گردانتا۔ ڈرائیور نے مجھے بتا دیا۔ بتا دیا کہ وہ دُکھیا کہاں جا رہا ہے، اور میں نے دروازہ کھولا اور بے پروائی کے ساتھ کہا:

"اتفاق سے مجھے بھی اُدھر ہی جانا ہے۔"

دروازہ بند کرتے ہوئے میں نے اُس سے پوچھا:

"اجازت ہو تو۔۔۔"

وہ بولا:

"کوئی بات نہیں۔"

یہ "کوئی بات نہیں" ہزار مغلظات سے بدتر بات تھی، اور اس کا لہجہ کیا تھا گویا بدزبانی، ناچاری اور غیظ و غضب کا ملغوبہ تھا۔

میں جان بوجھ کے ذرا ترچھا ہو کر بیٹھا تھا، اس طرح کہ میری پیٹھ دروازے کی طرف اور آدھا چہرہ اس کے سامنے تھا۔ ڈرائیور بولے جا رہا تھا لیکن ہم دونوں میں سے کوئی بھی نہ سن رہا تھا، نہ جواب دے رہا تھا۔ میں خوب سمجھ رہا تھا کہ میرے ہم راہی کو کسی مخصوص جگہ جانا نہیں ہے، جیسے مجھے نہیں جانا تھا۔ لیکن آخر تنگ آ کر اس نے ٹیکسی رکوا لی۔ جب تک وہ ڈرائیور سے باقی پیسے واپس لے، میں اطمینان سے بیٹھا رہا۔ اور اب وہ اپنے آپ کو مجھ سے چھٹکارا ملنے کا یقین دلا رہا

تھا۔ اور مجھے بھی اس کا یہ خیال کرنا بُرا نہیں لگا۔ ٹیکسی کا دروازہ کھولتے ہوئے اس نے شاید بلا شبہ کے شکرانے میں، یا شاید رشوت کے طور پر، مجھے خدا حافظ کہا اور بولا:

"بہت مہربانی، شکریہ۔"

میں نے بھی کہا:

"اچھا بھائی صاحب، خدا حافظ۔"

پھر میں نے جلدی سے ڈرائیور سے کہا:

"مجھ کو ذرا آگے بڑھ کر اُترنا تھا، مگر خیر، تمہاری چھٹی۔ میں یہیں اُترا جاتا ہوں۔ یہ لو۔"

وہ ایک پاؤں زمین پر رکھ چکا تھا اور دوسرا رکھنے کو تھا کہ اس نے میری بات سن لی۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ دم بھر کو سناٹے میں آ گیا۔ اس کا ہاتھ ہینڈل پر دھرا اور پاؤں اٹھا کا اٹھا رہ گیا۔ پھر اس نے خود کو سنبھالا۔ ٹیکسی کا دروازہ دھڑک سے بند کیا اور تیزی سے چل دیا۔ اُسے امید تھی کہ میں بھی بقیہ کے چکر میں کچھ دیر پھنسا رہوں گا۔ مگر میں نے کھلے پیسے دیے تھے اس لیے مجھ کو رکنے کی ضرورت نہیں تھی۔

میں اترا اور اس کے پیچھے چل پڑا۔

راستے میں پہلی گلی پڑتے ہی وہ اس میں مُڑ گیا، اور اتفاق کی بات کہ اس نے بُری جگہ نہیں چُنی تھی۔ گلی تاریک تھی اور اس میں درخت بھی تھے۔ وہاں کے بلبوں میں ایک تو ٹوٹا ہوا تھا، اور جو جل رہے تھے اُن کی بھی روشنی درختوں کے گھمن میں کھو سی گئی تھی۔ وہ درختوں کے درمیان تیزی سے دھر اُدھر لہراتا ہوا چلا جا رہا تھا تاکہ میں اسے دیکھ نہ سکوں اور اس کا سراغ گم کر دوں۔ اور وہ قریب تھا کہ وہ میری نگاہوں سے اوجھل ہو جانے [illegible] لیے میں نے احتیاط کا دامن چھوڑا اور آگے بڑھ آیا۔ کئی بار وہ درختوں میں سے نکلتا نظر آیا، اور اب اس کا کہیں پتا نہ تھا۔

درختوں کے سامنے ایک تاریک بند گلی تھی۔ اس کے خاتمے پر ایک لیمپ زمین پر روشنی کا فقط ایک دھبہ ڈال رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ درختوں ہی میں چھپا ہوا ہے یا اس گلی کے اندر کہیں ہے۔ میں نے احتیاط سے درختوں کے ارد گرد دیکھا۔ نہیں تھا۔ یقیناً گلی کے اندر تھا۔ میں گلی میں بڑھتا چلا گیا، لیکن اسی بات سے مجھ پر کچھ کچھ خوف طاری ہو گیا تھا۔ میں نے اس کا سراغ کھو دیا تھا اور یہی بات مجھے ڈرا رہی تھی۔ میں نے رک کر گلی کے اُس سرے پر نظریں گاڑ دیں۔ مجھے پتا تھا وہ وہیں کہیں ہے، لیکن میں جاننا چاہتا تھا کس جگہ پر۔

اچانک زمین پر کسی چیز کے گرنے کی آواز آئی۔ گلی کے اُس سرے پر لیمپ کے روشن دھبے کے بیچ میں نے دیکھا کہ گڑیا کا ڈبا زمین پر پڑا ہوا ہے۔ اور وہ بے چارہ! یقیناً بھاگنے کی گڑبڑ میں وہ بالے کے اندر جا پڑا تھا، یا اس کا پیر کسی چیز میں اُلجھ گیا تھا اور وہ بھی وہیں زمین پر ڈھیر تھا۔ یقین کیجیے، اب مجھے اس کے حال پر افسوس اور اپنے کیے پر پچھتاوا ہونے لگا۔ میں اس کی

Scanned with CamScanner

طرف لپکا۔ چاہتا تھا اُس سے معافی مانگوں اور اس کی کچھ مدد کروں۔ احتیاط چھوڑ چھاڑ میں روشنی کے اُس دھبے کی طرف دوڑا۔ میری نظریں گڑیا کے ڈبے پر جمی ہوئی تھیں۔

اور وہ اسی گھات میں تھا۔ ابھی میں گلی کے سرے تک پہنچا بھی نہ تھا کہ وہ مجھ پر ٹوٹ پڑا، پیچھے سے۔ پتا چلا دم دار آدمی ہے اور خاصا منجھا ہوا۔ پہلے تو اس نے بائیں ہاتھ سے میرا منھ دبا لیا، پھر دوسرے ہاتھ سے میرا داہنا ہاتھ جکڑ لیا۔ بھولا بے چارہ! میری وہ جھبکی اُسے اب تک بھولی نہ تھی۔ اور اس نے میرے ہی ہاتھ سے میرے پیٹ کو گوشت کر رکھ دیا۔ میری سانس رک رک گئی اور میں تکلیف سے دُہرا ہو گیا۔ اُس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔۔ شاید سمجھ گیا تھا کہ اب میں اس کا کچھ نہیں کر سکتا۔۔ اور میری پیٹھ پر چار پانچ گھونسے جما دیے۔ وہ میری ہڈی پسلی ایک کیے دے رہا تھا۔ میں بھی خوب سمجھ رہا تھا کہ اتنی دیر سے جمع ہوتا ہوا غبار ہے جس نے اس کے گھونسوں میں یہ زور بھر دیا ہے۔

آخر اس نے میرے منھ پر سے ہاتھ ہٹا لیا اور ایک کراری لات رسید کر کے مجھے کیچڑ میں رگید دیا۔ میں منھ کے بل کیچڑ میں جا رہا۔ اور میرا ہاتھ کسی چیز پر پڑا۔ گڑیا کا ڈبا تھا۔ میں نے ایک لوٹ لگائی اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ایک ہاتھ سے اپنے چہرے پر کی خون آلود کیچڑ پونچھی، دوسرے ہاتھ سے گڑیا کو مُڑے تُڑے ڈبے میں سے نکال کر اپنے قبضے میں کیا۔

اُس کے بھاگتے قدموں کی دور ہوتی ہوئی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی اور میرے حواس واپس آئے۔ اب جا کر میری سمجھ میں آیا کہ اُس نے مجھ پر کیا ستم توڑا ہے، اور یہ بھی کہ میں نے اس پر کیا ستم توڑے تھے۔ میں نے گڑیا کو بغل میں دبایا اور قہقہے مار مار کر ہنسنے لگا۔ دل کھول کر ہنسا، اتنا ہنسا کہ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ معلوم نہیں کتنی دیر، آدھے گھنٹے، یا ایک گھنٹے تک، یہی ہوتا رہا کہ میرے قہقہے تھمتے مگر پھر اُس کا خیال، اپنا خیال، گڑیا کا خیال آ جاتا اور مجھ پر پھر ہنسی کا دورہ پڑ جاتا، سب سے زیادہ اُس گڑیا کے خیال سے۔

وہ اب تک میرے پاس ہے۔ میں نے اسے یادگار کے طور پر رکھ چھوڑا ہے۔ بہت پیاری سی گڑیا ہے۔

○○

(فارسی عنوان: "کتک")

سیمین دانشور

فارسی سے ترجمہ: اجمل کمال

کید الخائنین

ابھی کل تک موسم گرم اور دھوپ بھرا تھا، اور آج صبح آسمان یکایک ایسا ہو گیا جیسے دھات کا، پیتل کا بنا ہو۔ ایسا سرد موسم اور پیتلی آسمان کہ آدمی کا دل بیٹھا جاتا تھا۔ ہر سال اس وقت تک گھروں کے نوکر کمروں میں بخاریاں لگا دیتے، پھولوں کو گل خانے میں منتقل کر دیتے، صحن کے بیچ میں سے نیلے کاشی کے حوض پر تختے جڑ دیتے اور صحن میں جھاڑو دے کر، گرے ہوئے پتوں کو سمیٹ کر ان تختوں کے اوپر ڈھیر کی صورت ڈال دیتے تھے۔ مگر اس سال کرنل صاحب کی ریٹائرمنٹ نے سب معمولات کو زیروزبر کر کے رکھ دیا تھا۔

کیوان اپنے کبوتر کو بغل میں لیے دالان میں داخل ہوا۔ کرنل صاحب بولے، "بیٹے، آج تم پھر اسکول نہیں گئے؟" کیوان نے کہا: "دادجان، دیکھیے تو میرا کبوتر بیمار ہے۔ اور اسکول کی بس بھی ایک بار ہارن بجا کے چلی گئی۔"

انھوں نے کبوتر کیوان کے ہاتھ سے لے لیا۔ اس کا بدن گرم تھا، مگر آنکھیں بند تھیں اور سر سینے پر ڈھلک آیا تھا۔ کیوان بولا: "دادجان، چلیے اسے ڈاکٹر کے پاس لے چلیں۔ نہیں تو میں رونے لگوں گا۔" پھر کچھ وقفہ دے کر کہنے لگا: "میں آدھی رات کو اٹھوں گا، کپڑے بدل کے اپنے

مصنفہ نے اس کہانی کا عنوان عربی میں رکھا ہے جسے اردو ترجمے میں بھی برقرار رکھا گیا ہے۔ خائن کا لفظ فارسی میں صدر کے معنوں میں مستعمل ہے۔ اس طرح اس کے لغوی معنی "عہدوں کا مکر" کے ہوتے ہیں۔ اس کہانی کے انگریزی میں دو ترجمہ ہوئے ہیں۔ مریم مافی کے کیے ہوئے ترجمے کا عنوان Traitor's Intrigue ہے اور ثریا پاک نظر صہبائی نے اپنے ترجمے کو Traitor's Deceit کا عنوان دیا ہے۔ (مترجم۔)

کبوتر کو ساتھ لے کے، گلی والا دروازہ کھولوں گا اور پیدل اماں کے پاس چلا جاؤں گا۔ میں گم ہو جاؤں گا، پھر آپ پریشان ہوں گے اور ہر جگہ مجھے ڈھونڈیں گے، مگر میں تمھیں کہیں بھی نہیں ملوں گا۔ کرنل صاحب کی جان گویا اس بچے میں تھی۔ جب ان کی بیٹی کو طلاق ہوئی تو انھوں نے اس سے بہت کہا کہ وہ ان کے گھر واپس آ جائے اور یہیں رہ کر بچے کی پرورش کرے۔ مگر اس نے اپنا جہیز کا سامان بیچا، مہر کی رقم لی، سینتیس طلائی سکے جو بچا رکھے تھے فروخت کیے، اور جرمنی چلی گئی۔ کہتی تھی کہ وہاں زلف تراشی سیکھوں گی، اور دیکھ لینا اپنے لیے کوئی جرمن شوہر بھی ضرور پھانس لوں گی۔'

کرنل کی بیوی منصورہ خانم بھی کیوان پر فریفتہ تھیں۔ پھر اُس وقت ان کے پاس نوکر بھی تھا۔ کرنل صاحب ہر دو سال میں ایک بار نئے بھرتی ہونے والے اردلیوں کی فائلیں الٹ پلٹ کر دیکھتے، اور سب سے اچھے خاندان کے اردلی کا انتخاب کرتے۔ پھر اسے طبی معائنے کے لیے بھیجتے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ یزد کے رہنے والے سب سے زیادہ محنتی، شیرازی سب سے شیریں زبان اور ترک سب سے زیادہ ذمے دار ملازم ثابت ہوتے ہیں۔ پھر فاطمہ خالہ بھی تھیں جو گویا بالکونی دکھاتے ہی آ موجود ہوتیں اور پوچھتیں: "فرمایئے، کیا کام ہے؟" جب جوان تھیں تو محلے کے بچوں نے ان کا نام بریژیت باردو رکھ چھوڑا تھا۔ منصورہ خانم کہا کرتی تھیں کہ فاطمہ نے اپنے بال سکنجبین کے پانی سے سنہری کر رکھے ہیں تبھی تو یوں جھلملاتے ہیں۔ فاطمہ خالہ کپڑے دھونے اور استری کرنے میں ماہر تھیں۔ اب، آذر ماہ کے پہلے دن، وہ یقیناً گرم کرسی کے نیچے بیٹھی حمام کے جانوروں بن رہی ہوں گی جنھیں آتے جاتے کے ہاتھ بیچ کر وہ گزراوقات کرتی تھیں۔ اب نہ ملازم موجود تھے اور نہ کرنل صاحب کرنل رہے تھے۔ ادھر منصورہ خانم بھی گویا ہڑتال کر کے بستر پر جا لیٹی تھیں۔ انھوں نے کہہ دیا تھا کہ جب تک بخاریاں نہیں لگ جاتیں اور مکان گرم نہیں ہو جاتا، بستر سے نہیں اٹھوں گی۔ جب وہ جوان تھیں تب بھی کوئی ایسی تحفہ چیز نہیں تھیں۔ یا نماز پڑھا کرتیں، روزے رکھا کرتیں یا بستر میں لیٹی فضول کتابیں پڑھا کرتیں اور کرنل صاحب کو سونے نہ دیتیں۔ وہ کتابوں کے ورق پلٹتیں تو کرنل صاحب کی نیند اُچٹ جاتی۔ مسہری کے سرہانے لیمپ بھی روشن رہتا۔ کرنل صاحب صبح چھ بجے اٹھ جاتے، ورزش کرتے، صحن میں دوڑ کر تین چکر لگاتے، ناشتہ کر کے باہر چلے جاتے اور پھر مغرب کے وقت لوٹتے تھے۔ سب سے پہلے جس شخص کو کرنل صاحب کے ریٹائر ہو جانے کو باور کیا وہ منصورہ خانم ہی تھیں۔ اور انھوں نے کرنل صاحب کو بھی خوب اچھی طرح یقین دلایا۔ ہر وقت انھیں جتاتی رہتیں کہ وہ کہیں آتے جاتے نہیں، گھر ہی پر پڑے رہتے ہیں، یا تو کسی روح کی طرح ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں ٹہلا کرتے ہیں یا فال دیکھ کرتے ہیں یا سگریٹ پیا کرتے ہیں۔ ان کا اصرار تھا کہ کرنل صاحب کوئی کام ڈھونڈ لیں اور سگریٹ پینا چھوڑ دیں۔ کہتیں: "چلو، اب آخری عمر میں کچھ دنیا ہی دیکھ ڈالیں۔ مکہ معظمہ، عتبات عالیات ہی ہو آئیں۔"

Scanned with CamScanner

کرنل صاحب سے کیوان کا ہاتھ تھا، جو برف کی طرح ٹھنڈا ہو رہا تھا، اور اس نے اور اس کی بغل میں دبے کبوتر کے ساتھ ساتھ گھر سے نکل آئے۔ سوچ رہے تھے کہ خیابان اسدی کے راستے پر حاجی علی بزاز کی دکان کو دیکھتا ہوں۔ اس وقت تک کبوتر مر چکا ہوگا، اسے سڑک کے کنارے کوڑے کے ڈھیر پر ڈال دوں گا اور حاجی علی کی مدد سے بچے کو کسی طرح بہلالوں گا۔ حاجی علی کی دو بیویاں اور بچوں کی ایک پوری فوج ہے؛ وہ ضرور جانتا ہوگا کہ بیویوں اور بچوں کو کس طرح بہلایا جاتا ہے۔ مگر مجھ ریٹائرڈ کرنل کی کون سنتا ہے؛ نہ بیوی، نہ نواسا، نہ بھانجے، فاطمہ تک میری بات پر کان نہیں دھرتی۔ حاجی علی کی دکان سے ذرا پہلے، مسجد کے سامنے، ان کی نظر سقہ خانے پر پڑی۔ اس کے نل سے کچھ اوپر ایک چبوترا بنا ہوا تھا جس پر سقہ خانے کے حوض کی اوپری محراب کی شکل کا ایک طاق تھا۔ طاق کی پچھلی دیوار پر جا بجا کچھ شمائلیں نصب تھیں اور سبز زری کی شکل کی لہریے دار بدھی ان شمائلوں کے درمیان ایک سرے سے دوسرے سرے تک چکر کاٹتی بندھی ہوئی تھی۔ چبوترے پر آدھے قد تک پگھلی ہوئی موم بتیاں بکھری ہوئی تھیں۔ مسجد کے ٹھیک سامنے ایک شخص عبا اور شب کلاہ پہنے بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے ایک جلتی ہوئی انگیٹھی رکھی تھی اور وہ قرآن پڑھنے میں مشغول تھا۔ کرنل صاحب کیوان سے بولے: "جاؤ اپنے کبوتر کو سقہ خانے کے چبوترے پر رکھ آؤ، خدا اسے شفا دے گا۔" اس سے اچھی ترکیب ان کے ذہن میں نہ آسکتی تھی۔ بچہ یہ بات سنتے ہی بھاگ پڑا اور کرنل صاحب تیز قدموں سے اس کے پیچھے چلنے لگے۔ کیوان نے پاس پہنچ کر کبوتر کو چبوترے پر رکھ دیا۔ کہنے لگا: "دادا جان، ہمارے پاس موم بتی تو ہے نہیں۔" قرآن پڑھتا ہوا شخص سر اٹھا کر بولا: "اگر نذر ہے تو جلا لو، بس ہو گیا۔" کرنل صاحب نے اس شخص کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ پھیکا اور آنکھیں بے چمک تھیں، اور ہونٹ چہرے اور آنکھوں سے بھی زیادہ بے رنگ تھے۔ اس کا لباس پرانا مگر صاف ستھرا تھا۔ کرنل صاحب کی آواز میں سختی آگئی، جیسے انھیں یاد نہ رہا ہو کہ ان کی وردی اتر چکی ہے۔ بولے: "چپ رہ احمق، مجھے اس سے کیا مطلب؟" پھر انھوں نے جیب سے دو ریال کا سکہ نکال کر کیوان کو دیتے ہوئے کہنے لگے: "بیٹے، خدا کی راہ میں یہ سکے فقیر کو دے آؤ۔" کیوان نے اپنا چھوٹا سا ہاتھ بڑھایا مگر اس نے سکہ نہیں لیا۔ کرنل صاحب غصے میں آکر بولے: "کیوان، اسے اس کے سامنے ڈال دو!" حاجی علی اپنی دکان سے باہر نکل آیا۔ سقہ خانے کے برابر کی دکان سے چل دیا اور اس کا ملازم بھی ان کے پاس آ کھڑے ہوئے۔ دو تین راہگیر بھی رک گئے۔ حاجی علی، جس کا چہرہ دھوئیں سے کالا ہو رہا تھا، اپنے کالے ہاتھ چکنوں پر رگڑ کر پونچھتے اور کوٹ کو اپنی بڑھتی ہی توند کے گرد کھینچتے ہوئے کہنے لگا: "نہیں کرنل صاحب، یہ آپ کو زیب نہیں دیتا۔ پورے تجریش کے علاقے میں یہی ایک آغا ہیں--- میں نے سنا آپ نے آغا کو فقیر کہہ دیا۔" عبا پہنے ہوئے شخص نے قرآن سے سر اٹھایا اور بولا: "ہاں، میں فقیر ہی تو ہوں۔ علی اور پاک ناموں کے در کا فقیر۔" کرنل صاحب یہ سن کر ہنسے۔ ان کے جی

Scanned with CamScanner

میں آیا کہہ دیں کہ 'یہ فضول باتیں بند کر!' مگر وہ مرچھ آدمی تھے اور ادھر یہ اکیلے؛ ہرچند کہ حاجی علی سے ان کی اچھی سلام علیک تھی اور منصورہ خانم جب کبھی آش یا حلوا پکاتیں تو اس کے لیے ایک پیالہ یا ایک رکابی بھر ضرور بھیجتی تھیں مگر یہ پارسال تک کی بات تھی جب ان کے پاس اردلی موجود تھا۔ حاجی علی نے کبوتر کو ستھ خانے کے چبوترے سے اٹھا لیا۔ اس کا سر ڈھلک گیا تھا۔ بولا: 'آقا پسر، آپ نے اس کے پر نوچ دیے، بے چارہ اڑ نہیں سکا اور سردی میں بیٹھا بیٹھا مر گیا۔' کیوان نے کہا: "میں نے کہاں نوچے تھے؟ وہ تو ددبان نے نوچے تھے۔" حاجی علی نے کہا: 'کبوتر تو اڑ کر پھر اپنے گھونسلے کے پاس لوٹ آتے ہیں۔' پھر کیوان کا ہاتھ تھام کر بولا: 'چلیے آقا پسر، اسے باغ شہرداری میں لے جا کر پودوں کے پاس دفن کر دیں۔ وہاں کے باغبان آقائے موخ میرے دوست ہیں۔' یہ سنتے ہی کیوان کے چہرے پر آنسو بہہ نکلے۔

کرنل صاحب کا جی کرتا تھا کہ اس شخص کی عبا کھینچ کر اتار دیں اور اس کی کلاہ کو پیروں تلے روند ڈالیں۔ افسوس کہ ان کے پیروں میں فوجی بوٹ نہ تھے۔

سہ پہر کے وقت حاجی علی آیا اور ناچار کرنل صاحب کو خود کام میں اس کا ہاتھ بٹانا پڑا۔ پانچ بخاریاں نصب کرنا کچھ مذاق نہیں ہے۔ کمرے بھی برف خانے کی طرح سرد تھے۔ مغرب کے وقت آخر کام ختم ہوا اور حاجی علی نے تمام بخاریاں روشن کیں۔ وہ شروع میں ٹمٹما کر جل رہی تھیں۔ کیوان حاجی علی سے خوب مانوس ہو گیا تھا اور اس کے پیچھے پیچھے اس کمرے سے اس کمرے میں جا رہا تھا، جھاڑن اور لکڑیاں اسے تھما تھما کر دیتا تھا اور دوڑ دوڑ کر باورچی خانے سے اس کے لیے دیا سلائی لاتا تھا۔

منصورہ خانم حاجی علی کے واسطے چائے لائیں۔ حاجی علی نے کہا: 'میری ظہر اور عصر کی نمازیں قضا ہو گئیں۔' منصورہ خانم بولیں: "تو پہلے نماز پڑھ لیجیے۔ گھر میں سجدہ گاہ بھی ہے جانماز بھی۔"

منصورہ خانم چلی گئیں تو کرنل صاحب نے حاجی علی سے پوچھا: 'وہ کیسا آدمی کون تھا جس نے میری صبح خراب کر دی تھی؟ اگر میں گاڑی چلا رہا ہوتا تو اسے کچل دیتا۔'

حاجی علی بولا: 'کرنل صاحب، ایسا نہ کہیے۔ آپ جیسے اور آپ سے اونچے بہت سے لوگ آقا کے مرید ہیں۔"

کرنل صاحب نے پوچھا: "اس مردار آخوند کے؟"

'کیا کہوں؟ آپ کا نمک کھایا ہے ورنہ علی مرتضیٰ کی قسم آئندہ اس گھر میں قدم نہ رکھتا۔' اس نے چائے کو چھوا تک نہیں۔ بولا: "آقا مسجد اسدی کے پیش امام ہیں۔ منبر پر بھی جاتے تھے، مگر انہیں نماز پڑھانے اور وعظ کرنے کی ممانعت ہو گئی ہے۔"

"کس کی طرف سے؟"

Scanned with CamScanner

"آپ خود بہتر جانتے ہیں۔"

"مگر کس لیے؟"

'جس دن ان کی گرفتاری ہوئی میں وہیں تھا۔ وہ منبر پر کھڑے ہو کر کہہ رہے تھے: اے ملتِ مسلم، یہ تمام خون جو راہِ حق میں بہا ہے رائیگاں نہیں گیا بلکہ تمہارے اور میرے دل میں جوش کھا رہا ہے۔ مجھے لفظ بہ لفظ ان کی بات یاد نہیں ہے۔ مگر وہ کہہ رہے تھے: مجھ سے مت کہو کہ میں مُردہ باد زندہ باد کرتا ہوں۔ مجھے قرآنِ کریم کا فرمان یاد ہے۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ ابراہیم پر سلام ہو جس نے خدا کا گھر بنایا اور ابولہب کے ہاتھ ٹوٹیں جو منافق اور نامرد تھا۔ پھر انھوں نے عربی کی کچھ آیتیں پڑھیں اور ان کی تفسیر بیان کی، آپ ہوتے تو دیکھتے کہ لوگ کس قدر متاثر ہو رہے تھے۔۔۔ آقا نے ابولہب پر اور اس دنیا میں اس کی جو بھی مثالیں ہیں ان سب پر لعنت بھیجی اور علی الاعلان کہا: مردہ باد۔ تو بس اُنھوں نے آقا کا عمامہ ان کی گردن میں ڈالا اور۔۔۔

کرنل صاحب نے حاجی علی کی بات کاٹ کر پوچھا: 'اب وہ اپنی روزی کیسے کماتا ہے؟'

"لوگوں نے ان کا ساتھ نہیں چھوڑا ہے۔"

'اچھا میں سمجھا! مسجد کے سامنے بیٹھ کر بھیک مانگتا ہے۔'

'نہیں سرکار، آقا کا گھر لوگوں کی امید گاہ ہے، وہ وہاں حاضری دیتے ہیں۔ آقا تو اپنی سرکشی کی وجہ سے مسجد کے سامنے بیٹھے ہیں، کہتے ہیں یہ میرا مورچہ ہے۔"

"بیوی بچے بھی ہیں؟"

"جی۔ ایک بیوی اور تین بچے۔'

'بیوی بچوں والے آدمی کو ان بکھیڑوں میں پڑنے کی کیا ضرورت؟"

ان کی بیوی بچوں کا خیال بھی لوگ رکھتے ہیں۔

'آدمی ایسا کام ہی کیوں کرے کہ اس کے بیوی بچوں کو بھیک کی روٹیاں کھانی پڑیں؟'

ان کی بیوی بڑی ہمت والی ہیں۔ گرفتاری کے اگلے دن میں ان کے گھر گیا تو دیکھا محلے بھر کے کپڑے جمع کر کے دھو رہی ہیں۔ میں فوراً گھر پلٹا اور اپنی دونوں گھر والیوں کو آقا کے گھر بھیجا۔"

'تمہاری دونوں بیویاں میل ملاپ سے رہتی ہیں یا لڑتی جھگڑتی ہیں؟ میرے لیے تو ایک ہی کو سنبھالنا قیامت ہے۔"

حاجی علی بولا: 'آپ کی بیگم، میری بہن، تو ایک جواہر پارہ ہیں۔ لوگوں کا کس قدر خیال رکھتی ہیں، قیدیوں کے خاندانوں کو۔۔۔'

کرنل صاحب مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر بولے: 'خیر، تو تم کیا کہہ رہے تھے؟"

غرض عورتوں نے شام تک سارے کپڑے دھو ڈالے، گھروں کی جھاڑ پونچھ کر دی،

کھڑکیوں کے شیشے صاف کیے۔ کہتے ہیں سہ پہر کے وقت لوگ آنا شروع ہو گئے۔ کوئی چاول لے آیا، کوئی روغن، کدو، شکر، چائے، پھلیاں، نان، گوشت۔ کہتے ہیں ان کا ایک مرید بینگنوں کی ایک بوری دے گیا، اور ایک ملازم عورت سکون آور گولیوں کی شیشی۔۔۔"

"اتنے بینگنوں کا کیا کیا؟"

آقا کی بیوی بھی انصاف والی ہیں۔ انھوں نے ضرورت کے مطابق اپنے پاس رکھے اور باقی غریب گھروں میں بانٹ دیے۔"

کیوان نے اب تک ایک لفظ نہ کہا تھا۔ اس کی استانی نے اسے "آدم آدم است" تین صفحوں پر نقل کرنے کا کام دیا تھا جو وہ رات کو پورا نہیں کر سکا تھا۔ اب وہ بخاری کے پاس بیٹھا لکھ رہا تھا۔ پھر اپنی کھلونا بندوق کی صفائی میں لگ گیا۔ کرنل صاحب اس خیال سے کہ کبوتر کی جدائی کا رنج اس کے دل سے دور ہو، اسے دوپہر کے وقت پل تجریش لے گئے تھے اور اسے ریشمی دستانے اور ایک چھتری خرید کر دی تھی۔ پھر اسے کھلونوں کی دکان میں لے گئے اور کیوان کی ضد پر، اسے ایک کھلونا بندوق دلوائی تھی، اس شرط پر کہ وہ اپنی بلی کے کانوں کو نشانہ نہیں بنائے گا۔ انھوں نے اسے بندوق کو بھرنے اور چلانے کا طریقہ سکھایا تھا۔ کیوان کی بلی بھی بخاری کے پاس آنکھیں بند کیے لیٹی تھی۔ کیوان نے بندوق ایک طرف رکھ کر پوچھا: 'حاجی، ان آقا کا بیٹا میرے برابر ہے؟'

حاجی علی نے بتایا: "ہاں، ان کا بڑا بیٹا آپ کی عمر کا ہے۔"

کیوان نے پوچھا: 'پہلی جماعت میں پڑھتا ہے؟ کون سے اسکول جاتا ہے؟'

حاجی علی بولا: 'اسلامی مدرسے میں آقا پسر۔ ہم سب کے بیٹے اسی مدرسے میں پڑھتے ہیں۔'

کیوان نے کہا: "آپ مجھے آقا پسر آقا پسر کیوں کہہ رہے ہیں؟ میرا نام کیوان ہے۔"

منصورہ خانم کمرۂ نشیمن میں آئیں اور بولیں: 'ارے، حاجی علی۔ آپ کی چائے تو ٹھنڈی ہو گئی۔'

حاجی علی بولا: "خانم، حجرِ اسود کی قسم جسے بوسہ دے چکا ہوں، اگر پڑوسی نہ ہوتا تو آپ کے نان و نمک کو ہاتھ نہ لگاتا جب تک کرنل صاحب آقا سے معافی نہ مانگ لیتے۔"

منصورہ خانم نے بلی کو بخاری کے پاس سے اٹھایا اور خود اس کی جگہ بیٹھ کر کہنے لگیں: "چائے میں نمک کہاں ہوتا ہے؟" پھر کچھ سوچ کر بولیں: "مگر اس بار انھوں نے کیا گل کھلایا ہے؟ جب سے ریٹائر ہوئے ہیں، کٹکھنے مرغ کی طرح ہر کسی کو کھسوٹتے پھرتے ہیں۔"

کرنل صاحب نے ترشی کے ساتھ جواب دیا: "تم جا کر اپنے معمے حل کرو اور بینگن پکاؤ، دخل در معقولات کی ضرورت نہیں ہے۔"

منصورہ خانم نے کہا: 'اخبار اب تک نہیں آیا۔ ایک تو اس اخبار والے کے انتظار نے مار

Scanned with CamScanner

رکھا ہے۔ ایک دن آتا ہے اور دوسرے دن غائب۔"

حاجی علی نے کھڑے ہو کر کوٹ پہنا اور اس کے بٹن بند کرنے لگا۔ کرنل صاحب بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی۔ حاجی علی نے پوچھا: "تو پھر کرنل صاحب، کب چل رہے ہیں آقا کے پاس؟"

کرنل صاحب بولے: "تم چاہتے ہو کہ مجھے تھوڑی بہت جو پنشن ملتی ہے وہ بھی بند کرا لوں؟"

کرنل صاحب کی شہرداری کے باغبان آقائے آوخ سے ملاقات دو دن تک نہ ہو سکی۔ آخر انھوں نے تیسرے دن اسے سلیمانی ڈیری میں جا پکڑا۔ صبح گیارہ بجے کا وقت تھا۔ کرنل صاحب نے اسے بڑے تحکمانہ انداز میں ہدایت کی کہ فی الحال وہ ان کے مکان کو دیکھ بھال لے تاکہ اگلے دن چھ بجے سے کام شروع کر سکے۔ دونوں خیابانِ اسدی پر چلتے چلتے مسجد کے دروازے کے سامنے آ پہنچے۔ عباولا شخص بدستور اسی جگہ بیٹھا تھا۔ آقائے آوخ نے اسے سلام کیا اور جھک کر اس کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ کرنل صاحب نے بھی بے اختیار سلام کر دیا مگر اس شخص نے جواب نہ دیا، بس ان پر یک نگاہ ڈالی اور عربی میں کچھ کہا جس میں سے کرنل صاحب صرف ایک لفظ 'غائبین' سن کر سمجھ سکے۔ حاجی علی جلدی سے اپنی دکان سے نکل آیا۔ بولا: "آقا، کرنل صاحب آپ سے معذرت کرنے آئے ہیں۔ آپ نے خود ہی منبر پر نہیں کہا تھا کہ دین میں توبہ کی گنجائش موجود ہے؟

کرنل صاحب کا خون کھول اٹھا۔ ان کا جی چاہا کہ ان تینوں کو پکڑ کر ماریں مگر اب وہ جوانی کا زور کہاں تھا! چلا کر حاجی علی سے بولے: "نامعقول شخص، میں نے کب کہا کہ میں معذرت کرنے آیا ہوں؟"

حاجی علی، یوں جیسے کسی بچے کو بہلایا پھسلایا جاتا ہے، ان سے کہنے لگا: "کرنل صاحب، آقا کے ہاتھ کو بوسہ دے دیجیے۔" کرنل صاحب بولے: "میں تو اپنے دادا کے ہاتھ کو بھی بوسہ نہ دوں، اس غلیظ آخوند کی کیا اوقات ہے!" پھر انھوں نے خود کو قابو میں کیا اور اس سے آگے کچھ نہ بولے۔ آخر وہ تین تھے اور یہ اکیلے۔ کیا ہوا اگر وہ ان پر ٹوٹ پڑیں۔۔۔ عباولا شخص تو خیر نحیف تھا مگر حاجی علی اور آقائے آوخ اچھے تگڑے تھے۔ جوڑ برابر کا نہ تھا، سو یا تو وہ پسپائی اختیار کر سکتے تھے یا کسی جنگی حیلے سے کام لے سکتے تھے۔ خوش قسمتی یہ ہوئی کہ حاجی علی مڑا اور اپنی دکان کی طرف چلا گیا، اور آقائے آوخ بھی جس راستے سے آیا تھا اسی پر واپس چل پڑا۔ عبا پہنے ہوئے شخص نے ایک بار پھر عربی کی کوئی آیت پڑھی۔

کرنل صاحب گھر لوٹ آئے اور اضطراب کی حالت میں کمرۂ نشیمن میں بیٹھ گئے۔ ایک مُردہ آخوند ایک تو سلام کا جواب نہیں دیتا اور بعد میں عربی میں گالیاں دیتا ہے، اور آدمی کی سمجھ

میں بھی نہیں سنتا کہ اُس نے کیا کہا اور میں نے کیا سنا۔ اگر وہ ریٹائر نہ ہوئے ہوتے تو جانتے تھے کہ اُس کے سر پر کیا بلا لا سکتے تھے۔ خائنین؟ میں غدار ہوں؟ میں، جس نے تیس برس ملک کی خدمت کی ہے؟ یہ درست ہے کہ فضائیہ میں ہوتے ہوئے میں نے کبھی جہاز نہیں اڑایا، مگر کیا دفتر کا کام کام نہیں ہوتا؟ صبح سے شام تک آدمی ہزار اچھی بری باتوں کے ساتھ نباہتا ہے۔ پندرہ سال کرنل کے طور پر اس امید میں گزار دیتا ہے کہ اس سال نہیں تو اگلے سال بریگیڈیئر کے عہدے پر ترقی ملے گی۔ اور پھر ہر سال کوئی نہ کوئی تربیت حاصل کرتا ہے، جنگی ٹیکٹکس، ٹوپوگرافی، عالمی سٹریٹیجی --- بڑھاپے میں انگریزی تک سیکھتا ہے۔ ہر سال امتحان میں بیٹھتا ہے، اور آخر کار درجۂ آدمیت تک پہنچے بغیر، یعنی بریگیڈیئر کے عہدے پر ترقی پائے بغیر، ریٹائر کر دیا جاتا ہے، جبکہ اس کے ماتحت بریگیڈیئر بلکہ جنرل کے عہدوں تک جا پہنچتے ہیں اور خود اسی کے افسرانِ بالا بن بیٹھتے ہیں۔ ان سب باتوں کا رنج تو خیر، اوپر سے آدمی کو غدار کا لقب بھی سننا پڑے! ٹھیک ہے، اسے مزہ چکھاؤں گا --- اگر سادہ لباس میں کچھ سپاہی بھیج کر ڈنڈوں سے مرمت کرا دی جائے تو کیسا ہو؟ مگر میں تو ریٹائر ہو چکا ہوں۔ کیوں نہ میجر عیوض زادہ کو فون کروں اور اس سے یہ کام کرنے کو کہوں؟ آخر کیوں یہ شخص وہاں بیٹھ لوگوں کی راہ روکا کرتا ہے؟ کہہ بھی رہا تھا کہ یہ میرا مورچہ ہے، اسے خالی نہیں کروں گا۔ کیسا مورچہ؟ مورچہ تو جنگ کے دنوں کی چیز ہے اور اسے فوجی لوگ چھپ کر حملہ کرنے کے واسطے بناتے ہیں۔

انھوں نے جوتے اتار کر کمرے کے دروازے کی چوکھٹ پر دے مارے اور چلا کر کہا: ”ارے کوئی ہے؟ میرے سلیپر لاؤ!“ انھوں نے ریڈیو کے اوپر رکھی تاش کی گڈی اٹھائی اور پتوں کی مختلف ترتیبیں بنانے لگے مگر چین کسی طور نہ آیا۔ پھر تسبیح پھیرنے لگے، وہ بھی بے فائدہ رہی۔ سگریٹ چھ مہینے پہلے چھوڑ چکے تھے۔ یہ عادت آسانی سے نہیں چھٹی تھی۔ کس قدر بھنے ہوئے بادام، چیونگ گم اور مٹھائیاں کھا کھا کر خود کو بہلانا پڑا تھا۔ اب وہ بے اختیار الماری کی طرف بڑھے اور ونسٹن سگریٹ کا ڈبہ نکال لائے۔ ڈبہ کھولتے ہوئے ان کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ مگر اب ماچس نہ تھی۔ انھوں نے پھر پکار کر کہا: ”اس گھر میں دیا سلائی ہے یا نہیں؟“ جواب میں منصورہ خانم کی آواز سنائی نہ دی۔ ضرور ظہر کی نماز پڑھتی ہوں گی، پھر صیغۂ سجدہ ہوگا، اس کے بعد عصر کی نماز کا وقت ہو جائے گا۔ وہ موزے پہنے پہنے باورچی خانے میں گئے اور جھپٹ کر ماچس اٹھا لائے۔ تین دیا سلائیاں ضائع کیں تب کہیں ان سے سگریٹ سلگ سکا۔

منصورہ خانم کمرے میں آئیں۔ پوچھنے لگیں: ”کیا ہوا ہے تمھیں؟“ پھر ان کی نظر سگریٹ کے دھوئیں کے حلقوں پر پڑی۔ بولیں: ”ارے خدا کی پناہ! پھر شروع کر دیا؟ یاد نہیں خود کیا کہا تھا؟ کہ کیوں ان کو مرا ہوا دیکھوں اگر آئندہ سگریٹ کو ہاتھ لگاؤں؟“

کرنل صاحب نے کہا: ”عورت! مجھے دق نہ کرو۔ مسجد اسدی کے سامنے ایک غلیظ آخوند کو

آج سلام کیا، اس نے جواب نہ دیا۔ جس روز کیوان کا کبوتر مرا تھا، اس نے مجھے اور بچے کو لوگوں کے سامنے شرمندہ کیا تھا۔ آج عربی میں گالیاں دینے لگا ایسی زبان میں جو میری سمجھ میں بھی نہیں آتی۔ مُردار نکما ذلیل کہیں کا!"

منصورہ خانم بولیں: "کہیں آقا شیخ عبداللہ پیش امام مسجد کا ذکر تو نہیں کر رہے؟ بہت دن قید میں رہے، اب ان پر منبر اور مسجد کی ممانعت ہو گئی ہے۔۔۔"

وہی، وہی! تم اسے جانتی ہو؟ آقا؟ آقا تو اسے ایسا بنایا ہو کہ وہ بھی یاد ہی کرے!

منصورہ خانم گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر کرنل صاحب کے پاس بیٹھ گئیں۔ بولیں: "ٹھیک ہے، ٹھیک ہے! اب اور کچھ زبان سے مت نکالو! میں انھیں جانتی ہوں؟ انھیں کے پیچھے تو نماز پڑھا کرتی تھی۔ جب وہ قید ہوئے تو اکثر ان کے بیوی بچوں کے پاس بھی جاتی تھی۔۔۔"

سبحان اللہ! تو بڑھی بی، تم بھی؟

تمھیں بتایا تو تھا کہ ایک قیدی کے گھر والوں کی مدد کیا کرتی ہوں۔۔۔

بتایا تھا، مگر یہ کہاں بتایا تھا کہ ایسے نکموں کی مدد کرتی ہو۔۔۔"

نکمے ہو گے تم خود! مگر اتنا جان لو کہ تمھاری کمائی میں سے ایک پیسا بھی جو میں نے کسی کو دیا ہو۔ تمھاری کمائی تو ظلم کا مال ہے جانِ عزیز!"

کرنل صاحب چلائے: "بس بس! جب سے گھر بیٹھا ہوں تمھارے بھی منھ میں زبان آ گئی؟ چپ رہو، ورنہ ہڈیاں تڑوا بیٹھو گی!

منصورہ خانم سکون سے بولیں: "اپنے دل کا غصہ میرے سر پر اتارتے ہو، مگر میں بھی اب بحث نہ کروں گی۔ میں تمھاری دشمن تھوڑا ہی ہوں۔ تیس برس اچھے برے میں ساتھ دیا ہے۔ اگر آقا نے تمھارے سلام کا جواب نہیں دیا تو تمھیں رنج نہ کرنا چاہیے۔ دوبارہ سلام کرو، تین بار، دس بار۔ آخر تمھیں جیسوں کے ہاتھوں انھیں یہ مصیبت اٹھانی پڑی ہے۔"

کرنل صاحب نے کہا: "عورت! یہ شخص حکومت کا مخالف ہے، اور میں حکومت کا نمک خوار۔ تم چاہتی ہو میں جا کر اس کا ہاتھ چوموں؟ پھر اسے سلام کروں؟ ایسا تو سو سال میں بھی نہ ہوگا۔ وہ اس کا خواب ہی دیکھا کرے!"

منصورہ خانم بولیں: "کرو گے، ضرور کرو گے۔ تم آدمی دل کے برے نہیں ہو۔۔۔ معلوم بھی ہے آقا خمس اور زکوٰۃ اور ثلث کی تمام رقم غریب خاندانوں میں بانٹ دیتے ہیں، اور خود ان کے بال بچے مفلسی میں بسر کرتے ہیں۔"

"تو خود کو کیوں مصیبت میں ڈالا؟ کیوں آخر؟ اور کیوں سخت جاڑے میں مسجد کے باہر جا بیٹھتے ہیں؟ تنگ دلی کی سے کیا؟ بے گھر میں کیوں نہیں بیٹھتا؟"

منصورہ خانم بولیں: "وہ بہت صابر ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ وہ حق پر ہیں۔ ایمان رکھتے

Scanned with CamScanner

ہیں۔"

کرنل صاحب ایک دم پُرسکون ہو گئے۔ انھوں نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور ان کا دل پگھلنے لگا۔ منصورہ خانم کے بالوں میں سفیدی آگئی تھی، آنکھوں اور ہونٹوں کے گرد ایسی لکیریں پڑ گئی تھیں کہ دور نہ ہوتی تھیں، رخساروں پر جھریاں پڑنے لگی تھیں۔ ہنستے میں ان کے بائیں گال پر جو ننھا سا گڑھا پڑ جایا کرتا تھا اب ایک گہری لکیر کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ بدن پھیل گیا تھا، گھٹنوں پر ورم آگیا تھا اور انگلیوں کے سرے بھی سُوج گئے تھے۔ اس عورت نے تیس برس ان کے ساتھ بسر کیے تھے، انھیں تین بیٹوں اور ایک بیٹی کا باپ بنایا تھا جو سب کے سب دیس پردیس میں مارے مارے پھر رہے تھے۔ بس ماں کو خط لکھتے تھے اور وہ عینک لگا کر بیٹھی ان خطوں کو بار بار پڑھا کرتی تھیں۔ باپ کو بھی سلام لکھتے تھے۔ یہ عورت تیس برس تک ایک ہی تکیے پر سر رکھ کر ان کے ساتھ سوئی تھی۔ ان پر کتنی نوازشیں تھیں اس کی، عشق، مہربانی، دلجوئی، تیمارداری، رکابداری --- ہاں، اس نے انھیں بتایا تھا کہ وہ قیدیوں کے گھرانوں کی مدد کیا کرتی ہے مگر یہ نہ بتایا تھا کہ وہ کیسے قیدی ہیں۔ مگر یہ بھی تو خود انھیں کا قصور تھا۔ شام کو مغرب کے وقت تھکے ہارے لوٹتے تھے اور صبح چھ بجے اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ کاہے کے لیے؟ کن لوگوں کے لیے؟ ان کے لیے جنھیں کوئی آخوند سلام کا جواب تک نہ دے؟ جن کی بیویاں انھیں طعنے دیں کہ تم جیسوں کی وجہ سے آقا کو یہ مصیبت اٹھانی پڑی؟ پناہ بخدا! ہرچند کہ وہ اپنی بیوی کی جلی کٹی سننے کے عادی ہو گئے تھے، مگر پھر بھی...

کرنل صاحب رات کا کھانا کھا کر ٹیلی وژن کے سامنے بیٹھ جایا کرتے اور کچھ دیر میں وہیں بیٹھے بیٹھے سو جاتے۔ ان کی بیوی ری سے ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھتیں اور کہتیں: "اٹھو جانِ عزیز! آکر بستر پر سوؤ، یہاں سردی لگے گی۔" وہ انھیں بغلوں میں ہاتھ دے کر اٹھاتیں اور بستر پر لٹا کر، لحاف اُڑھا کر پوچھتیں: "پیروں کی مالش کردوں؟"

وہ صبح کرنل صاحب سے بھی پہلے جاگتیں، نماز پڑھتیں اور کبھی ایسا نہ ہوا کہ انھوں نے ناشتہ کیے بغیر کرنل صاحب کو گھر سے نکلنے دیا ہو۔ وہ اپنے ہاتھ سے ان کے لیے پھلوں کا رس نکالتیں۔ جب کرنل صاحب نظر اٹھا کر دیکھتے تو منصورہ خانم کی آنکھیں مسکرا اٹھتیں۔ البتہ ان دونوں میں تکرار بھی ہوتی رہتی تھی اور منصورہ خانم کے کیسے میں ایسے موقعوں کے لیے سخت سے تُند اور تلخ کلمات موجود تھے، مگر صلح کے لیے پہلا قدم اٹھانے والی بھی وہی ہوتی تھیں۔ کہتیں: "آخر ہمیں جینے کے لیے کتنی زندگیاں ملتی ہیں؟" کرنل صاحب بھی شوہر کی حیثیت سے اچھے خاصے رہے تھے۔ منصورہ خانم نے ابھی کچھ دیر پہلے خود ہی تو کہا تھا کہ وہ دل کے بُرے نہیں ہیں۔ وہ اپنی بیوی اور بچوں کا جی میلا نہ ہونے دیتے تھے۔ کبھی انھیں گرمائی سیرگاہوں پر لے جاتے تو کبھی سمندر کے کنارے۔ ہر مہینے کے شروع میں وہ منصورہ خانم کو فوجیوں کے لیے مخصوص مارکیٹ

Scanned with CamScanner

لے جاتے اور وہاں سے اس قدر سامان خریدوا دیتے جو تین مہینوں کے واسطے کافی ہوتا۔ اور پھر اس تمام سامان کو گاڑی تک خود اٹھا کر لاتے۔۔۔

جب وہ جوان تھے تو دوست انہیں "لیڈی کلر" کہا کرتے تھے۔ وہ خود اپنے کو آئینے میں دیکھتے تو بے اختیار مونچھوں کو تاؤ دینے لگتے، فضائی فوج کی وردی ان کے متناسب بدن پر سجتی تھی۔ ان کی بیوی انہیں نظرِ بد سے محفوظ رکھنے کے لیے اکثر دھونی دیا کرتی تھیں اور وہ اپنی نگاہوں میں خمار لا کر اُن کی نگاہوں میں الجھاتے تھے۔ منصورہ خانم کہتیں: "بس ناک تمہاری بہت بڑی ہے!" ہاں، ان کی ناک واقعی ذرا لمبی تھی مگر چہرہ کشیدہ اور زاویہ دار تھا، آنکھیں گہری سیاہ، مونچھیں پتلی اور دیدہ زیب۔۔۔

جب وہ جیپ میں سوار ہو کر نکلتے تو کوئی دن جاتا ہوگا کہ پڑوس میں رہنے والی سودابہ خانم اپنے گھر سے پورے ناز اور آرائش کے ساتھ نکل نہ آتی ہوں اور ان سے جیپ میں بٹھا کر بینک تک یا کلینک تک پہنچانے کی فرمائش نہ کرتی ہوں۔ پھر وہ اپنے ہونٹوں کو غنچے کی طرح سکیڑ دیتیں، اپنی زلفوں کو جھٹک کر پیشانی سے ہٹاتیں اور کہتیں: "بس یہیں!" اور فاطمہ کی تو بات ہی نہ پوچھو۔ کرنل صاحب جہاں کہیں جاتے وہ راہ میں آ کھڑی ہوتی، سلام کرتی، اور سر سے پیر تک ان کا یوں جائزہ لیتی جیسے اپنی آنکھوں کے عدسوں سے ان کی تصویر اتارنا چاہتی ہو۔ مگر پلک جھپکنے میں وہ خود، منصورہ خانم اور فاطمہ، سب پر بڑھاپا آ گیا تھا۔ اور سودابہ خانم اور فاطمہ ہی پر کیا موقوف، آقائے مسروری کی چلبلی، کھلنڈری لڑکی پروانہ نے تو علانیہ منصورہ خانم سے کہا تھا کہ کرنل صاحب جیسے کسی شخص سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ وہ پندرہ سال سے کرنل ہی کے عہدے پر تھے۔

لیکن ان کی بیوی منصورہ خانم چادر پہنتی تھیں اور آرائش سے پرہیز کرتی تھیں۔ آخر آخر تو انہوں نے بھنویں اکھاڑنا بھی چھوڑ دیا۔ بس چہرہ بالکل پاک صاف رکھتیں۔ ناخنوں کی پالش کو حرام جانتی تھیں۔ کسی ضیافت میں کرنل صاحب کے ساتھ نہ جاتیں۔ شروع میں دو ایک بار شوہر کے ساتھ دعوتوں میں گئیں مگر جوں ہی تاش کا کھیل شروع ہوا ڈاکٹر قاسم غنی کی کتاب "تاریخِ تصوف در اسلام" کھول کر بیٹھ گئیں۔ دعوت میں آئے ہوئے مہمان اخروٹ توڑتے، تمباکو پیتے اور منصورہ خانم پر پھبتیاں کستے۔ شراب کا دور بھی چلتا۔ ایک بار ایسی ہی ایک محفل میں منصورہ خانم نے سلائیاں نکال کر کچھ بننا شروع کر دیا تو مہمانوں نے بُرا مانا۔ منصورہ خانم طیش میں آ کر اٹھ کھڑی ہوئیں اور کہنے لگیں: "مذاق تو مجھے آپ لوگوں کا اڑانا چاہیے۔ مگر مجھے کیا! آپ لوگوں کے گناہ میرے حساب میں تو لکھے نہیں جا رہے، اور خدا کا شکر ہے کہ ہم سب ایک ہی قبر میں نہیں جائیں گے۔ بس اور کچھ نہ کہوں گی۔" یہ کہا اور وہاں سے چل دیں۔ کرنل صاحب واپسی میں انہیں ساتھ لیتے آئے مگر زبان سے ایک لفظ نہ کہا۔۔۔

کرنل صاحب کا ارادہ تھا کہ ایک کے بعد ایک تین چار سگریٹ پی ڈالیں، مگر پھر یک دم

انھوں نے کچھ سوچ کر جو پہلا سگریٹ ان کے ہاتھ میں تھا اور ابھی آدھے سے زیادہ باقی تھا، راکھ دان میں مسل کر بجھا ڈالا۔

منصورہ خانم بولیں: "میں تم سے نہ کہتی تھی! تم نے خود دیکھا کہ جب سے سگریٹ چھوڑی ہے تمھاری صحت کتنی اچھی ہو گئی۔ اگر آخری عمر میں شراب اور جوئے سے بھی توبہ کر لو تو سو برس تک جیو گے۔"

کرنل صاحب نے کہا: "تم سے جو نا کہتی ہو؟"

انھوں نے منصورہ خانم کا ہاتھ تھام لیا۔ ان کا ہاتھ سُوجا ہوا لگتا تھا اور اس پر سیاہ اور کتھئی رگیں اُبھر آئی تھیں۔ کبھی یہی ہاتھ گل مریم کی نرم و نازک شاخ جیسا ہوا کرتا تھا۔

منصورہ خانم بولیں: "نماز پڑھا کرو، قرآن پڑھا کرو۔ تم نہیں جانتے اس میں کیسا لطف ہے۔ انسان کی روح تازہ ہو جاتی ہے۔"

کرنل صاحب کچھ نہ بولے۔ منصورہ خانم کہتی رہیں: "میں جس ہستی کی مقلد ہوں---"

کرنل صاحب ہنس پڑے۔ انھیں اپنی شادی کی پہلی رات یاد آ گئی۔ منصورہ خانم کے والد نے ان دونوں کے ہاتھ پکڑ کر ملا دیے تھے، بے شمار دعائیں اور آیتیں پڑھی تھیں اور نصیحتیں کی تھیں، اور پھر بہت سی دعاؤں کے ساتھ ایک بڑا سا لفافہ لا کر ان کے تکیے کے نیچے رکھ دیا تھا۔ اس لفافے میں ایک مکان کے کاغذات تھے جو آبِ سردار کے کنارے واقع تھا اور منصورہ خانم کے واسطے ان کے والد کی جانب سے تحفہ تھا۔ اس گھر میں یہ دونوں بہت دیر رہے اور وہ ان کے لیے بہت مبارک ثابت ہوا۔ پھر کرنل صاحب رفتہ رفتہ اس قابل ہو گئے کہ خیابانِ اسدی کے کوچۂ پروین میں واقع یہ مکان بنوا سکیں جس میں وہ اب رہتے تھے۔ منصورہ خانم والا مکان انھوں نے بازار کے ایک حاجی کو اچارے پر دے دیا۔ کرنل صاحب اس کے وسطے اپنی بیوی کی سلیقہ مندی اور کفایت شعاری کے ممنون تھے ورنہ قمار باز آدمی کی تو جیب میں سوراخ ہوتا ہے۔

جب سب مہمان رخصت ہوئے اور مجلہ خالی ہو گیا تو اُن دنوں کے لیفٹی کرنل لیفٹننٹ نے اپنی دلھن کا نرم و نازک، شاخِ گل سا ہاتھ تھام کر اسے بوسہ دیا اور کہا: "اچھا تو خانم، اب مجھ سے بات کرو۔" منصورہ خانم نے سر جھکا لیا اور پوچھا: "آپ کس ہستی کے مقلد ہیں؟ کس کی اقتدا کرتے ہیں؟" ان کی آواز نرم مگر لرزاں تھی۔ لیفٹننٹ نے ہنس کر کہا: "ارے بابا، پہلے مجھے ایک بوسہ تو دو، یہ باتیں بعد میں ہوتی رہیں گی۔"

منصورہ خانم نے یہ سن کر ہونٹ بھینچ لیے اور اپنی رنجیدہ نظریں اُن کی طرف اٹھائیں، ان نظروں میں تپش معلوم ہوتی تھی۔

کرنل صاحب کا دھیان ماضی سے حال کی طرف پلٹا۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے، سگریٹ کے ڈبے کو اٹھا کر الماری میں رکھا اور تالا لگا دیا۔ منصورہ خانم بولیں: "میں تمھیں کوئی رسالہ دوں پڑھنے کے

ہیے؟ میرے پاس ڈاکٹر شریعتی کی زیادہ تر کتابیں ہیں۔ کچھ تو میں نے اپنے ہاتھ سے نقل کی ہیں۔ آیت اللہ طالقانی۔۔۔"

"کیوں؟"

"کیوں کیا مطلب؟"

"ہاتھ سے کیوں نقل کی ہیں؟"

"ان دونوں کی کتابوں پر پابندی جو لگی ہوئی ہے۔ جس کے پاس سے نکلیں اسے چھ مہینے کی جیل ہو جاتی ہے۔" منصورہ خانم نے ایک لمبا سانس لیا، پھر بولیں: "وہ خود بھی قید میں ہیں۔ اور طالقانی بھی۔ میرا بہت جی چاہتا ہے کہ جیل میں ان سے ملنے کی اجازت مل جائے۔"

"ان سے کس لیے ملنا چاہتی ہو؟"

"میں اپنے رہنماؤں کو سلام کرنا چاہتی ہوں اور۔۔۔"

کرنل صاحب کچھ سوچ کر بولے: "تم جانتی ہو مجھے ان حلال و حرام، نجس و طاہر اور جائز ناجائز کے مسئلوں سے وحشت ہوتی ہے۔"

"یہ تو فروعیات ہیں۔ اصل بات تو انصاف کی ہے۔"

کرنل صاحب نے کہا: "تو ٹھیک ہے، میں نماز پڑھنا شروع کر دیتا ہوں، بشرطیکہ تم مجھے چار شادیاں اور [illegible] کرنے دو۔"

"میں نے کہا نا کہ اصل بات انصاف کی ہے۔ مجھ پر سوکن لاؤ گے تو میرا دل ٹوٹ جائے گا، اور یہ ظلم ہوگا۔"

صبح بادلوں نے جگہ خالی کر دی اور پھیکی سی دھوپ نکل آئی۔ کچھ بچے کھچے مہاجر پرندے آسمان پر گویا دستخط کرتے گزر رہے تھے۔ منصورہ خانم بولیں: "ابھی ہم اتنے بوڑھے نہیں ہوئے کہ کام نہ کر سکیں۔ چلو خود پھولوں کو گل خانے میں رکھ آئیں۔"

اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔ آقائے آوش نے بڑی نخوت کے ساتھ فاطمہ سے کہلا بھیجا تھا: "میں نہیں آؤں گا۔ کوئی زبردستی ہے؟" خود فاطمہ نے کہا تھا: "میرے کندھے میں پیچھے کی طرف درد ہو رہا ہے مگر میں آؤں گی تاکہ آپ مجھے نمک حرام نہ کہیں۔"

فاطمہ کے پپوٹے سوجے ہوئے تھے اور دائیں آنکھ ہر وقت بے اختیار پھڑکتی رہتی تھی۔ اب اس کی آنکھوں میں بجلیاں نہیں چمکتی تھیں اور نہ اب اس کے ہونٹ پہلے کی طرح بے کھٹکے مسکراتے تھے۔ فاطمہ کی نگاہ یہ کہتی معلوم ہوتی تھی کہ اب سب کچھ ختم ہو گیا، جاتا رہا۔ اس کے آدھے بال سفید ہو چکے تھے اور باقی آدھے میلے زرد رنگ کے تھے، اور یوں پھولے رہتے تھے کہ

Scanned with CamScanner

اس کا سر ایک غبارہ سا معلوم ہوتا تھا۔

کرنل صاحب نے پہلے پیازِ کوکب اور گلادیل کے پودوں کو باغیچے میں سے نکالا اور گل خانے کے ایک کونے میں ریت میں دبا دیا کہ اگر ماہِ اسفند کے آخر تک جی گئے تو کام میں آئیں گے۔ پھر دونوں میاں بیوی شمعدانی کے گملے باغیچے سے نکال نکال کر کھلے صحن کے بیچ میں ترتیب سے جمانے لگے۔ کیوان چھوٹے گملے اٹھا اٹھا کر منصورہ خانم کو تھماتا، وہ پیلے اور سرمازدہ پتے چن چن کر گملوں میں تازہ مٹی بھرتیں، اور فاطمہ انھیں لے جا کر کرنل صاحب کو دیتی کہ گل خانے کی سیڑھیوں پر جماتے جائیں۔ شاہ پسند اور یاسمن کے تغاروں کو اٹھا کر لانے کے لیے جوانی کا زور چاہیے تھا جو ان میں سے کسی کے پاس نہ تھا۔ ان تغاروں کو کھینچ کھینچ کر گل خانے کے دروازے تک پہنچایا گیا، پھر کرنل صاحب یاعلی کا نعرہ لگا لگا کر ایک ایک کو اٹھا کر گل خانے کے فرش پر رکھنے لگے۔ ان کے پاس کچھ فیل گوش بھی تھے جنھیں کمرۂ پذیرائی، کمرۂ نشیمن اور راہداری میں رکھ دیا گیا اور فاطمہ نے روئی کے پھاہے کو زیتون کے روغن میں تر کر کے ان کے پتوں کی مالش کی تاکہ وہ چمک جائیں۔ گل خانے میں فرن اور کیکٹس کے گملوں کے لیے جگہ نہ تھی۔ ان کو بڑے بڑے نباتی گملوں میں جما کر کمرۂ پذیرائی کے برابر والے کمرے میں ادھر ادھر رکھ دیا گیا اور وہ کمرہ بھی گل خانہ دکھائی دینے لگا۔ اب تمام پودے اور گملے ہر اس مقام پر جہاں گنجائش تھی چنے جا چکے تھے اور قد کے لحاظ سے ایسی ترتیب کے ساتھ کہ آدمی ایک نگاہ میں ان سب کا جائزہ لے سکتا تھا۔

رات میں منصورہ خانم کو اپنے ہاتھ کے درد سے اور کرنل صاحب کو کمر کے درد کی وجہ سے نیند نہ آئی۔ آدھی رات کو منصورہ خانم اٹھیں، اور ایک گولی اسپرین کی، جو ان کی بیٹی نے جرمنی سے بھجوائی تھی، کرنل صاحب کو دی اور ایک خود کھائی۔ پھر انھوں نے ایک دو دار کپڑا جس کے لفافے پر ایک جاپانی لڑکی کی تصویر بنی ہوئی تھی، گرم کر کے کرنل صاحب کی پیٹھ سینکی۔ وہ بولے: "کاش یہ لڑکی خود موجود ہوتی، بجائے اپنی تصویر کے۔" صبح فاطمہ آئی۔ اس کی گردن اکڑ گئی تھی اور ذرا بھی دائیں بائیں جنبش نہیں کرتی تھی۔ منصورہ خانم نے اپنی کلائی پر لچک دار پٹی باندھ رکھی تھی۔ وہ فاطمہ کی گردن پر وکس کی مالش کرنے لگیں، بولیں: "اب ذرا گردن گھماؤ۔" فاطمہ نے کہا: "نہیں گھومتی۔" کرنل صاحب بولے: "یہ گردن کسی کام کی نہیں رہی۔ اسے کسی ٹھیلے والے کو دے دو۔" اب گل خانے اور کمرۂ پذیرائی کے برابر والے کمرے میں کل کے جمائے ہوئے پودوں کو پانی دینے کا سوال تھا۔ کرنل صاحب نے جی کڑا کر کے خود یہ کام کرنے کا ارادہ کیا، اور کیا، اور کچھ بھی نہ ہوا۔ منصورہ خانم بولیں: "چشمِ بد دور! ماشاءاللہ تمھارے بدن کے چاروں ستون سلامت ہیں۔ صرف ناک ہے جو بڑھ کر ٹھوڑی کے پاس آنے لگی ہے اور تم بی بی طوطی دکھائی دینے لگے ہو۔"

منصورہ خانم نے جمعے کی رات کو آشِ رشتہ پکنے کو چڑھا دیا تھا۔ جمعے کی صبح گیارہ بجے کے

Scanned with CamScanner

قریب آش تیار ہو گیا، اور کیا خوب تیار ہوا! انھوں نے ایک بڑا پیالہ بھر کر اور اسے تلی ہوئی پیاز، ادرک، زعفران اور قیمے سے سجایا۔ پھر کرنل صاحب سے کہنے لگیں: "مجھے ذرا گاڑی میں آقا کے گھر لے چلو۔" کیوان بھی سوار ہو گیا۔ گاڑی بڑی تھی اور پچھواڑے کی گلیاں تنگ اور کیچڑ سے بھری ہوئی تھیں۔ ایک بار تو گاڑی کی سپر گلی کی دیوار کے پاس لگے ہوئے بجلی کے کھمبے سے ٹکرا گئی مگر کرنل صاحب خاموش رہے۔ منصورہ خانم اور کیوان آش کا پیالہ لے کر اندر گئے اور کرنل صاحب باہر گاڑی میں بیٹھے رہے۔ گلی کیچڑ سے بھری ہوئی تھی، سامنے ایک خالی میدان تھا اور اس میں بھی ہر طرف کیچڑ تھی۔ ایک جانب چھوٹے بڑے بچوں نے پھٹا پرانا جال لٹکا کر ایک بانس گاڑ دیا تھا اور والی بال کھیل رہے تھے۔ آقا کا مکان پرانا بنا ہوا تھا، دروازے کے دونوں طرف چبوترے تھے اور دروازے کے اوپر سبز کاشی تھی جس پر عربی میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ کرنل صاحب نے کوٹ کی جیب میں سے عینک نکالی اور گاڑی سے اتر آئے، عینک لگائی اور کاشی پر لکھی ہوئی آیت پڑھی کہ: نصر من اللہ و فتح قریب۔ سردی بہت تھی۔ وہ پھر گاڑی میں آ بیٹھے۔ بہت دیر ہو گئی تھی، انھیں اندیشہ ہوا کہ شاید آقا کی بیوی نے آش کا پیالہ لینے سے انکار کر دیا ہوگا اور منصورہ خانم ان کی منتیں کر رہی ہوں گی اور خود کو آقا کی بیوی کے سامنے حقیر کر رہی ہوں گی۔ انھوں نے ہارن بجایا، کوئی جواب نہ ملا۔ انھوں نے گاڑی میں لگا ہوا ریڈیو چلا دیا۔ اس میں سے کسی مرد کے بے سُرا گانے کی آواز آ رہی تھی جو ان سے برداشت نہ ہوئی۔ سوچنے لگے: اس شخص کی ہمت تو دیکھو، ایسی بے سُری آواز کے ہوتے ہوئے گانا گا رہا ہے۔

پھر منصورہ خانم اور کیوان آتے دکھائی دیے اور کرنل صاحب نے سکون کا سانس لیا۔ کیوان ان کے برابر میں آ بیٹھا۔ بولا: "ڈیڈی، مجھے بھی مدرسے میں بھیج دیجیے۔ میں آقا کے بیٹے محسن کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ مدرسے میں بتاتے ہیں اپنے والدین کو خوش رکھنا چاہیے۔ والدین کیا ہوتا ہے؟"

کرنل صاحب بے صبری سے بولے: "ماں باپ کو کہتے ہیں۔ تمھاری ماں تو جرمنی چلی گئیں پڑھنے، اور باپ نے دوسری شادی کر لی۔ تمھارے والدین نہیں ہیں۔"

منصورہ خانم نے کہا: "بچے سے ایسی باتیں تو نہ کرو۔" پھر کیوان سے کہنے لگیں: "بیٹے، ہم دونوں تمھارے والدین ہیں۔"

کیوان بولا: "تو ٹھیک ہے۔ مجھے مدرسے میں بھجوا دیجیے تاکہ آپ مجھ سے خوش رہیں۔"

برف، برف، برف۔ ہر طرف برف پھیلی ہوئی تھی اور خدا نے وجود رکھنے والی ہر چیز کو سفید کر دیا تھا۔ پیڑ پودے، ڈھلواں چھتیں، ٹیلی ویژن کے انٹینے، کھڑکیوں کی الگنیاں، تالابوں کی

Scanned with CamScanner

سطح، باغیچے، پکے فرش، سب پر برف کی پتلی یا موٹی تہہ جمی ہوئی تھی۔ لگتا تھا تمام گھر میں، بیٹھی اور لیٹی ہوئی چیزیں سانس روکے انتظار کر رہی ہیں۔ کرنل صاحب کے گھر کی دنیا بھی گویا ایک بڑی سی بلی بن کر کسی چوہے کی گھات میں تھی۔

کیوان کو سردی لگ گئی تھی۔ منصورہ خانم نے ایک برتن میں گل بابونہ چن کر بخاری کے پاس رکھ دیے تھے۔ گرم ہوا پھولوں سے ٹکرا کر آتی تو سارے کمرے میں تسکین بخش مہک پھیل جاتی۔ کرنل صاحب کیوان کا ہاتھ تھامے اس کے سرہانے بیٹھے تھے۔ بچے کا ہاتھ تپ رہا تھا۔ کرنل صاحب بولے: "کیوان بیٹے، تم ٹھیک ہو جاؤ گے اور موسم گرم ہو جائے گا تو تمھیں کبوتروں کی جوڑی خرید کر دوں گا۔ اور ان کے پر بھی نہیں نوچوں گا۔"

کیوان بولا: "دادا جان، میں آپ سے کہہ رہا تھا کہ کبوتر کے پر مت نوچیے، اسے درد ہوتا ہے۔" منصورہ خانم اندر آئیں اور کہنے لگیں: "جانِ عزیز، اٹھو گاڑی اسٹارٹ کرو اور جا کر پلِ تجریش سے بچے کے واسطے شلغم، آش کی سبزی اور میٹھے لیموں لے آؤ۔"

"وہاں پارک کرنے کی جگہ کہاں ہو گی؟"

"تو ٹھیک ہے، اپنے بوٹ پہن کر پیدل ہی چلے جاؤ۔"

کیوان بولا: "دادا جان، مجھے آش شلغم اچھا نہیں لگتا۔"

کرنل صاحب کو میٹھے لیموں نہیں ملے مگر شلغم اور آش کی سبزی مل گئی۔ برف پر ان کی گاڑی پھسل کر ٹیڑھی اور سیدھی ہو رہی تھی۔ وہ سوچنے لگے: برف پر چلنے کے ٹائر لگے ہوئے ہیں، پھر یہ کیا مصیبت ہے؟ جب خیابانِ سعدی میں مڑنے لگے تو گاڑی کے ٹائروں نے پھسل کر ایک مکمل نصف دائرہ کھینچا۔ ابھی سقاخانے تک نہ پہنچے تھے کہ انھیں آقا کی عبا برف پر پڑی دکھائی دی۔ انگیٹھی الٹی پڑی تھی، انگارے بجھے ہوئے تھے۔ اس سے آگے آقا کی شب کلاہ پڑی تھی اور اس سے آگے جھگڑا ہو رہا تھا۔ انھوں نے اسی جگہ گاڑی روک لی۔ سڑک کے دونوں کناروں پر برف کے انبار تھے اور کنارے پر گاڑی روکنے کی جگہ نہ تھی۔ وہ گاڑی سے اترے تو ان کے جوتے برف میں دھنسنے لگے۔ دو آدمی آقا کو بازوؤں سے پکڑ کر کھینچے لیے جا رہے تھے۔ حاجی علی اور آقائے آوخ آقا کو ان کی گرفت سے چھڑانا چاہتے تھے۔ دونوں آدمی سادہ لباس میں تھے مگر تگڑے اور چاق و چوبند تھے اور کرنل صاحب بچہ نہ تھے کہ نہ سمجھ سکیں کہ ان کے کوٹوں کے نیچے ہتھیار بندھے ہوئے ہیں۔ دونوں مڑ مڑ کر حاجی علی اور آقائے آوخ کو مار رہے تھے۔ دو چار مرد اور کچھ بچے بغل کی گلی سے نکل آئے تھے۔ کرنل صاحب تیز قدم بڑھاتے ہوئے نزدیک پہنچے اور چیخ کر بولے: "ٹھہرو، رکو! میں کرنل آریائی فر ہوں۔۔۔" سب لوگ رک گئے مگر دونوں آدمیوں نے آقا کے بازو نہ چھوڑے۔ کرنل صاحب آگے آ کر ان سے بولے: "یہ کیا قصہ ہے؟ کیا کر رہے ہو آقا کے ساتھ؟" پھر ناگہاں ان کی زبان سے نکلا: "مسلمان ہو یا نہیں؟"

جو آدمی آقا کے داہنے بازو کو سختی سے تھامے ہوئے تھا بولا: سینکڑوں بار سمجھایا ہے کہ مسجد کے سامنے مت بیٹھو مگر یہ سنتے ہی نہیں۔

کرنل صاحب فرمانے لگے: کیوں؟ کیا مسجد کے سامنے بیٹھنا جرم ہے؟

وہی آدمی بولا: امن عامہ کے خلاف ہے۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں۔

کرنل صاحب نے کہا: ڈاکٹر صاحب سے جا کر کہنا، کرنل آریانی فر نے سلام کہا ہے اور کہا ہے کہ سڑک سب کے استعمال کی جگہ ہے۔ جس کا جی چاہے سڑک پر بیٹھ سکتا ہے۔ پھر یکایک انہیں اپنے کہے پر پشیمانی کا احساس ہوا اور انہوں نے خوف زدہ ہو کر خود سے کہا: احمق آدمی، یہ تم کیا کر رہے ہو؟ انہوں نے تھوک نگلا اور بولے: کہنا کرنل صاحب نے کہا ہے کہ خود ٹیلی فون کریں گے۔ حاجی علی اور آقا کے آدمی کی آنکھوں میں احسان مندی اور مہربانی جھلک رہی تھی اور آقا کی آنکھوں میں حیرت۔

انہیں سختی سے کام لینا چاہیے۔ ہرچہ بادا باد۔ اب ان کی زندگی کے کتنے سال رہ گئے ہیں؟ ان کی اور ان کی بیوی کی زندگی کے؟ وہ تو خدا سے یہی چاہتی ہے۔ کئی بار کہہ چکی ہے کہ آدمی کو یزیدی نہیں حسینی ہونا چاہیے۔ بہت ہوا تو پنشن روک لیں گے۔۔۔ پدرانہ لہجے میں بولے: میری بات کہہ دینا۔ لوگوں کو اس قدر مت ستاؤ کہ دھواں خود تمہاری آنکھوں کو جلانے لگے۔ وہ اب بہت آگے بڑھ آئے تھے، مگر عجیب بات ہے کہ اب خود کو روکنا ان کے بس میں نہیں رہا تھا۔

انہوں نے آقا کا ہاتھ تھاما اور بولے: آقا، تشریف لائیے۔ میری گاڑی حاضر ہے۔

دونوں آدمیوں نے آقا کے بازو چھوڑ دیے۔ آقا کی ہچکچاہٹ ظاہر تھی مگر اب کرنل صاحب ان کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ رہے تھے۔ پھر وہ نرمی سے بولے: "آپ کو ٹھنڈ لگ جائے گی۔"

آقا گاڑی میں بیٹھ گئے۔ حاجی علی نے ان کی عبا لا کر ان کے کندھوں پر ڈال دی اور شب کلاہ سر پر رکھ دی۔ کرنل صاحب نے گاڑی اسٹارٹ کی اور ہیٹر جلا دیا۔ دونوں مسلح آدمی ایک دوسرے سے بات کرتے ہوئے گاڑی کے قریب آئے اور پوچھنے لگے: "آپ نے اپنا نام کیا بتایا تھا؟"

کرنل آریانی فر۔

کرنل صاحب نے ایکسیلیٹر پر پیر رکھا اور گاڑی برف میں دھنستی ہوئی چلنے لگی۔ آقا سے بولے: "کچھ چل کر گرم ہو جائیں گے۔ خانم آپ کی مرید ہیں۔" وہ بہت خوش تھے۔ ہنستے ہوئے کہنے لگے: "معاف کیجیے گا، آپ کو سلام پیش کرتا ہوں۔"

آقا نے کہا: "السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔"

○○

(فارسی عنوان: "کید الخائنین")

ابراہیم گلستان

فارسی سے ترجمہ: اجمل کمال

عصمت کا سفر

جس وقت وہ صحن تک پہنچی تو لرز رہی تھی۔ وہ سفر پر نکلنے کے وقت ہی سے کانپ رہی تھی؛ اُس بد نصیب رات ہی سے اس پر لرزہ طاری تھا جب کانپ بھی زیادہ تھے اور وہ تھکی ہوئی بھی تھی اور کم زوری محسوس کر رہی تھی، برداشت کی حد پر تھی اور بے حال تھی، اور بعد میں جھگڑا ہوا تھا اور اسے تپھڑ کھانے پڑے تھے، اور آخر کار گھٹی ہوئی سسکیوں اور سخت سرد درد کے درمیان اس کے ذہن میں فرار اور توبہ کا خیال آیا تھا۔ راستے بھر بھی وہ، زیارت کے جوش اور شوق میں، لرزتی آئی تھی؛ اس انتظار میں دم سادھے رہی تھی کہ آخر کار وہاں پہنچ جائے گی، اور اب بھی، وہاں پہنچ کر بھی، صحن میں کھڑی کھڑی لرز رہی تھی۔ وہ بے تاب اور جرأت سے محروم تھی، اور بارگاہ پر ہیبت تھی، اور شفاعت کرنے والی وہ پاکیزہ روشنی حرم کے قلب میں واقع تاریک حجرے میں جھلملا رہی تھی۔ وہ بے تابی میں کسی سے یہ دریافت کرنا بھول گئی تھی کہ توبہ کرنے کے آداب کیا ہوتے ہیں۔ وہ زینہ چڑھ کر اوپر پہنچی اور بے اختیار حرم کے آستانے میں گر پڑی اور رونے لگی۔

جب اس نے سر اُٹھایا، اس کی آنکھیں حرم کے اندر کی روشنی سے مانوس ہو چکی تھیں؛ اسے ہر شے دُھلی ہوئی، پاک صاف معلوم ہو رہی تھی، اور اسے لگتا تھا کہ وہاں اس کے سوا کوئی نہیں ہے۔ بلند رواق کے نیچے سے آتے جاتے لوگوں کا ہنبوہ اس کی تنہائی میں خلل ڈالنے سے قاصر تھا۔ یوں تھا جیسے کبھی کوئی شخص آستانے میں داخل نہ ہوا ہو، جیسے کسی کی نگاہ نے کبھی حرم کی جھلک تک نہ پائی ہو، اور فرش پر کسی کا سایہ تک نہ پڑا ہو، ہر نفس سے پاک، کنواری رہی ہو۔ اور اب وہ وہاں پہنچ گئی تھی، اور وہاں اس کے سوا کوئی نہ تھا؛ وہ تھی اور وجود سے، ان متبرک جالیوں سے،

اس کا ایک بے فصل رشتہ قائم تھا، اور وہ دوری تھی۔

اس خود سپردگی کے عالم میں اب سے پہلے کی زندگی کے تمام برس بے حقیقت ہو گئے تھے، جیسے وہ کسی اور کی زندگی رہی ہو۔ وہ دنیا کے وقت کی ابتدا پر واپس پہنچ گئی تھی۔ اب، اس حال پر پہنچ کر، وہ چاہ رہی تھی کہ کسی نے اس سے محبت نہیں کی، اور نہ اس نے کسی سے محبت کی، اور نہ کبھی وہ زندہ رہی۔ اس نے انگلیاں جالیوں کی درز سے گزار دیں اور سخت، چمکیلی سلاخوں کو مٹھی میں بھینچ لیا۔ پاک کو چھونے کی تمنا میں انگلیاں کھڑکی کے پیچھے کی سطح پر پھیریں اور پھر ان سے اپنی آنکھیں ملنے لگی۔ ہونٹ جالیوں پر رکھ دیے اور چومتے چومتے اس حرص میں انھیں چاٹنے لگی کہ جو کچھ پاکیزہ اور متبرک ہے اس کے وجود میں اتر جائے۔

بس، تمھاری زیارت قبول ہوا!'

وہ مڑی تو اسے ایک دراز قد اور خوب رو سید دکھائی دیا جس کی بھنویں گھنی اور بھری بھری اور رخسار سرخ تھے، ریش سیاہ اور آنکھیں مخملیں تھیں، اور جو اسے وقار اور ہمدردی سے دیکھ رہا تھا۔

سید دوبارہ بولا: "یہ تمھارے آنسو نہیں مروارید ہیں۔"

عورت نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ پھیرا، گالوں پر سے آنسو پونچھے، اور مجذوب اور مبہوت ہو کر سید کو سلام کیا۔

سید نے زیر لب دعا پڑھتے ہوئے نظر اپنے ہاتھ کی پشت پر، اور اپنی انگشتری میں جڑے ہوئے عقیق پر جما دی اور آہستہ سے کہا: "تمھارا سر کھل گیا ہے بہن!" اس نے اتنی دیر توقف کیا کہ عورت چادر سے سر ڈھک لے۔ پھر بولا: "آؤ تمھارا ثواب پورا کر دوں۔ صاحبِ آبرو کی شان میں، تمھارے دل سے نکلے ہوئے آنسوؤں کی شان میں ایک زیارت پڑھ دوں۔" اور پرسکون، نرم اور ہموار آواز میں زیارت پڑھنے لگا۔

جس لمحے سے اس نے درگاہ کے صحن میں قدم رکھا تھا، دنیا اس کے لیے دھندلا گئی تھی۔ نہ ماضی کا کوئی نام، نہ کسی صورت کا نقش، نہ کوئی یاد اس کے ذہن میں باقی رہی تھی اور نہ آئندہ کی کوئی فکر۔ بس روحانی پانے کا ایک جذبہ تھا، اس کے سوا کچھ نہیں۔ سید کی آواز کے سائے میں دنیا دوبارہ وجود میں آئی، اور یہ دنیا پچھلی دنیا کی یادوں کی بالکل نئی تھی۔ گھر پر گزاری ہوئی راتیں جاتی رہیں، جیسے کہ کھو سی ہو گئیں، اور اس کے درد کی انتہا پر ابھر آنے والا خون کا وہ خوفناک لوتھڑا غائب ہو گیا۔ بے ہوشی اور متلی رخصت ہو گئی۔ وہ مرد جس کا سانس پھول جاتا تھا؛ وہ مرد جس کا جسم وزنی تھا؛ وہ مرد جس سے سخت بو آتی تھی؛ وہ مرد جس کی مردانگی اس کے پھولے ہوئے سخت پیٹ کے نیچے یوں لٹکتی تھی جیسے خزاں کا آخری پتا کسی کھوکھلے تنے والے درخت سے لٹکا ہوا ہو، اور وہ لذت کی آرزو میں ہانپتا تھا اور اپنی مردانگی عورت تک پہنچانے سے رہ جاتا تھا؛ وہ مرد جس کے

Scanned with CamScanner

کندھوں کے بیچ میں خنجر کا پھل گڑا ہوا تھا جو ٹھوکر سے دروازہ کھول کر اندر گھس آیا تھا اور آتے ہی زور سے چیخا تھا: 'عصمت!' اور جب اُس کے اوپر لیٹا ہوا مرد خوف زدہ اور بدحواس ہو کر بھاگ کھڑا ہوا تو آنے والا، خون میں لت پت، اس پر آ پڑا تھا اور اپنے خون آلود ہاتھ اس کے چہرے پر پھیرنے لگا تھا اور اپنے ہونٹ اس کی گردن پر رکھتے رکھتے اس کے پستانوں تک پہنچ گیا تھا، کراہ رہا تھا، اور وہ گنگ رہ گئی تھی؛ اور تب اُس نے دیکھا تھا کہ خنجر دستے تک اس کی پیٹھ میں گڑا ہوا ہے اور اس زخم سے خون بہہ بہہ کر اس کے پستانوں پر ٹپک رہا ہے، اور وہ گم سم پڑی رہی تھی، اور پھر اس مرد نے دم توڑ دیا تھا۔ اور لاش کے نیچے گنگ پڑے پڑے اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔

عصمت۔ عصمت۔ عصمت

اس پر رونے کا دورہ پڑ گیا۔ زیارت پڑھنے والے کے ورد سے گلاب کی خوشبو آ رہی تھی اور عورت کے رخسار گرم ہونے لگے تھے۔ وہ ضریح اور سید کے بیچ میں کھڑی تھی۔ اس نے آنکھیں موند لیں اور دل میں کہا: 'اے امام، مجھے بخش دیجیے!'

ضریح کی جالیوں کے پیچھے مرقد تھا۔ سید دعا پڑھتے پڑھتے بولا: 'خدا تمہارے گریے کا صلہ دے۔ آمین بحق حضرتِ حق، بحقِ حرمتِ آستانِ مطہر۔'

وہ بولی: 'یا خدا!' اپنی اوڑھنی سے آنسو پونچھے اور سلاخوں کو چوما۔

سید نے پوچھا: 'آستان بوسی کے آداب جانتی ہو؟'

وہ 'ہوں؟' کہہ کر پیچھے مڑی۔ سید کی آنکھیں مخملیں، مہربان اور باوقار تھیں۔ گنبد عجز و التماس کی آوازوں سے گونج رہا تھا اور لوگ خوف اور رقت اور امید کے ساتھ حرم کے گرد طواف کر رہے تھے۔

سید نے مضبوط مگر نرم لہجے میں کہا: 'ہر کام کا ایک قاعدہ ہوتا ہے۔ تمہیں زیارت کے مخصوص آداب سے واقف ہونا چاہیے۔ یہ بارگاہ عزیز ہے۔ اس کے آداب جانتی ہو؟'

وہ بولی: 'نہیں'، اور یہ سوچ کر ڈر گئی کہ کہیں اس سے کوئی غلطیاں سرزد نہ ہو گئی ہوں۔

'تو جاننا چاہیے۔' پوچھا 'کیوں نہیں؟'

اس نے بے بس ہو کر کہا: 'میں۔۔۔ آج ہی آئی ہوں۔ پہلی بار زیارت کو نکلی ہوں۔'

'خدا قبول کرے۔ کہاں کی ہو؟'

'میں۔۔۔ بدبخت۔۔۔ کہیں کی بھی نہیں ہوں۔'

'نہیں، ایسا نہ کہو۔ تم باسعادت ہو۔ یہ آنسو بتا رہے ہیں کہ تمہارا دل پاک ہے۔ نذر دی؟'

'نہیں۔'

'ارے! اچھا، تو نذر گزارو۔ اپنے لیے، اپنے بچوں کے لیے۔ صدقہ دو۔'

'بچے میرے کہاں ہیں؟ میرا کوئی نہیں ہے۔ اکیلی ہوں۔'

Scanned with CamScanner

"اکیلی ہو؟ تو آئی کس کے ساتھ ہو؟"

"اکیلی۔"

"اکیلی تو خدا کی ذات ہے۔ عورت اکیلے سفر نہیں کرتی۔ اور وہ بھی حضرت کی خدمت میں آنے کے لیے۔"

اس نے سر جھکا لیا۔ پھر بولی: "اکیلی ہوں۔ کیا کروں؟ اکیلی ہی ہوں۔" پھر آہستہ سے کہا: "مجھے لگا جیسے مجھے خود بلایا گیا ہو۔" وہ پُرسکون تھی اور جانتی تھی کہ اب پناہ میں آ گئی ہے۔ گلاب کی خوشبو آ رہی تھی۔

سید مہربانی سے بولا: "خوش نصیب ہو کہ حضرت نے تمہیں طلب کیا۔"

پاس ہی ایک عورت مرقد کی طرف پشت کیے کھڑی پھٹی پھٹی آنکھوں سے گنبد کو گھور رہی تھی۔ سید نے آہستہ سے کہا: "اب تمہیں طواف کرنا چاہیے۔" اس نے عصمت کو ٹھوکا دیا اور دعا پڑھتا ہوا ساتھ چلنے لگا۔ وہ چلتے چلتے جالی کی سلاخوں کو ہاتھ میں پکڑتی اور چھوڑتی جا رہی تھی، اس کا منہ مرقد کی طرف تھا اور وہ ضریح کے گرد چکر کاٹتے ہوئے ہجوم کے درمیان سے نکلتی چلی جا رہی تھی؛ اسے سید کے دعائیں پڑھنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ سید اس سے ایک قدم پیچھے چلتے ہوئے، دعاؤں کے درمیان آہستہ سے بولا: "تم حضرت کی قرض دار ہو۔ ادا کرو۔ تلافی کرو۔"

اس نے ضریح کے کونے پر مڑتے ہوئے پوچھا: "کیسے کروں؟ میں اس قابل نہیں۔"

"حضرت کے سائے میں رہ جاؤ۔ یہاں کی خدمت تمہارا ہے۔"

"مجھے کیا کرنا ہو گا؟"

"تمہیں آداب میں خود سکھا دوں گا حضرت کے زیرِ سایہ۔ یہاں زائر آتے ہیں۔ کچھ دن، ایک دن یا دو دن، ٹھہرتے ہیں ---" وہ ضریح کے اگلے کونے پر مڑے۔ "--- انہیں ضرورت پڑتی ہے۔ دیکھ بھال کے لیے کسی کو چاہتے ہیں۔ تمہیں کچھ پیسے بھی مل جایا کریں گے، گزارے کے لیے کافی ہوں گے۔ دل گھبرائے تو حرم میں بھی آیا کرنا۔ کام بھی مل جائے گا، زیارت کا ثواب بھی۔"

ضریح کا اگلا کونا گزرا۔ اس نے پوچھا: "کیا کرنا ہو گا؟"

"میرے ساتھ رہ جاؤ۔ میرا گھر، فقیر کی کٹیا، پیچھے ہی ہے۔ حضرت کے زیرِ سایہ۔ دو ایک دن جنہیں ٹھہرنا ہوتا ہے۔ وہاں زوار آتے ہیں۔ زوار، طلبا، اور دوسرے مومنین۔ انہیں ضرورت پڑتی ہے۔"

ضریح کا اگلا کونا آیا اور طواف کا دائرہ پورا ہو گیا۔ سید بولا: "شرعی مدت ہے، فکر کی بات نہیں --- میں محرم ہوں گا۔" اور رک گیا۔

وہ بھی رک گئی۔ ان مسکراتی آنکھوں کی نرمی اور مہربانی میں اسے مستجاب دعاؤں کا نور دکھائی

Scanned with CamScanner

دیا۔ اسے محسوس ہوا کہ دربدری ختم ہوئی اور گھر مل گیا۔ سید پُریقین اور شفیق لہجے میں کہہ رہا تھا: میں خود سب ٹھیک کرلوں گا۔'

پاس ہی ایک عورت صحن کی جالیوں کے پاس کھڑی سسکیاں لے رہی تھی۔

دونوں باہر نکل کر صحن تک پہنچے تو ظہر کا وقت ہو گیا تھا اور کبوتروں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ کے درمیان موذن کی صاف اور بلند آواز سنائی دے رہی تھی: حیّ علی الفلاح۔'

○○

(فارسی عنوان: "سفرِ عصمت")

نادر ابراہیمی

فارسی سے ترجمہ: اجمل کمال

مقدس یادگار

میرا حال ٹھیک نہیں تھا، مگر حوصلہ ہاتھ سے نہیں دیا تھا۔ اگرچہ باہر تیز ہوا چل رہی تھی اور اوائل بہار کی سہ پہر کی بے کیفی طاری تھی، میں کتاب پڑھ رہا تھا اور تیز ہوا اور موسم کی بے کیفی سے آزردہ یا اداس نہیں تھا۔ اتنے میں میری بیوی نے میرے کمرے کا دروازہ کھولا، اندر آئی اور پوچھنے لگی کہ مجھ میں بات کرنے کی طاقت ہے یا نہیں۔ میں نے کہا: کیوں نہ ہوتی؟ وہ جھجکی اور میری مسہری کے پاس رکھی ہوئی چھوٹی چوکی پر بیٹھ گئی۔ پھر اس نے لمبا سانس لیا۔

میں نے پوچھا: "طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

بولی: "ہاں، ٹھیک ہوں۔"

میں نے کہا: "تھک تو نہیں گئیں؟"

بولی: "نہیں نہیں۔۔۔ ٹھیک ہوں۔ بس دیکھنا چاہتی تھی۔۔۔ کہ عید، عید کے لیے۔۔۔"

میں نے پوچھا: "تو کیا کیا جائے؟"

اس نے جواب دیا: "یہی کہ۔۔۔ آخر۔۔۔ تمھیں تو پتا ہی ہے۔۔۔ صرف پانچ دن رہ گئے ہیں۔"

مجھے تھوڑا سا تعجب ہوا کہ عید میں صرف پانچ دن رہ گئے ہیں۔ مجھے یاد آیا کہ پہلے میں کس طرح اس کے نزدیک آ جانے کو، اس کی خوشبو اور ذائقے کو، اس کے مختلف اور روشن رنگوں کو محسوس کر لیا کرتا تھا۔ پھر مجھے یاد آیا کہ اس کے آنے سے کیسے چیزوں میں چمک اور تازگی آ جایا کرتی تھی: جوتے، کورٹ کی پتلون، لامی کا فاؤنٹین پین، بریف کیس، پستے اور نارنگیاں، سب میں

Scanned with CamScanner

کیسی جان سی پڑجاتی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ عید کی آواز کیسی شیریں اور پُروقار ہوتی تھی۔ یاد سی آئی اور گزر گئی۔ اب کوئی منظر عید کا سا نہیں تھا۔

میں نے پوچھا: 'کیا چاہتی ہو، میں کیا کروں؟'

"بات نہیں کرنا چاہتے ہو؟"

"کرنا چاہتا ہوں۔ کچھ تو کیا کرنا چاہتا ہوں۔"

"پھر خود ہی کہو۔ بتاؤ کیا کرنا چاہتے ہو۔"

درد کی ایک ٹیس میرے بائیں پیر سے، ٹنی اور سینے کی بائیں طرف تک پھیل گئی۔ میرا ہاتھ اپنے آپ سینے کی طرف چلا گیا اور اسے دبانے لگا۔

میری بیوی بولی: "پھر درد ہو رہا ہے؟"

"کوئی خاص بات نہیں۔ میرے سامنے درد کا اتنا ذکر مت کیا کرو کہ مجھے لت پڑ جائے۔ عید کی بات ہو رہی تھی۔ تم جانتی ہو عید کے ہفتے میں جو لوگ آتے ہیں میں اُن سے ملنا برداشت نہیں کر سکتا۔ کسی برداشت نہیں کر سکتا۔ میں اُن کے گروہ کا حصہ نہیں ہوں۔ کیا میں نے تمھیں پہلے نہیں بتایا، مہری؟"

"بتایا ہے۔ لیکن اگر تمھیں یاد ہو تو پچھلے تین سال سے ہم گرگاں چلے جاتے تھے۔ ہر دفعہ۔ ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں، میرا خیال ہے ٹھیک ہی ہے۔"

"اور اس سال وہ یقیناً آئیں گے اور گھر کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے۔ اب یا تو گھر پر نہ رہو، یا پھر دروازہ کھولو۔"

مجھے ہنسی آ گئی، درد کی لہر اٹھی، مگر میں نے ہاتھ کو دور رکھا۔ بیوی چونکنا ہو کر بولی: "درد ہو رہا ہے۔" اور میں پھر ہنسنے لگا۔ وہ چوکی پر سے اٹھ کھڑی ہوئی اور میرے کندھے پکڑ کر پوچھنے لگی: "کیوں ہنس رہے ہو؟" میں نے بتایا کہ اس کا اصول، یعنی "یا گھر پر نہ رہو یا دروازہ کھولو" کس قدر عذاب ناک ہے، اس میں انسانیت کی ذرا سی رمق بھی نہیں ہے۔ اس نے میری بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا: "بہرحال، کیا کیا جائے۔ ایسی ہی ہے زندگی۔ ہم کیا کر سکتے ہیں؟" وہ دوبارہ اسی جگہ پر آ بیٹھی اور میں نے کہا: 'ٹھیک ہے، میں گھر پر رہوں گا۔ مگر کسی ایسے شخص کے لیے دروازہ نہیں کھولوں گا جو مجھے پسند نہ ہو یا جس سے میں واقف نہ ہوں۔'

بولی: "ایسا نہیں ہو سکتا۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟" میں نے اس کی طرف پیٹھ کر کے کروٹ لے لی اور آہستہ سے کہا: "ایسا ہی ہو گا۔ تم دیکھتی ہو۔"

مجھے محسوس ہوا کہ اس کی آواز زیادہ درشت ہو گئی، اور اس میں درد کی تلخی اور تیزابیت جھلکنے لگی۔ اب اس کے لیے یہ پوچھنا بھی ممکن نہ رہا کہ درد تو نہیں ہو رہا؟

Scanned with CamScanner

یہ نہیں ہو سکتا محمود۔ نہیں ہو سکتا۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔ تمہیں سب لوگوں اور سب چیزوں کے قریب ہونا ہوگا تاکہ ان سے بات کر سکو۔ تاکہ ان کے بارے میں لکھ سکو۔ اور پھر زیادہ اونچی، زیادہ غمناک، زیادہ غصیلی آواز میں: "میں --- محمود، سن رہے ہو؟ میں نے تمہیں پوری اجازت دے رکھی ہے کہ اپنے دوستوں سے ہماری زندگی خراب کرو! کتابوں سے، خیالات سے اور درد سے۔ میں نے کبھی اعتراض نہیں کیا۔ کبھی نہیں کہا کہ مجھے بھی اس شراکت میں اپنا حصہ چاہیے۔ کبھی نہیں کہا کہ مجھے بھی زندہ رہنے کا، خوش رہنے کا، اپنے وجود کا اظہار کرنے کا حق ہے --- میں نے تو کبھی یہ تک نہیں کہا کہ تمہارا یوں چاردیواری میں بند ہو جانا، دروازہ بند کر کے دوسری طرف کروٹ لے لینا، خود تکلیف اٹھانا اور دوسروں کو تکلیف پہنچانا، اس نے ہماری زندگی کو کس قدر اکتا دینے والا، تھکا دینے والا بنا دیا ہے۔ کیسی یکسانیت، یک جہت، یکسانیت --- مگر تم ---"

"میں کیا؟"

میں نے اپنا چہرہ تھوڑا سا اس کی طرف پھیر رکھا تھا اور ہاتھ بڑھا رکھا تھا: اس کا ہاتھ تھم کے سے اشارے میں میری طرف اٹھا ہوا تھا اور دونوں کے ہاتھوں کے درمیان خالی جگہ دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے کوئی پل ہو جس پر ہوا بازوں نے نشانہ باندھ کر ٹھیک بیچ میں سے گرا دیا ہو۔

ہاں؟ میں کیا؟

تم --- محمود، تمہیں لوٹنا ہوگا۔'

کہاں لوٹنا ہوگا؟ ان لوگوں کی طرف جن کے پاس انسانیت کی جگہ فوکس ویگن ہیں؟ ان کی طرف جو ---

نہیں --- نہیں --- میرا مطلب ہے تمہیں میری طرف لوٹنا ہوگا تاکہ ہم بات کر سکیں۔ اٹھ کر بیٹھو، میری بات سنو اور مجھے بتاؤ کہ آخر باہر جانے میں اور اس جگہ کو ٹھیک ٹھاک کرنے میں کیا حرج ہے۔ سب چیزیں اتنی پرانی ہو گئی ہیں محمود۔ اس مکان کی آرائش اب تبدیل ہونی چاہیے۔ پردے، فرنیچر اور دیواروں کا رنگ۔ انہیں سے تمہاری آنکھوں کو اذیت پہنچتی ہے اور تمہیں تھکن ہوتی ہے۔

محبوبی! شاید تم مجھ سے صاف صاف سننا چاہتی ہو کہ میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ یہی سننا چاہتی ہو نا؟ تم چاہتی ہو میں تم سے ان چیزوں کی باتیں کروں جن کی باتیں لوگ بازار اور چوک میں کرتے ہیں؟

نہیں۔ نہیں۔ نہیں چاہتی کہ تم یہ باتیں کرو۔ میں چاہتی ہوں کہ تم تھپڑ مار مار کے، تھپڑ مار مار کے اپنا منہ سرخ کر لو مگر ایسی باتیں نہ کرو"

ناز کا درد اٹھا اور میرے منہ سے ایسی آواز نکلی جیسی اکھاڑے میں زور کرتے ہوئے

Scanned with CamScanner

پہلوانوں کے منہ سے شدید چوٹ لگنے پر نکلتی ہے۔

مہری! تم مجھ سے جو کچھ چاہتی ہو، جو بہت سی عورتیں اپنے شوہروں سے چاہتی ہیں، وہ میرے بس میں نہیں ہے۔ میرا ہاتھ--- مہری، دیکھ رہی ہو؟ یہ ہاتھ اپنے منہ پر تھپڑ مارنے کے لیے نہیں بنا ہے۔ جو لوگ تھپڑوں سے اپنا، اور اپنے بچوں اور بیویوں کا منہ لال رکھتے ہیں انھیں تھپڑ مارنے اور تھپڑ کھانے کا جنون ہوتا ہے۔ نہیں، اگر کوئی تھپڑ مارتا ہے تو کھا لیتے ہیں، ورنہ مارے تو اسے مار ڈالتے ہیں، اور اگر کوئی موجود ہو تو خود کو تھپڑ مارتے ہیں؛ مگر میرے لیے کوئی وجہ نہیں ہے کہ میں ایسی بے رنگ زندگی میں رنگ بھرنے کے لیے اپنا ہاتھ اٹھاؤں۔ اور تھپڑوں سے تو عید کے پُرخور مہمانوں کے لیے شیرینی تیار نہیں کی جا سکتی۔ سمجھتی ہو، مہری؟ تم جیسا آدمی چاہتی ہو وہ میں نہیں ہوں، نہ کبھی تھا اور نہ کبھی ہو سکتا ہوں۔ کبھی نہیں---

درد کا پردہ کھنچ جانے سے پہلے میں نے بیوی کو اپنی طرف آ کر یہ کہتے ہوئے سنا:

"محمود--- محمود--- پریشان مت ہو محمود---"

o o o

جب میں نے مہمان خانے کا دروازہ کھولا تو مٹھائیوں کے روغن کی بُو میرے دماغ کو چڑھ گئی۔ تو آخر یہ ہو ہی گیا۔

پردوں کے پھیکے اور اُڑے ہوئے رنگوں کو دیکھ کر میرا دل بیٹھنے سا لگا۔ میں دروازہ بند کر کے اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔ درد زے کی گھنٹی بجی اور مجھے مہری کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا اور فرش پر لیٹ گیا۔ یہ میرے سابق دوست تھے جن کے ساتھ میں کان میں کام کیا کرتا تھا؛ اب وہ سال میں ایک بار مجھ سے ملنے آتے تھے۔

"اندر آ جائیے۔ وہ ضرور آئیں گے۔ آپ کے آنے پر بہت خوش ہوتے ہیں۔ طبیعت ذرا ناساز ہے، کہہ رہے تھے ڈاکٹر کے پاس جا رہا ہوں"

مجھے اپنے دوستوں کے قدموں کی چاپ اور ہنسنے کی آواز سنائی دی۔ مجھے لگا کہ وہ عید کی مبارکباد دے رہے ہیں، پھر مہمان خانے کے دروازے کی آواز آئی۔ میں کسی چور کی طرح جو گھر کے لوگوں کی آواز پر کان لگائے ہوئے ہو، ان کی باتیں سننے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ابھی تک بیمار ہے، کیوں؟"

ہاں۔ حالت ٹھیک نہیں ہے۔'

کیا بیماری ہے؟'

کسی کو حصر نہیں۔ کہتے ہیں غشی کے دورے پڑتے ہیں۔

"یہاں سے کہاں چلیں گے؟

لسٹ کے حساب سے پہلے ڈاکٹر شکستہ کے ہاں، پھر مختار زادہ کے ہاں، اس کے بعد---

'اگر وہ دونوں گھر پر رہے ہوں تو ہم مرے ہی رہیں۔'

"اچھا تو بچو! سب حاضر؟"

"حاضر!"

'میں اِدھر اُدھر دیکھتا چلتا ہوں۔ اگر دشمنوں کا سر یا گردن نظر آئی تو خبردار کر دوں گا۔ حملے کے لیے تیار ہو جاؤ!'

وہ ذرا بھی نہیں بدلے تھے۔ ان میں اب بھی حملہ کرنے کی ہمت تھی۔ اب بھی وہ مورچے بنا کر نگرانی کر رہے تھے۔ نہیں، ان میں ذرا سی فرق نہیں آیا تھا۔

ان کے جانے کے بعد میری بیوی نے میرے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے دروازہ کھولا اور دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں پستوں کی خالی رکابی ہے۔ ہنستے ہوئے اور زخمی کر دینے والے لہجے میں وہ بولی: 'بچوں نے شرارت کر ڈالی۔ سارے پستے لے گئے۔'

میں نے کہا: 'میں جانتا تھا۔ وہ ذرا سی نہیں بدلے۔'

"تم ابھی تک پریشان ہو۔"

'تھوڑا سا۔ بس تھوڑا سا۔'

'کوئی ایسا نہیں ہے جس سے جا کر مل آؤ اور کچھ باتیں واتیں کر لو؟ میرا خیال ہے اس سے طبیعت بہت بہتر ہو جائے گی۔"

میں نے جواب دیا: 'درست کہتی ہو۔ سعدی کے پاس جاتا ہوں۔ کہیں اس کی بیوی نے اسے خراب نہ کر دیا ہو۔'

مجھے ان راتوں کی یاد آئی جب میں اس کے ساتھ رات رات بھر سڑکوں پر آوارہ گردی کیا کرتا تھا۔ مجھے چوکیداروں کی یاد آئی اور ان کی مشکوک نظروں کی کہ کس طرح رات کو پیچھا کرتی تھیں۔ اور ہم کس قدر ڈرتے تھے اور پھر کس طرح، ڈرنے کے درمیان ہی، کیا کیا کام کر جاتے تھے۔ مجھے یاد آیا کہ کس طرح ہم اپنے ناخنوں اور دانتوں کی مدد سے رات کی اونچی دیوار کو سر کر لیا جاتے تھے۔ اس کے بیوی کے چنگل میں جا پھنسنے کے بعد بھی ہم کس قدر باتیں کیا کرتے تھے اور ایسی پاکیزہ خیالوں میں مست رہنے کی عادت کا اظہار کر سکتے تھے۔

میں سارے راستے ان برسوں کے بارے میں سوچتا رہا: شکست خوردہ برسوں، ذلیل اور متروک برسوں کے بارے میں۔

○ ○ ○

اس کی بیوی نے میرے لیے دروازہ کھولا۔

میں نے کہا: 'مجھے پہچانتی ہو؟'

بولی: 'کیسے ممکن ہے کہ نہ پہچانوں؟'

Scanned with CamScanner

میں نے کہا: "تو پھر، تمھیں عید مبارک ہو۔ ایسی سینکڑوں عیدیں دیکھو۔ مہدی ہے؟"

بولی: "نہیں، مگر آنے والا ہے۔ بس آ ہی رہا ہوگا۔ تمھیں دیکھ کر بہت خوش ہوگا۔"

میں نے جواب میں کچھ کہا اور اس کے پیچھے پیچھے مہمان خانے میں آ گیا۔ ابھی بیٹھا ہی تھا کہ ایک چھوٹی سی بچی بنے آ کر عید مبارک کہا۔ عورت اُس سے کہنے لگی: "تمھارے چچا ہیں۔ پہچانتی نہیں ہو؟"

ننھی بچی نے مجھے غور سے دیکھا اور پھر آہستہ سے میرے کان میں بولی: "چچا جان، مجھے عیدی نہیں دیں گے؟"

میں نے پوچھا: "کیا؟"

بولی: "عیدی۔"

"تم مہدی کی بیٹی ہو؟"

"جی، میں پاپا مہدی اور ماما فریدہ کی بیٹی ہوں۔"

"تم تو بہت اچھی بیٹی ہو، مگر یاد رکھو آئندہ کسی سے عیدی مت مانگنا۔ یہ بُری بات ہے کہ آدمی لوگوں سے کہے: مجھے عیدی دیجیے۔ بہت بُری بات ہے۔"

اس نے اپنا ننھا سا بٹوا کھولا اور مٹھی بھر نئے نوٹ نکالے۔ بولی: "مجھے اتنی ساری عیدی ملی ہے!"

عورت چائے لے آئی۔ پھر بیٹھ کر مجھ سے اپنے شوہر کے کام کے بارے میں باتیں کرنے لگی۔ بتایا کہ وہ ایک اشتہاری کمپنی کا ڈائرکٹر ہو گیا ہے اور ٹی وی کے اشتہاروں کا انچارج ہے۔ مجھ سے پوچھنے لگی کہ کیا میں نے کبھی اسے ٹی وی پر نہیں دیکھا۔

میں بولا: "نہیں، میں ٹی وی نہیں دیکھتا۔"

بچی نے میرے کوٹ کا کنارہ پکڑ لیا تھا اور اسے کھینچتے ہوئے زیرِ لب کہہ رہی تھی: "چچا جان عیدی! چچا جان عیدی!" جب عورت کسی کام سے باہر گئی تو وہ اور بھی اصرار کرنے لگی۔ میرے کوٹ کا کنارہ — جو ہلکے بھورے رنگ کا تھا — اس نے مضبوطی سے مٹھی میں جکڑ رکھا تھا اور میں جانتا تھا کہ جب وہ اسے چھوڑے گی تو کیسا مُڑا تُڑا ہو چکا ہوگا۔

"چچا جان عیدی! چچا جان عیدی!"

وہ اس بات کو یوں دُہرا رہی تھی کہ میں سوچنے لگا کہیں میرا نام ہی "چچا جان عیدی" تو نہیں۔ میں نے نرم لہجے میں اُس سے بات شروع کی: "بیٹے تمھارا نام کیا ہے؟"

بولی: "چچا جان عیدی!"

میں نے کھینچنے کے ساتھ بات آگے بڑھائی: "میں تمھارا چچا نہیں ہوں۔ سمجھیں؟ تمھارے چچا مر گئے۔ تمھارے چچا کو کینسر ہو گیا تھا۔ انھیں قبرستان لے گئے، دفن کر دیا۔ تمھارے چچا بھی

تمہاری ران بھر چیز، جونک، کھٹمل تھے۔ انہیں لے گئے، ان کا سر کاٹ دیا۔ تمہارے چچا کو لے گئے۔ تمہارے چچا کو، تمہارے چچا کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اس طرح، ٹکڑے، ٹکڑے، ٹکڑے...

دروازہ کھلا اور وہ عورت --- میرے دوست کی بیوی --- واپس آ گئی۔ میں نے دیکھا وہ ایک مٹھی پھیلائے دوسرا ہاتھ بچی کے سر پر یوں مار رہی تھی جیسے اسے ٹکڑے ٹکڑے کر رہی ہو۔ میں ہنسنے لگا اور بولا: ہاں، یہیں تک پہنچے تھے کہ کاٹتے کاٹتے وہ پہاڑ تک پہنچ گئے۔ کاٹتے گئے، کاٹتے گئے، یہاں تک کہ انہیں دو آخوند دکھائی دیے۔

بچی نے اپنی ماں کو بتایا: یہ مجھ سے بہت بری بری باتیں کر رہے تھے۔ کہہ رہے تھے میں تمہارا چچا بالکل نہیں ہوں۔'

عورت نے میری طرف نہیں دیکھا، مگر بچی سے بولی: کیوں نہیں، محمود آقا تمہارے چچا ہی تو ہیں۔ بلکہ چچا سے بھی زیادہ۔'

دیکھا آپ نے جھوٹ بولا تھا۔ دیکھا میرے چچا جان کو دفن کرنے نہیں لے گئے۔ جھوٹے، جھوٹے!"

عورت بولی: نسرین، چچا جان کو تنگ مت کرو۔ مگر اس کی آواز میں صبر نہیں تھا۔ میں نے بچی کی مٹھی کھولی تو دیکھا میرے نوٹ کا کنارہ بالکل غائب ہو چکا تھا۔ میں نے کوشش کی کہ عورت کی نظر اس پر پڑ جائے مگر وہ میری طرف دیکھ رہی تھی اور لگتا تھا کہ اپنے آپ میں بہت خوش ہے۔ ایک لمحے کو میرا دل بچی، بیوی کے لیے مسلا، پھر زور سے متلی ہوئی اور طبیعت مالش کرنے لگی۔ میں نے قالین پر نظر ڈالی: وہ مشین کا بنا ہوا اور بادامی تھا۔ فقط اس کے کنارے پر کسی رنگ کا حاشیہ تھا۔ طبیعت اور خراب ہونے لگی۔ میں نے پوچھا: غسل خانہ کدھر ہے؟

نسرین، جاؤ چچا جان کو غسل خانہ بتاؤ!"

میں غسل خانے میں چلا گیا اور حلق میں انگلی ڈال کر قے کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھے یاد آیا کہ میں نے صبح بھی کچھ نہیں کھایا تھا۔ بچی بھی میرے پیچھے پیچھے چلی آئی اور کہنے لگی: چچا جان، آپ مجھے عیدی نہیں دیں گے تو میں ماما کو بتا دوں گی کہ آپ کہہ رہے تھے میرے چچا کو لے جا کے دفن کر دیا۔ میں نے کچھ جواب نہیں دیا اور حلق میں انگلی ڈال کر جھک گیا۔ میں نے خود کو جیسے شہتوت اور شہد لگے سوہان اور وہ میز یاد دلانے کی کوشش کی جس پر روغنوں کی تیز خوشبوؤں سے بھری رکابیاں رکھی ہوئی تھیں۔ میرا پیٹ خالی تھا اور اس کوشش سے کچھ فائدہ نہ ہوا۔ میں دیوار پکڑ کر چلتا ہوا باہر آیا ہی تھا کہ اچانک گھنٹی بجی، اور مجھے لگا کہ عورت اپنے شوہر کے گھنٹی بجانے کو پہچانتی ہے، کیوں کہ اس نے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ مجھے یہ تک خیال آیا جیسے اس نے اپنے شوہر کی پناہ لے لی ہے --- وہ مجھ سے ڈر رہی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ مجھ سے ڈر رہی ہے، کیوں کہ وہ اپنے

Scanned with CamScanner

شوہر کے پیچھے جا کھڑی ہوئی اور بولی: "محمود آقا کتنی دیر سے تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں۔"

میں نے کان میں کام کرنے والے اپنے سابق ساتھی کی طرف دیکھا۔ اس کے کوٹ کی اوپر والی جیب سے ایک پھول دار رومال جھانک رہا تھا اور ٹائی پر لگی ہوئی سنہری پن چمک رہی تھی۔ اس کی بیوی کی بات درست تھی۔ سابق محنت کش کا چہرہ انھیں کا سا تھا جو سنیماؤں میں کاغذی رومال، قمیصیں اور گلوبند چمکاتے پھرتے ہیں۔ میں نے سلام کیا یا نہیں، میں نہیں جانتا؛ مگر ہم دونوں نے ہاتھ ضرور ملایا اور پھر کمرے میں جا بیٹھے۔ عورت بھی آ کر بیٹھ گئی اور بچی میرے پاس کھڑی ہو گئی۔ میرے دوست نے پوچھا: "کیا حال ہے؟"

میں نے کہا: "ٹھیک نہیں ہوں۔"

اس نے دوبارہ پوچھا: "کیا حال ہے؟"

میں نے کہا: "ٹھیک نہیں ہوں۔ بالکل ٹھیک نہیں ہوں۔"

میرے دوست نے مجھے فرنگی سگریٹ پیش کیا۔ میں نے انکار کر دیا اور اس نے خود سلگا لیا۔ ایک کش لے کر بولا: "واقعی، کیا حال ہے؟"

میں اٹھ کھڑا ہوا۔

عورت نے شوہر سے پوچھا: "کب ملے گی؟"

اس نے جواب دیا: "پوری اوور ہالنگ ہو گی۔ تین دن اور لگیں گے۔" پھر مجھ سے، جو کھڑا ہوا تھا، وضاحت کی: "بنی فولکس ویگن دی ہے سروس کے لیے۔ تیرھویں کے واسطے۔"

میں نے کہا: "بہت اچھا کیا۔ واقعی پوری اوور ہالنگ ہونی چاہیے۔"

اس نے پوچھا: "تم نے گاڑی اب تک نہیں لی؟"

میں نے کہا: "نہیں، مجھے پسند نہیں ہے۔"

وہ ہنسا اور کچھ بولا جس میں مجھے صرف "بلی" سنائی دیا اور "گوشت"۔ عورت بھی ہنسنے لگی۔

میں نے خدا حافظ کہا اور چلنے کو ہوا تو دیکھا کہ کوٹ کا کنارہ بچی نے پکڑ رکھا ہے۔

"چچا جان عیدی، میری عیدی؟"

میرا سابق ساتھی بولا: "بہت بری عادت ہے۔ مگر ٹھیک ہے، عید بچوں ہی کی تو ہوتی ہے۔" میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک نوٹ نکالا اور اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

○ ○ ○

گھر پہنچ کر میں نے خود کو آرام کرسی پر گرا دیا اور سگریٹ سلگا لیا۔

مہری آئی اور پوچھنے لگی: "کیسے ہو؟"

میں نے کہا: "ٹھیک ہی ہوں۔"

"مہدی ملا؟ باتیں ہوئیں؟"

ہاں۔ میرا بیان پورا ہو چکا تھا۔ یہ لوگوں نے بھیک مانگنے کا کیا طریقہ نکالا ہے؟ اپنے بچوں کو سکھا دیتے ہیں کہ جو آئے اس کا دامن پکڑ لو اور جلدی مانگو، تاکہ رقم اکٹھی ہو جائے اور آسودہ کا دوست ہو گئے۔ یہ بھیک مانگنی تو ہے سڑک کے روڑے پر بھیک مانگنا۔ بس صندوق کی جگہ اپنے بچوں سے کام لیتے ہیں۔ ان معذور بچوں سے خوب پیسے بٹور لیتے ہیں۔

میری اب میری زبان سے بھی طرح واقف ہو چکی تھی۔ سمجھتی تھی، خوب سمجھتی تھی۔ میں نے کہا: مجھے فریج میں سے ٹھنڈا دودھ لا دو۔ وہ لے آئی تو میں نے سر ہلا دیا۔

بری طرح استقبال کیا ان لوگوں نے؟

نہیں، استقبال تو کیا ہی نہیں۔ وہ تو بس فوکس ویگن کی ڈرائیونگ کر رہے تھے گیا ہوا تھا۔

○ ○ ○

مہری کا سب کچھ یہی خیال تھا کہ اگر مکان کی آرائش بدل دی جائے تو میری حالت بہتر ہو جائے گی۔ یہ بات کوشش سے پڑھے جیسی تھی۔

محمود، تم تھک گئے ہو۔ تمہاری آنکھیں تھک گئی ہیں ان پردوں، کرسیوں اور آرائشوں کو دیکھ دیکھ کر۔ انہیں سب بدل دینا چاہتے ہیں۔ یہ تمہاری طبیعت کے لیے اچھا ہو گا۔

میری طبیعت کو کچھ نہیں ہوا۔ مجھے درد کا عادی مت بناؤ مہری۔ اور اس آرائش کو بھی تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے۔

میرے بیٹے نے میرا کوٹ پکڑ لیا اور کہنے لگا: بابا، بابا، آرائش! ماما کو آرائش چاہیے!

ٹٹول کر میں نے اپنے کوٹ کے کنارے کو بیٹے کی مٹھی میں دیکھ تو سر میں سے کویا تیر سا در گیا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا اور میں نے اٹھا ہاتھ کھینچ کر اس کے منہ پر مارا۔ اس کا چہرہ دستیغ ہو گیا، وہ مجھ سے الگ ہو گیا، رو پڑا اور بہن اس کے کپڑوں سے لپٹ گیا۔ پھر زور زور سے، زور زور سے، زور زور سے رونے لگا۔ میں نے ٹٹول کر کرسی کو تلاش کیا اور اس پر بیٹھ گیا۔

مجھے مہری کی آواز سنائی دی جو کہہ رہی تھی: تیز، تیز، تیز، مگر تم تو کہتے تھے کہ تم تیز رفتاری کے لیے نہیں ہے ہو؟ محمود۔۔۔ دیکھتے ہو؟ دیکھتے ہو؟ اور میں۔۔۔ نہیں دیکھ رہا تھا، نہیں دیکھ رہا تھا۔ میں نے کہا: نہیں دیکھ رہا۔ میری بیوی نے بغلوں میں ہاتھ ڈال کر مجھے کھڑا کیا اور تیز دھکوں میں سے مجھے نکال کر لے گئی۔ ان رنگوں کے درمیان سے جو جگہیں بدل رہے تھے، چکر کھا رہے تھے، کھینچے چلے جا رہے تھے جن کے درمیان کوئی سرحد نہیں تھی۔ اس نے لے جا کر مجھے لٹا دیا۔

میں نے کہا: اسے چپ کرا دو!

ہاں۔ کرا رہی ہوں، مگر بھولنا مت!

نہیں بھولوں گا۔ بس مجھے۔۔۔ مجھے تنہا چھوڑ دو۔

Scanned with CamScanner

○ ○ ○

شام کا وقت تھا اور اوائل بہار کی ہوا میرے کمرے میں گردش کر رہی تھی۔ میں کتاب نہیں پڑھ رہا تھا، ورق پلٹ رہا تھا۔ تنگ سے میرے ہونٹوں کے کونے غمگین ہو رہے تھے اور کھیر میرے کانوں کو ہچکولے دے رہا تھا۔ کسی نے میرے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے کہا:

"اندر آجاؤ۔" مہری تھی۔ بولی: "بات کرنے کی طاقت ہے؟"

میں نے کہا: "بہت ہے۔ دل بھی چاہ رہا ہے بات کرنے کو۔"

وہ آئی اور جھک کر میری مسہری کے پاس رکھی ہوئی نیچی چوکی پر بیٹھ گئی۔

"محمود مہری!"

"تمہارا جی چاہتا ہے کہ میں تمہیں کچھ یاد دلاؤں؟"

"دلاؤ!"

"تمہیں یاد ہے تم کہا کرتے تھے کہ جسے بچے پسند کرتے ہوں وہ اس سے بہتر ہے جس کا بڑے احترام کرتے ہوں؟"

"یاد ہے، مگر وہ بچی تو صرف ٹھیک مانگ رہی تھی۔ اس بات نے مجھے برہم کر دیا۔"

"میں تمہارے بیٹے کی بات کر رہی ہوں محمود۔"

"میں شرمندہ ہوں مہری، بہت شرمندہ ہوں۔ میں نے آج تک ایسا نہیں کیا تھا۔ ایک لمحے کو، فقط ایک لمحے کو مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ مجھ سے بہت زیادہ طاقتور ہے۔ ایسا لگا جیسے وہ مجھے توڑ دینا چاہتا ہے۔"

"تو ۔۔۔ تم سمجھتے ہو بوڑھے ہو گئے ہو محمود؟ اتنے بوڑھے ہو گئے ہو کہ اتنا سا بچہ تمہیں توڑ دے گا؟"

"نہیں ۔۔۔ نہیں ۔۔۔ میں ہرگز نہیں سمجھتا کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔"

"محمود! تمہیں ڈر ہے کہ تم کہیں بھی نہیں پہنچ سکے اور گر پڑے ہو؟"

"نہیں مہری، میں وہی ہوں جو پہلے تھا۔ یقین کرو!"

"خوب، تو پھر طے ہوا کہ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ ٹھیک ہے نا؟"

دھندلکے دروازے میں سے مجھے اپنے بیٹے کی سیاہ، بیمار آنکھیں دکھائی دیں جو اسے مجھی سے ملی تھیں۔ میں نے اسے نرمی سے پکارا۔ اس نے مجھ پر نظر نہیں ڈالی مگر میری طرف بڑھا اور میرے سینے میں سر چھپا لیا۔ اس کا سانس گرم اور نم تھا۔

میں نے کہا: "چلو گرگان چلتے ہیں، پھر واپس آجائیں گے۔ اس کے بعد اس مکان کے بارے میں بھی سوچیں گے۔ اس میں کوئی حرج تو نہیں؟"

میری بیوی بولی: "نہیں۔ بلکہ یہ تو بہت اچھا ہے۔"

Scanned with CamScanner

میں بے بیٹے کے بالوں کو سونگھتے سونگھتے بولا: لے اپنا مژدہ بدل لے۔

OO

(فارسی عنوان: "یادگار مقدس")

محسن دامادی

فارسی سے ترجمہ: نیر مسعود

آقائے ماضی کے عجائب خواب

پھر ایک دہشت ناک خواب آور!

آقائے ماضی چیخ مار کر اچھل پڑے۔ انھوں نے آنکھیں کھول دیں۔ اپنے کمرے کی جانی پہچانی فضا دیکھ کر طمینان کی سانس لی۔ ہمیشہ کی طرح پانی کا جگ انھوں نے سرہانے رکھ چھوڑا تھا۔ ایک دو ٹھنڈے ٹھنڈے گھونٹ بھر کر ان کے حواس کچھ ٹھکانے آئے۔ وہ اٹھے اور لڑکھڑاتے ہوئے کھڑکی تک گئے۔ صبح بہار کی سرد ہوا بڑی رطبت کے ساتھ پھیپھڑوں میں بھری۔ تڑکے کی سفیدی پھیل چکی تھی۔ کئی گہری گہری سانسوں نے انھیں کسی قدر سکون دیا۔ رات کے خوابوں سے ان کا سر گھوم رہا تھا۔ ایک سال سے زیادہ ہو گیا تھا کہ وہ وہ کچھ جھیل رہے تھے، اور یہ انھوں نے کسی کو نہیں بتایا تھا۔ لیکن اُس دن، صبح کی اُس روح پرور فضا میں، انھوں نے قسم کھا کر عہد کر لیا کہ پہلی فرصت میں کسی ماہر نفسیات سے رجوع کریں گے۔

دوسرے دن سہ پہر کو وہ ڈاکٹر آشنا کے سامنے بیٹھے تھے، اور ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بات کہاں سے شروع کریں۔ دنیا کی بہترین یونیورسٹیوں کے سند یافتہ ماہر ڈاکٹر آشنا کو جانت جانت کے مریضوں سے نپٹنے کا خوب تجربہ تھا۔ اس نے آقائے ماضی کو اطمینان دلایا کہ وہ ان کی بپتا گھنٹوں سن سکتا ہے، اور آقائے ماضی نے یوں بات شروع کی:

میری بدبختی کی شروعات اُس وقت سے ہوئی جب سے ان وحشت ناک خوابوں نے میرا پیچھا لیا اور کوڑھ کی طرح میری جان کو لگ گئے؛ ایسے خواب جنھیں دل دہلا دینے والے کابوسوں

کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ڈاکٹر صاحب، میں مٹ جا رہا ہوں۔ ایسی اذیت ناک اور قاتل موت مر رہا ہوں کہ خدا اپنے کسی بندے کو نصیب نہ کرے۔ میری روح تک روگی ہو گئی ہے، ذہن ڈھلی جا رہی ہے، اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر ہونا کیا ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ اتنے ہی بیان سے آپ کو میری تکلیف کی اصل معلوم ہو گئی ہو گی۔ پھر بھی کوشش کرتا ہوں کہ اس مرض کے اسباب کا پتا لگانے اور اس کا علاج نکالنے میں آپ کے ساتھ پورا تعاون کروں۔ میں کوئی بے علم آدمی نہیں۔ اجازت ہو تو پہلے کچھ اپنے متعلق عرض کر دوں۔

میری تعلیم کا خصوصی میدان تاریخ ہے، گو میں نے لسانیات میں بھی ڈی لٹ کیا ہے۔ ایران کی قدیم تاریخ کے سلسلے میں میرے مطالعات اور سریانی اور سعدی زبانوں پر میری تحقیقات کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہے۔ ابھی پچھلے ہفتے میں نے ٹیلی وژن پر خط میخی کے بارے میں پروگرام دیا تھا -- پتا نہیں آپ نے ملاحظہ کیا کہ نہیں -- میں نے اس میں کچھ نئے نظریات پیش کیے تھے۔ امید ہے اسے خودستائی پر محمول نہ کیا جائے گا، عرض فقط یہ کرنا تھا کہ میں کوئی عامی نہیں ہوں۔ خوابوں کے بارے میں بھی بہت کچھ علم رکھتا ہوں۔ فرائڈ کی تعبیر خواب پر حاشیہ نویسی کے منصوبے کے علاوہ خوابوں کے موضوع پر ایک مستقل کتاب کا خاکہ بھی میرے ذہن میں بننا شروع ہو گیا ہے۔ یہ بغیر علمی اصطلاحوں کے، عام فہم کتاب ہو گی۔ میں جانتا ہوں کہ خواب کبھی تو روزمرہ کے گزرے ہوئے واقعات کی بازگشت ہوتے ہیں اور کبھی انسان کے اپنے تخیل کی پیداوار۔ لیکن اگر ایک سال سے زیادہ عرصے تک، متواتر ہر رات، عجیب و غریب اور ناقابل یقین خواب آپ کے تعاقب میں آتے رہیں، وہ بھی ایک مقررہ ترتیب کے ساتھ، تو قدرتی بات ہے کہ آپ کو اپنے بارے میں طرح طرح کے گمان ہونے لگیں گے۔ آپ کا دماغ پریشان نہیں کرنا چاہتا، معاف کیجیے گا، لیکن اس خیال سے کہ آپ معاملات کو زیادہ تفصیل کے ساتھ جان لیں، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اپنے خاندان، بلکہ خاص اپنے گھرانے، کے بارے میں بھی کچھ عرض کروں۔ صرف اپنی پشتینی روایت کی طرف اشارہ کرنا چاہوں گا۔

میرے والد بزرگوار، معتمد لساعی، شاہ شہید کے قرابت دار تھے اور ایک ریاست کی حکومت ان کے حوالے تھی۔ اسی طرح میرے دادا صاحب، خواجہ پہلوان ہاشمی، آغا محمد خاں قاچار کے دربار میں بڑے عہدے پر تھے۔ شاہی خاندان کے رکن اور شاہ کے سیاسی مشیر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ اپنے وقت کے پہلوان اور کشتی کے چیمپئن بھی تھے۔ میرے اجداد پشت در پشت ایران کے درباروں میں بڑے مقام اور مرتبے کے حامل رہے ہیں۔ امن کے دنوں میں ان کی خوش انتظامی اور جنگ کے زمانے میں ان کی شجاعت اور جنگجوئی کی دھوم رہی تھی، اور معتبر تاریخی کتابوں میں ان کا تذکرہ موجود ہے۔

جہاں تک میں نے تحقیق کی ہے میرے جد اعلیٰ ہندوستان کی مہم میں نادر شاہ کے سپہ

سالار تھے اور تاریخِ ہند میں اُن کی دلاوری کا خصوصی بیان ملتا ہے۔ رزم خورد، بے کرد شمس تک اُن کی بہادری اور دلیری سے چشم پوشی نہیں کر سکے۔ میرے دقی کتب خانے میں ایک تذکرہ موجود ہے؛ اس کے مطالعے اور دوسرے مستند مآخذوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی تیس پشت پہلے میرے ایک بزرگ شہنشاہ داریوش اعظم کے خاص سنگ تراش تھے اور سفر و حضر میں اُس کے ساتھ رہتے تھے۔ میرا تاریخی اور وجدانی ادراک میرے پورے وجود پر محبت اور عقیدت کے وہی احساسات طاری کر دیتا ہے جو میرے اِن بزرگ پر داریوش شاہِ اعظم کے کتبے کندہ کرتے وقت طاری رہتے ہوں گے۔ ذرا تصور فرمایئے، رخشِ جاوید اُس کے سے لاؤ لشکر کی خدمت، وہ بھی شہنشاہ داریوش کی کی ہم رکابی میں! کیا عرض کروں، زباں ساتھ نہیں دیتی۔ انھیں بزرگ کے دادا کا ذکر نہیں کروں گا کہ بعض مورخ کورش اعظم کے منشورِ حقوقِ انسانی کو اُن سے منسوب کرتے ہیں۔

اور میں، ایسے بزرگوں کی ناخلف اولاد، اپنے خوابوں کی، جی ہاں ڈاکٹر صاحب، اپنے خوابوں کی فریاد لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں، اس بودے پن پر میرے اجداد کے استخواں قبروں میں کانپ جاتے ہوں گے۔

لیکن ڈاکٹر صاحب، میری باتوں کو داستان سرائی سمجھ کر آپ انصاف نہ کریں گے۔ یہ باتیں آپ کے لیے، اور ملتِ ایران کے لیے، فخر کا سرمایہ ہیں۔ آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ خود نمائی میرا مقصد نہیں۔ ایک متفحص کی حیثیت سے میں بھی خوب جانتا ہوں کہ کسی معاملے کے ہر پہلو سے اچھی طرح واقف ہو جانے کے بعد ہی اس کے سلسلے میں مناسب اقدام کیا جا سکتا ہے۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ اِن خوابوں کی تفصیل جاننے کو بے چین ہوں گے، اس لیے تمہید ختم کر کے اصل قضیے پر آتا ہوں۔

ڈاکٹر صاحب، مختصراً عرض ہے کہ میرے خواب کچھ عجیب کابوس ہیں جن کا تعلق گزشتہ تاریخ سے ہوتا ہے۔ آپ کو تعجب ہوا نا؟ لیکن ان کابوسوں کو اور کچھ نہیں کہا جا سکتا؛ البتہ ایک سال کے ان سب خوابوں کو کابوس کہہ دینا بھی انصاف کی بات نہ ہوگی، اس لیے کہ شروع کے چھ ماہ تک تو میرے خواب ایسے شیریں اور لذت بخش ہوتے تھے کہ میں نہ صرف رات بھر مزے لیتا تھا بلکہ صبح کو بڑے جوش اور شوق کے ساتھ بستر سے اٹھتا تھا؛ خوب سینہ تان کر اور گردن اکڑا کر اور زور زور سے قدم رکھتا ہوا چلتا تھا، جیسے کوئی جنگ جیت کر مفتوحہ زمین پر چل رہا ہوں۔ یہ سنہرے خواب بڑی بڑی جنگوں میں میری شجاعت اور سپہ گری کے منظر دکھاتے تھے۔

میں بادشاہ سلامت کے ندیموں میں ہوا کرتا تھا؛ ایسا ندیم کہ اُن کے پہلو بہ پہلو بیٹھتا تھا۔ بادشاہ سلامت کے بارے میں بھی بتا دوں۔ وہ زر سرخ کے بڑے سے تخت پر جلوہ فرما ہوتے تھے جس کے دونوں طلائی زینے ہیرے موتیوں سے آراستہ تھے۔ دیبائے رومی کے گاؤ تکیوں سے ٹیک لگائے، الماس، زمرد اور فیروزے کی انگشتریوں سے مزین دستِ مبارک زانو پر دھرے، جو ہر سے

مغل لباس و خود جواں کے شاہانہ پیکر پر خوب پھبتا تھا، گردنِ عالی میں زمردوں سے مرصع طوق اپنی بہار دکھاتا ہوا۔ تاجِ شاہی کی بابت مجھے کو تو بہت کچھ ہے مگر بس ایک خواب کا ماجرا سن لیجیے۔

میں نے بادشاہ سلامت کو دیکھا کہ بڑا بھاری مطلا تاج، طائرانِ ہند کے پروں سے سجا ہوا، ان کے سر پر تھا۔ چار حبشی غلام پیچھے سے تاج کو روکے ہوئے تھے۔ مجھے اس خیال سے وحشت ہونے لگی کہ اگر کہیں ایک بھی غلام کا ہاتھ ڈھیلا ہو جائے تو یہ زبردست تاج گردنِ شاہانہ کو شکستہ کر دے گا۔ ظاہر ہے میری پریشانی فضول تھی، اس لیے کہ یہ غلام قلیچ کے بردوں میں سے چھانٹ کر لائے گئے تھے۔ پھر بھی، چوں کہ میرا عقیدہ ہے کہ ہمیشہ احتیاط کے تقاضوں کو نظر میں رکھنا چاہیے، اس لیے میں نے بادشاہ سلامت پر اپنا اندیشہ ظاہر کر دیا، اور وہ میری دانائی اور دور اندیشی سے اس قدر خوش ہوئے کہ انھوں نے خود مجھ کو غلاموں کی جماعت میں شمولیت کا حکم دے دیا۔

زیادہ تر خوابوں میں بادشاہ سلامت مجھ کو یوں نظر آتے تھے کہ ان کی غضب ناک نگاہوں کے آگے کرۂ ارض کا نقشہ پھیلا ہوا ہے۔ یہ نقشہ مہندسوں اور ماہرینِ تعمیرات نے بارگاہِ سلطانی کے دانش مند وزیروں کی کمک سے تیار کیا ہے۔ بادشاہ سلامت عالمِ جلال میں ہیں -- کبھی کبھی تصدقِ شاہی یہی ہوتا ہے کہ غصہ فرمایا جائے -- اور غیظِ ہمایونی سے وزیر اور ندیم اور حاجب اور اس حقیر سے لے کر دیوڑھیوں کے ادنیٰ پہرہ تک بید کی طرح کانپ رہے ہیں۔ یہ بات دیگر ہے کہ قسمت ہمارا بڑا ساتھ دیتی تھی؛ اکثر تو قسمت ہی ساتھ دیتی تھی۔ مجھے یاد ہے، میرے ایک خواب میں ارادۂ ملوکانہ یوں ہوا کہ کھانسا جائے، لیکن کھانسی کے بجائے چھینک سرزد ہو گئی۔ بس، حاضر باشوں کو اور خود بندے کو اپنی آنکھوں کے آگے موت کی پرچھائیں نظر آنے لگی۔ بادشاہِ جہاں ایسے خشمناک ہوئے کہ ان کے تختِ مرصع کے یاقوت و زمرد تک کا رنگ اڑ گیا۔ بادشاہ سلامت کا ارادہ ہوا کہ بائیں طرف والے وزیر کے کان اور داہنی جانب والے وزیر کی ناک اڑا دیں اور جملہ حاضرین کی زبانیں حلق سے باہر کھینچ لیں۔ اب دیکھیے قسمت کس طرح ہمارا ساتھ دیتی ہے۔ ملک الشعرا جو حضوری میں موجود تھے، انھوں نے فی البدیہہ یہ رباعی موزوں کر کے پڑھ دی:

گر شاہِ جہاں ارادہ کرد بہر سفر
تا ز مبارک و بخش رفت بہ عدم
شاہا چہ کند باد کہ سرگرداں است
خوش عطس بود کہ باد نہ ماند در عرصہ

اور حسنِ اتفاق سے یہ رباعی بادشاہ سلامت کو اس قدر پسندِ خاطر ہوئی کہ فی الفور انھوں نے تبسم فرمایا اور حکم صادر کیا کہ تین دن اور تین رات تک متواتر اس کو گایا جائے، اور خود اپنے دستِ مبارک سے تین مرتبہ ملک الشعرا کا منہ موتیوں سے بھر دیا۔

موضوع سے ہٹ گیا؛ تو ذکر تھا جنگ جہانبانی کا اور کرۂ ارض کے نقشوں کا تھا۔ بادشاہ سلامت اپنی چمکیلی آنکھیں بند کیے ہوتے تھے اور اُن کی دائیں انگلی، وہ وہی جس میں فیروزے کی انگوٹھی تھی، فضا میں چکر کاٹ رہی ہوتی تھی، ایک چکر، دو چکر، اور پھر نیزے کی طرح نیچے جھکتی۔ نقشے کا جو حصہ زیرِ انگشتِ مبارک آ جاتا اُس کو ہمارے وطنِ عزیز کی بے مثال زرخیز مٹی میں مل جانا ہوتا تھا۔ اُس وقت بادشاہ سلامت خاصے پر تشریف فرما ہوتے تھے۔ ندیم خدمت میں مصروف رہتے اور مطرب گانے بجانے میں، اور دورِ شراب چل رہا ہوتا تھا۔ تین شبانہ روز تک ہم بادہ نوشی کرتے رہتے۔ ڈھائی من شراب کے صَرف کے بعد مزاجِ مبارک بحال اور طبیعت خُرسند ہوتی، تب وہ گویا ہوتے اور ہمیں کوچ کا حکم دیتے۔ فراش سلطانی جامے حاضر کرتے۔ بادشاہ سلامت لباسِ جنگی زیبِ تن فرماتے؛ کلاہ اور خود اور زرہ اور خفتان، اور ایک سرخ پارچہ قہر و جلال کے اظہار میں کندھوں پر پڑا ہوا۔ مجمعے کی صورتیں اور دوسرے امورِ جنگ طے کرنے کے لیے ہم ایک بڑے قلعے کو روانہ ہو جاتے جس کے چاروں برج آسمانی رنگ کے روغنی کھپروں سے آراستہ ہوتے تھے۔ تین سو فیلوں پر کسے ہوئے تین سو ہودجوں میں ہزارہا پری چہرہ مہ لقائیں بھی حاضر رہتیں۔ ہمارے شہنشاہ جنگی معاملات کے ساتھ ساتھ ملکی معاملات کو بھی پوری اہمیت دیتے تھے۔

میں بھی دیبائے لعل اور قبائے زر اتار کر لباسِ جنگ پہنتا اور خاصہ خانے سے، جہاں ہر طرف مشک و عنبر کی لپٹیں ہوتیں، باہر آتا۔ جدھر دیکھو آگ کے جو شعلے کے دن کی نشان دہی کے طور پر جل رہے ہوتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آگ نے میری غضب ناک آنکھوں کی سرخی مستعار لی ہے؛ ایسی سرخی کہ دیکھے بغیر ہی دشمنوں کے دم نکل جاتے۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے ڈاکٹر صاحب، کہ اس وقت میں کیسے جوش اور جلال میں ہوتا تھا۔ تب میں اپنے برق سیر نقرہ گھوڑے پر سوار ہوتا اور بجلی کی سُرعت سے یوں دھاوا کرتا کہ غبار کے بادل زمین و زماں پر چھا جاتے۔

"معاف فرمائیے ڈاکٹر صاحب، افسوس، میں ایسا جذباتی ہو گیا کہ اپنے آپے میں نہیں رہا۔ مگر یقین کیجیے میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو اسی طرح بے قابو ہو جاتا۔

خیر، تو اپنی داستان پوری کروں۔ آدھا سال میں نے یہ بیٹھے بیٹھے خواب دیکھتے ہوئے ہنسی خوشی گزار دیا۔ میں بہت مگن تھا اور مزے کی بات یہ ہے کہ میں کبھی شکست نہیں کھاتا تھا اور اسی کے ساتھ کبھی خون نہیں دیکھتا تھا۔ جب بھی تلوار چلاتا یا گرزِ آتشیں گھماتا، کسی نہ کسی سر کو گیند کی طرح ہوا میں اُچھال دیتا، لیکن کبھی پلٹ کر دیکھتا نہیں تھا۔ بات یہ ہے کہ اپنے سورما پُرکھوں کے برخلاف مجھ کو خون سے ڈر لگتا ہے۔

قصہ مختصر کرتا ہوں۔ میرے سنہرے خواب جو ہمیشہ فتح و فیروزی پر ختم ہوتے تھے، اب شکست کا بھی مزہ چکھنے لگے۔ آپ جانتے ہیں یہ میرے اختیار کی بات نہیں تھی۔ کوشش کرتا

Scanned with CamScanner

کہ شکست نہ کھاؤں لیکن خوابوں کی چیرہ دستی کے آگے میری ایک نہ چلتی۔ میں صاف شکست کھا جاتا، بالکل صاف!

یقین جانیے ڈاکٹر صاحب، یہ بڑی وحشت ناک چیز ہے۔ میرا مقصد، اس شان و شکوہ کو دیکھنے کے بعد، ایک پارہ پارہ سا ہو کر رہ گیا تھا کہ مرے اجداد و بزرگ، اس میں سے ایک ایک لقمہ نوچ کر کھائے جا رہا تھا۔ اپنے سپاہیوں کی کمک، بادشاہ سلامت کی جدوجہد اور سرداروں، وزیروں، مدبروں کی شجاعت کے بل بوتے پر جو علاقے ہم نے اپنی مملکت میں شامل کیے تھے وہ سب ہم سے واپس لیے جا رہے تھے یا انہیں زبردستی ہڑپ کیا جا رہا تھا۔ لعنت ہو شیاطین پر!

اب مجھے اپنے خوابوں میں کوئی لذت نہ تھی، بلکہ یہ میرے لیے ایک عذاب بن گئے۔ یہ کابوس میری زندگی کے وحشت ناک ترین واقعات ہیں۔ میں رات سے گھبرانے لگا، صرف اس لیے کہ میرے سونے کا وقت آ پہنچتا اور میں مجبور ہوتا کہ اپنے بستر، بلکہ اپنی عارضی قبر میں جا لیٹوں تاکہ کئی گھنٹوں تک عذاب جھیلتا رہوں۔ آخر میرا سونا، کھانا پینا چھٹ گیا اور میں دن بدن زیادہ بیمار ہوتا گیا۔ واسطے ہو میرے حال پر! اپنے اجداد بزرگ کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ پھر بتائیے، آنسو نہ بہاؤں؟ دیواروں سے سر نہ ٹکراؤں؟ کنویں میں نہ جا پڑوں؟ اس ذلت کو آخر کہاں لے جاؤں؟

لیکن یہ جو میں نے بیان کیا، فقط یہی ایک ذلت نہیں ہے۔ میں کتنے ہی تاریخی کرداروں سے لڑا ہوں اور کتنے ہی تاریخی کردار مجھ سے لڑنے آئے ہیں۔ یقین کیجیے ڈاکٹر صاحب، اگر اس منگول خان، یا اس چھوٹی موٹی آنکھوں والے ترک، یا اس بےلحاظ افغان کی صورت اور مہیب سراپا کسی اور کو خواب میں دکھائی دے جاتا تو بھول کر اس کا دم ہی نکل جاتا؛ لیکن میں اپنے آباؤاجداد کی جنگ آزمائیوں کے طفیل ان منظروں کی تاب لا سکا اور دن رات میں سات سات گھنٹے تک ان وحشی چہروں کو دیکھا کیا۔ ان کی جفاکاریاں، ان کی زور زبردستیاں، ان کی آتش زنی، ان کی کتاب سوزی دیکھ دیکھ کر میرا دل گزرتا تھا لیکن میں سب کی تاب لاتا تھا تاوقتیکہ صبح ہو جائے اور میں منہ لٹکائے، گردن جھکائے اپنی دفتری میز کے پیچھے پناہ لوں۔

تب اچانک ایک نئی بیماری نے مجھ کو آ دبوچا۔

ایک دن میں حسب معمول اپنے دفتر -- ادارہ احیائے ماضی -- میں بیٹھا ہوا تھا کہ مجھے محسوس ہوا کوئی میری میز کے سامنے موجود ہے۔ سر جو اٹھایا تو دیکھتا ہوں چنگیز خاں منگول کھڑا ہے۔ وہی جنگی لباس، ننگی تلوار، چھوٹی چھوٹی چمکتی ہوئی آنکھیں، دو لٹکتی مونچھیں۔ قسم کھاتا ہوں میں ذرا سا بھی نہیں ڈرا، بلکہ مجھے پوری جان سے طیش آ گیا۔ اجداد کا خون میری رگوں میں سنسنانے لگا اور میرے اندر ایک نئی قوت دوڑ گئی۔ بڑے جوش و خروش کے ساتھ میں نے میز پر سے اسکیل اٹھا کر وار کیا کہ اس کا سر تن سے جدا کر دوں۔ اس نے وار خالی دیا؛ تب میں بجلی کی طرح تڑپ کر میز

Scanned with CamScanner

سے پیچھے سے نکلا اور اس کے سینے کو قیمہ قیمہ کر دینے کے ارادے سے اس پر جھپٹا ہی تھا کہ کچھ لوگوں نے میرے ہاتھ پیر پکڑ لیے اور چیخ چیخ کر پوچھنے لگے:

"آقائے ماضی، آقائے ماضی، ہوش میں آئیے، آخر بات کیا ہے؟"

"اور میں چلا رہا تھا:

چھوڑ دو مجھے۔ میں اس نطفۂ حرام کا سر قلم کر دوں گا۔"

ڈاکٹر صاحب، یقین فرمائیے مجھے شرم آ رہی ہے لیکن بتانا پڑتا ہے کہ میں دراصل آقائے اطاعتی پر ٹوٹ پڑا تھا جو چھٹی اور ساتویں صدی کے تاریخی احیا کے نگراں تھے۔ لیکن بات یہیں پر ختم نہیں ہوئی؛ اس دن کے بعد بھی میں نے اپنے کتنے ہی رفیقوں، حتیٰ کہ ادارے کے سربراہ کو بھی سکندر، تیمور، چنگیز، خلیفۂ بغداد اور محمود الغان تصور کر کے پیٹ ڈالا اور بالآخر تھوڑے ہی دن کے اندر، خانوادۂ ماضی کی آبرو محفوظ رکھنے کے لیے، مجھے استعفا دینا پڑ گیا۔

خانہ نشین ہونے کے بعد ایک مدت تک میں نے کتاب کو ہاتھ نہیں لگایا، یہاں تک کہ نادر شاہ کی تصویر بھی طاقچے سے ہٹا دی، سیاست کو طلاق دے کر دوسرے فنون کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ریڈیو تک سننا چھوڑ دیا۔ راتوں کو دیر تک جاگتا اور مشقت کرتا، مثلاً تارے گنتا، زیادہ سے زیادہ سوئیوں میں دھاگا پرونے کی کوشش کرتا اور اس طرح خود کو اتنا تھکا لینا چاہتا تھا کہ وہ وحشت ناک خواب میرا پیچھا چھوڑ دیں۔ لیکن ڈاکٹر صاحب، کوشش بے کار گئی۔ ابھی ان عجوبہ تاریخی خوابوں کی اذیت رفع نہیں ہوئی تھی کہ سے نئے کابوس نئے نئے موضوعوں کے ساتھ آ پہنچے۔

کتنی بدقسمتی کی بات ہے کہ آدمی ایسے وحشت ناک خواب دیکھتا ہے اور ایک لمحے کو بھی نہیں سمجھ پاتا کہ وہ اپنے ہی گھر میں اور اپنے ہی بستر پر ہے۔ خواب کی دنیا اسے حقیقت کی دنیا معلوم ہوتی ہے اور یہیں سے اس کی پریشانی شروع ہوتی ہے کہ سڑک پر چہل قدمی کو نکلتا ہے تو دیکھتا ہے کہ موٹروں میں عام پہیوں کی جگہ لکڑی کے پہیے لگے ہوئے ہیں — واقعی عجیب سے لگ رہے تھے — بجلی کے کھمبوں پر چربی کے چراغ جل رہے ہیں اور لوگ دگلے اور فرغل پہنے، بے ہنگم ٹوپیاں سروں پر منڈھے، اُسے اس طرح گھور رہے ہیں، گویا وہ کوئی چوپایہ یا نسل انسانی سے الگ مخلوق ہو۔

سڑکیں بھی کچھ کی کچھ ہو گئی ہیں۔ محرابیں، قوسی چھتیں، پچی کاری کے ستون، گشتی سپاہیوں کے بجائے دو گوشیہ چوگوشیہ کلاہوں والے برقنداز ہاتھوں میں روپہلے عصا تھامے نظر آ رہے ہیں۔ ان برقندازوں کی گھنی مونچھیں ایسی خوف ناک ہوتی ہیں کہ جب وہ اپنے سروں، بھنوؤں اور ڈاڑھی مونچھوں کے جھاڑ جھنکاڑ میں سے مجھ کو گھورتے ہیں تو میرا دل بیٹھنے لگتا ہے اور سانس رکتی محسوس ہوتی ہے۔ آخر خدا کا کرم ہوتا ہے اور میں چیخیں مارتا ہوا جاگ پڑتا ہوں اور خدا کا شکر ادا کرنا شروع کرتا ہوں کہ ایسی شکلیں دیکھ کر بھی زندہ ہوں۔

Scanned with CamScanner

میں ایک ہیجانی خواب کا ذکر ضرور کروں گا جو پلٹ پلٹ کر آتا ہے اور میرے تن بدن میں تھرتھری ڈال دیتا ہے۔ دیکھتا ہوں کہ ایک وسیع میدان کے گوشے میں بیٹھا ہوں۔ میدان میں ہری ہری گھاس سے گھرے ہوئے حوض ہیں۔ چار جانب دور دور تک بازاروں کے سلسلے ہیں، در بار کی ایسی ڈاکٹر صاحب، کہ آپ نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھے ہوں گے، گرانی کے نقش و نگار سے لیے ہوئے، رستم و سہراب کی جنگ، اسفندیار روئیں تن اور رستم کی لڑائی کے مرقعے، فرہاد کوہکن اور سنگ مرمر کی شبیہیں؛ بازاروں کے اندر دولت کے مال سے چھلکتے ہوئے بھرے، مال بھی وہ کہ آپ ڈھونڈے نظر نہ آئے: مروارید، یاقوت، ادویہ ہندی، ابریشم و زربفت کے پارچے، مخمل، تنزیب کے تھان؛ اس طرف بزازوں کی کوٹھیاں، اس طرف خفت سازوں کے دکانچے، سامنے خط و شوں کا بازار، غرض ایک گہماگہمی ہے جس کی تفصیل کا یہ محل نہیں۔ لیکن یہاں تک کوئی ہولناک بات نہیں ہے۔ لیکن اس کے بعد سے مجھ پر وحشت کا غلبہ ہوتا ہے۔ بازار کے ادھر سے ہو کے نکلے اور ایک خوب صورت اونچی عمارت نظر آتی ہے۔ یہ حاکم شہر کا محل ہے جس کی شاہ نشینوں کو بلوری ستون سہارے ہوئے ہیں۔ چھتوں اور دیواروں پر رنگ برنگ شیشہ بندی، طلا کاری، کاشی کے آسمانی طاقوں پر طرح طرح کے رقعے، حاکم اعلیٰ کے شکار کے مناظر۔ ادھر جھروکوں دوگوشیہ چوگوشیہ ٹوپیوں والے، آتشیں گرزوں سے مسلح گھوم رہے ہیں۔ توجہ کے قابل بات یہ ہے کہ یہیں میں ایک خواب نے رنگ بدل کر کچھ تفریح کا سامان بھی کر دیا۔ محل کے دالانوں میں مغنی اور رقاص -- تمام ہندی نجاروں کی یادگار -- اپنا اپنا فن دکھا رہے تھے۔ خیر چھوڑیئے، یہ خواب دوبارہ پلٹ کر نہیں آیا۔ مصیبت یہ ہے کہ زیادہ تر خوابوں میں سہ پہر کی چہل قدمی کے بعد، یعنی غروب آفتاب کے قریب، اچانک کچھ لوگ میرا گریبان پکڑ لیتے ہیں اور مجھے گھسیٹتے ہوئے حاکم کے پاس لے جاتے ہیں۔ حاکم مے نوشی میں مصروف ہے کہ میں اس کے سامنے چیونٹی کی طرح رکھ دیا جاتا ہوں۔ حاکم کو ایسا تاؤ چڑھتا ہے کہ اس کے گال تمتما کر اس کے [illegible] کی شہ رگ سے بے [illegible] سرخ ہو جاتے ہیں۔ تب وہ گلا پھاڑ کر چیختا ہے: [illegible] دو گردن اس [illegible] سوختہ کی جس نے ہمارا مزہ کرکرا کر دیا۔

تب آپ کو خواب میں دیکھ کے ڈاکٹر صاحب، بھاری بازوؤں اور بڑی سی توند والا جلاد، جس کے چہرے پر سرخ ڈھاٹا جس میں سے خون آلود آنکھیں جھانکتی ہوئی، چوڑے پھل کا تیغہ تانے میری سمت بڑھتا ہے۔ منت و زاری بے سود ہے، کوئی نہیں جو مجھ جل گرفتہ کی فریاد سنے۔ جیسے ہی تیغہ مجھ پر پڑتا ہے، میں ہمیشہ کی طرح ہائے واویلا کرتا جاگ پڑتا ہوں اور ابھی اس دھچکے سے سنبھلنے بھی نہیں پاتا کہ ہمسایوں کی صدائیں بلند ہوتی ہیں:

یہ کوئی پاگل ہے، ہر رات غل مچاتا ہے۔ اسے محلے سے نکال باہر کرو۔ جا کے ڈاکٹر کو [illegible] کہ اسے ہسپتال میں بھرتی کروا دو۔ ذرا ایسی چیخ بند رکھا کرو۔ [illegible] وغیرہ وغیرہ۔

جی ہاں ڈاکٹر صاحب، سیکڑوں زمین اور کتنی جاگیروں کے مالک معتمد الماسی کا بیٹا، اس خواجہ پہلوان ماضی ہاشمی کا پوتا جس نے آغا محمد خان قاچار کے سامنے ایک ہاتھ سے ایک گدھے کی گردن توڑ دی تھی، وہ سرسمی ہو کر اسپتال میں بھرتی ہو گیا۔ لعنت ہے مجھ ننگ خاندان پر۔

یہاں تک کہ کل رات میں نے ایک نئے موضوع کا نیا خواب دیکھا تو اس خوف سے کہ کہیں یہ بھی پلٹ پلٹ کر نہ آنے لگے، میں نے ایک یہ عہد کیا۔ ایک بار اپنے خاندان کی آبرو بچانے کے لیے میں نے ملازمت سے استعفا دیا تھا، یہ کوئی کم سبکی کی بات نہیں تھی، یہ سچ ہے میں نے پکا ارادہ کر لیا کہ ایک بار اور سبکی مول لوں اور ان خوابوں کے بارے میں کسی ماہر نفسیات سے بات کروں۔ آپ کل رات والے خواب کا ماجرا بھی ضرور سننا چاہتے ہوں گے۔ دیکھیے بیان کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ماجرا کچھ یوں تھا:

میں اصفہان کے ساتھ ایک پرانے قلعے میں ٹہل رہا تھا۔ ٹھیک سے یاد نہیں مگر شاید کچھ گنگنا بھی رہا تھا۔ محض اتفاق تھا کہ بہت مگن تھا۔ یکایک ایک شور برپا ہو گیا۔ کوئی آواز، زمین پر زور زور سے پڑتے ہوئے قدموں کی آواز تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ پاگل جنگلی گھوڑے قلعے کے کوچوں میں سرپٹ دوڑ رہے ہیں۔ اچانک ایک نعرے نے مجھے چونکا دیا:

"آؤ۔۔۔ یہاں ہے۔۔۔ پکڑ لو۔۔۔ جانے نہ پائے۔۔۔"

اور ہرچند میرا دم نکلا جا رہا تھا مگر مجھ میں کچھ غیر معمولی طاقت آ گئی اور میں جان توڑ کے بھاگا۔ میں کسی ان دیکھے فوجی دستے سے بھاگ رہا تھا جو میرے تعاقب میں تھا۔ جتنا جتنا میں بھاگ رہا تھا زمین پر پڑتے ہوئے بھاری قدموں کی دھمک میرے اور بھی نزدیک ہوتی جا رہی تھی۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تعاقب کرنے والے دستے کو دیکھنا چاہتا تھا لیکن بھاگتے میں مڑنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ آخر کار جب آوازیں بالکل ہی سر پر آ گئیں اور بھاگنے میں کوئی فائدہ نظر نہ آیا تو میں نے سوچا کم از کم پشت پر تو زخم نہ کھاؤں؛ اس لیے موت سے کھیلنے پر تیار ہو کر میں گھوم پڑا۔ جناب ڈاکٹر صاحب، خدا آپ کو روز بد نہ دکھائے، میرا پیچھا کرنے والی جماعت اصل میں بہت سی کتابیں تھیں جن کے ہاتھ پیر نکل آئے تھے۔ وائے بر حال من! میں چلا اٹھا، میں نے نعرہ مارا، میں چیخا، اور پھر چیخا اور افسوس یہ سب ہنگامہ میں نے کسی قلعے میں نہیں، اپنے بستر میں مچایا تھا، اور ایک بار پھر اپنے ہمسایوں کو جگا دیا تھا۔

اور اب آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ آپ کو اپنے پیاروں کی قسم، مجھے بچا لیجیے۔ یہ کابوس مجھ کو پاگل کیے دے رہے ہیں۔ آپ پچاس گولیاں روز کھلائیے، ایک ایک دن میں سو سو انجکشن لگائیے، مجھے سب منظور ہے۔ بس یہ خواب میرا پیچھا چھوڑ دیں۔

Scanned with CamScanner

آقائے ماضی نے خاموش ہو کر کچھ دیر تک متجسس نظروں سے ادھر ادھر دیکھا، پھر رونا شروع کر دیا۔ اس درد سے روئے اور ایسے ایسے بین کیے کہ ڈاکٹر آشنا پر سخت اثر ہوا اور بے ارادہ اس کی آنکھوں سے بھی آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ یہ ایک پرشکوہ لمحہ تھا۔ ڈاکٹری کی تاریخ میں پہلی بار ایک ہمدرد دوست معالج اپنے مریض کی بیماری پر رو رہا تھا اور ڈاکٹری کی دنیا اس واقعے پر بھونچکی سی سہمی سمائی تھی۔ اس کیس نے ڈاکٹر آشنا کو ایسا ہلا کے رکھ دیا کہ ایک طویل مدت میں پہلی مرتبہ وہ کتاب سے رجوع کرنے پر مائل ہوا۔ ڈاکٹری کی بھاری بھرکم کتابوں کا دیر تک مطالعہ کرتے رہنے کے بعد وہ ہنستا ہوا آقائے ماضی کے نزدیک آیا اور ملائمت سے بولا:

میرے دوست، آئیے کچھ دیر ہم آپ باتیں کرتے ہیں۔

رات۔ آقائے ماضی اپنے کمرے میں چکر کاٹ رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کسی سخت ادھیڑبن میں مبتلا ہیں۔ گاہ گاہ پلٹ کر اپنے بستر کو دیکھتے، پھر فوراً ہی دوسری طرف بڑھ جاتے۔ ان کے چہرے پر بڑھاپے کی سی جھریاں پڑ گئی تھیں، آنکھیں پتھرائی ہوئی اور بدن ٹوٹا ہوا۔ وہ کھڑکی پر گئے اور گھور گھور کر اندھیرے میں کچھ دیکھنے لگے

کچھ دن بعد اخبار پڑھتے ہوئے ڈاکٹر آشنا نے حادثات کے کالم میں یہ خبر دیکھی:

مشہور محقق آقائے ماضی نے خودکشی کر لی۔ خودکشی کرتے وقت وہ اپنی آخری تصنیف "آقائے ماضی کے عجیب و غریب خواب" کی تحریر میں مصروف تھے، جو ان جملوں پر ختم ہوئی ہے:

ڈاکٹر نے کہا: میرے دوست، دو ہی راستے رہ گئے ہیں: یا تو آئندہ کا خیر مقدم کیجیے، یا حال کو بھی الوداع کہیے۔

اور اس نے دوسرا راستا چن لیا۔"

○○

(فارسی عنوان: "خواب ہای عجیب آقای ماضی")

محمود دولت آبادی

فارسی سے ترجمہ: اجمل کمال

ادبار

۱

اصطبل میں خاموشی تھی اور دیوار کے گول سوراخ میں سے ستاروں کا ایک جھرمٹ دکھائی دے رہا تھا۔ نیچے رحمت ایک کاٹھی پر دیوار سے لگا ہوا مدہوش بیٹھا تھا اور اس کی آنکھوں کی سفیدی اندھیرے میں جھلک رہی تھی۔ مدھم روشنی گول رکابی کی طرح اصطبل کے فرش پر پڑ رہی تھی۔ دیوار کے پاس ایک سفید چوپایہ کھڑا تھا جس کے روئیں کھڑے ہوئے اور بدن کھنچا ہوا تھا اور اس پر لرزہ طاری تھا۔

برابر کے کمرے کا دروازہ چرچرایا۔ کولیوں کی بات چیت ختم ہو گئی، ان کی روشنی کی رکابی فرش پر سے غائب ہو گئی اور برف پر کسی آدمی کے قدموں کی چاپ دور ہوتی گئی۔۔۔

رات ابھی تھوڑی ہی گزری تھی۔

رحمت نے کاٹھی پر پہلو بدلا۔ اس نے چادر کو کانوں کے گرد لپیٹا، سر پر ٹوپی درست کی، ہاتھ رانوں میں دبا کر گھٹنوں کو پیٹ کے ساتھ لگا لیا، اور سر کو جہاں تک ممکن تھا کندھے سے لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ بھی ہو وہ تھوڑی سی نیند لینا چاہتا تھا۔

صبح سے سردی نے اسے کسی جگہ ٹک کر دو گھڑی آرام کرنے کی مہلت نہ دی تھی۔ اس کی ہڈیاں مسلسل دکھ رہی تھیں اور پیر کے زخم میں سوئیاں سی چبھ رہی تھیں۔ سر شب اصطبل میں پہنچ کر اس نے چنے کے ڈبے کی تہہ میں پڑے چند ریزے چنے اور دل کے دو دانوں کے برابر ایک گولی سی بنا کر کھا لی تھی۔ لگتا تھا گولی اب اپنا اثر دکھانے لگی ہے کیوں کہ رحمت کو اب

Scanned with CamScanner

گرمی سی محسوس ہونے لگی تھی۔ اس کی پیشانی گرم اور سر بھاری ہو رہا تھا اور پلکیں بند ہوتی جا رہی تھیں۔ مگر خیالات اس کا پیچھا چھوڑنے پر تیار نہ تھے اور مکھیوں کی طرح مسلسل اس کے سر میں بھنبھنا رہے تھے۔

۲

وہ پیدائش کے وقت ہی سے کمزور اور مریل کا مریل تھا۔ جہاں تک اس کی یادداشت کام کرتی تھی، اس کی ماں تقریباً اپاہج تھی۔ وہ اس قدر بیمار رہتی تھی کہ اگر کوئی زور سے ناک سنک دے تو اس کا دم نکل جائے۔ ابھی اس نے مشکل ہوش سنبھالا تھا کہ اس کا باپ اس سے چمڑے کی پٹیوں والے جوتے اور ایک پیالہ لانے کا وعدہ کر کے شہر چلا گیا۔ دو دن تک مارے خوشی اور بے تابی کے رحمت سے کہیں ٹک کر بیٹھے نہیں بنتا تھا۔ تین دن گزر گئے، پھر چار دن۔۔۔ اور پھر ہفتے بھی، مگر اس کی کوئی خبر نہ آئی۔ دوسرے کئی بچوں کے باپ جو شہر گئے تھے لوٹ آئے اور رحمت نے ان سب سے اپنے باپ کے بارے میں دریافت کیا۔ ان کا جواب یہی تھا کہ انہیں اس کا باپ نظر نہیں آیا۔ وہ دل گرفتہ اور روہانسا ہو کر اپنی ماں کے پاس آیا اور بولا:

ضرور تم کہتی ہو آ جائیں گے، آج آ جائیں گے۔ آ جائیں گے۔ کہاں ہیں؟ سب آ گئے، بس وہی نہیں آئے۔۔۔

آ جائیں گے بیٹا، کل ضرور آ جائیں گے۔ کل سڑک کے پاس جا کر انہیں لے آنا۔ یہ کہہ کر اس نے کراہتے ہوئے لحاف سر تک اوڑھ لیا۔

اگلے دن صبح، سارے سوداگروں سے پہلے، رحمت شہر کے دروازے پر پہنچا اور برج کی سیڑھیاں چڑھ کر بیابان میں چمکتی ہوئی سفید سڑک پر نظریں جما کر بیٹھ گیا۔ سڑک پر دور کہیں کوئی سیاہ نقطہ دکھائی دیتا تو اس کا دل بے تاب ہونے لگتا۔ مگر جب وہ نقطہ نزدیک آتے آتے بالکل اس کی آنکھوں کے سامنے پہنچتا تو اس کا دل بیٹھ جاتا اور وہ اگلے نقطے کے انتظار میں برج کے ٹوٹے ہوئے کنگرے سے ٹیک لگا لیتا۔

مغرب کی اذان ہو رہی تھی اور سڑک خشت پشتے میں غائب ہو رہی تھی جب رحمت کو اپنے بدن میں لرزش سی محسوس ہوئی، جو بخار کا دورہ شروع ہونے کی علامت تھی۔ اس نے چاہا کہ برج سے نیچے اتر آئے لیکن دورے نے اسے مہلت نہ دی۔ اس کا سر چکرا گیا، بدن اینٹھنے لگا اور وہ ڈھائی قدم کے برابر اونچے برج سے نیچے آ رہا۔ امام مسجد کے پیچھے بیٹھے لوگ یہی باتیں کر رہے تھے۔ آخر رحمت کے باپ کو کیا ہو گیا۔ جتنے منہ تھے اتنی ہی باتیں۔ بعض تو یہاں تک کہتے تھے کہ بدبختی سے گھبرا کر بھاگ گیا۔ ماں بھی بہت دن زندہ نہ رہی اور جلد ہی ختم ہو گئی۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ غم نے اس کی جان لی۔ خدا بہتر جانتا ہے۔ اس کے مرنے کی وجہ کچھ بھی رہی ہو، رحمت اکیلا

Scanned with CamScanner

رہ گیا، شکستہ اور بیمار، ٹوٹے ہوئے کاسے کی طرح۔ سیب کے ڈنٹھل جیسی پتلی گردن، بڑا سا سر، دھنسی ہوئی آنکھیں، چپٹی ناک، اور ٹھوڑی ایسی باریک جیسے مٹی کے برتن کی لگر ہو۔ جب جوان ہو تو ٹھوڑی پر فقط دو چار نرم، خاکستری سے بال نکلے۔ لوگ کہتے تھے کہ افیون کے شیرے نے اس کے بالوں کی جڑوں کو جلا دیا ہے، مگر اس کا سر، ماتھے سے لے کر پیچھے گدی تک اور ایک کان سے دوسرے کان تک، بالوں سے خوب بھرا ہوا تھا۔ وہ ان کو کبھی ترشواتا نہیں تھا اور وہ ہمیشہ اتنے لمبے رہتے تھے کہ اس کی ملیدہ ٹوپی کے نیچے سے نکل کر کالر پر پڑے رہتے۔

لوگوں نے اس کی ماں کو دفن کیا، اور ابھی اس کی قبر پر ایک دن کی بھی دھوپ نہ پڑی تھی کہ رحمت کو، مٹھی بھر صدقے کے ساتھ، کوکب کے سپرد کر دیا گیا جو دنیا میں اکیلی تھی، تاکہ اس کی عاقبت سنور جائے اور رحمت بڑھاپے میں اس کا سہارا بن سکے۔

لوگوں کا کہنا تھا کہ کوکب بھی یتیم ہی بڑی ہوئی تھی۔ اس کے ماں باپ سیستان کے بلوچ تھے اور گرمیوں کے کوچ کے دوران قحط اور بیماری کی نذر ہو گئے تھے اور فقط کوکب زندہ بچی تھی۔ وہ درمیانی عمر اور لمبے قد کی عورت تھی۔ اس کے بڑے بڑے کندھے لباس کے نیچے نمایاں رہتے تھے اور چہرے کی رنگت کھیرے کی طرح زرد تھی۔

اس کے بے گوشت، کھنچے ہوئے چہرے پر صرف آنکھیں اور بھنویں تھیں جو بالکل سیاہ تھیں۔ سفید ہوتے ہوئے بالوں کو وہ پھیکے رنگ کے رومال سے ڈھانپے رکھتی تھی۔ لوگ کہتے تھے کہ جوانی میں وہ گاؤں کی حسین لڑکی تھی۔ اس کے بال اتنے لمبے تھے کہ ان کی چھ چوٹیاں اس کی کمر تک پہنچتی تھیں اور آنکھیں خراسان بھر میں بے مثال تھیں۔

اب وہ قہوے کا اڈا چلاتی تھی۔ اس کا گھر رہنے اور کاروبار دونوں کے کام آتا تھا، اور گاؤں کی چوپال بھی یہی تھی۔ تھکے، کام سے لوٹنے والے اور وہ مرد جن کا گھر پر کسی کے نیچے کوئی انتظار نہیں کرتا تھا یا جن کا گھر ہی نہیں تھا، اپنا وقت یہیں گزارتے تھے۔

گاؤں کے دوسرے اڈوں کے مقابلے میں یہ سب سے زیادہ چلتا تھا۔

سو وہ لوگ رحمت کو کوکب کے پاس لے آئے، اور اس نے بھی انہیں مایوس نہیں کیا اور رحمت کو اپنے سائے میں لے لیا۔ پہلے اس نے اس کے اترے ہوئے کاندھوں کا علاج کرایا، مگر وہ پوری طرح ٹھیک نہیں ہوئے اور اسے دیکھ کر معلوم ہوتا تھا جیسے اس نے اپنی صدری کے نیچے بکری کا سر چھپا رکھا ہو۔ اس کی پنڈلی کی بھی مرہم پٹی کرائی گئی اور زخم رفتہ رفتہ بھر گئے اگرچہ پنڈلی ٹیڑھی ہی رہی۔

مگر رحمت کو اب کمزوروں، بڈھوں یا کسی اور چیز کی چنتا نہ تھی۔ اس کی ٹوٹی ہوئی ہڈیوں پر باندھتی اور اسے کچھ دیر کرسی کے پاس بٹھا دیتی، مگر رحمت کراہتا رہتا اور اس کی تکلیف کم نہ ہوتی۔ اسے خاموش کرنے کے لیے کوئی۔ کوئی دوا چاہیے تھی؛ کوکب کے پاس اس کے سوا چارہ نہ تھا۔

ان کاموں سے اس نے خود ہی سمجھوتا ...... پھر افیون کے دھوئیں سے بہتر ان کا کیا علاج تھا؟ اس سے تو ہر قسم کا کام سدھر جاتا۔ اور پھر یہ دوا ساتھ ہی موجود تھی۔ وہ چار لمبے کش لیتی اور ہر بار دھواں رحمت کے منھ پر چھوڑ دیتی۔ رحمت کو بھی ان میں مزہ آنے لگا۔ وہ بڑے سکون کے ساتھ دھواں اندر کھینچتا رہتا یہاں تک کہ غافل ہو جاتا۔ اس کا بدن ڈھیلا پڑ جاتا اور خارش ہونے لگتی۔ پھر رفتہ رفتہ درد کم ہو جاتا اور اسے نیند آ جاتی۔ کوکب اس کے سکون پا لینے سے خوش اور اپنے ثواب کے کام پر نازاں ہوتی۔ اس کا نام سب ہی کی زبانوں پر تھا اور سب یہی کہتے تھے کہ "مردانگی داڑھی مونچھ سے نہیں ہوتی"۔

۳

ایک سال سے کچھ زیادہ وقت گزر گیا۔ رحمت کے بدن میں کچھ جان آ گئی اور وہ بیٹھنے پھرنے لگا مگر اس کی داہنی ٹانگ بدل گئی۔ یہ ٹیڑھی اور دوسری ٹانگ سے کچھ چھوٹی تھی۔ بایاں کندھا اونچا ہو کر سر کے برابر پہنچ گیا۔ چلتے وقت ہر قدم کے ساتھ اس کا پورا بدن آگے کو جھک جاتا اور سر جھٹکا کھاتا۔ اس ایک سال میں [illegible] گو کہ اس کا درد لمبی پوری طرح دور نہیں ہوا تھا، اس نے بہت تمام چیزیں سیکھ لی تھیں جن کا سیکھنا اس کے لیے ضروری تھا یا نہیں تھا، اور جو آگے چل کر اس کے کام آ سکتی تھیں یا نہیں آ سکتی تھیں۔ وہ تمام دوسرے بچوں کی طرح، بڑوں کی عادت کی ہوئی ہر شے [illegible] ہوتا تھا، جو کہتے تھے سن لیتا تھا، جہاں بھیجتے تھے چلا جاتا تھا، جو کام کرنے کو کہتے تھے شوق سے پورا کرتا تھا تاکہ اچھا اور [illegible] بچہ بن سکے۔

کوکب کی چار دیواری کے رسم و رواج اور قوانین معلوم اور متعین تھے اور انھیں جاننا اور ان پر عمل کرنا رحمت کے لیے دوسرے اصول کی طرح واجب تھا۔ گاہکوں کو مسکرا کر سلام کرنا؛ وقتے وقتے سے کوزے کو لے جا کر نہر کے صاف پانی سے بھر لانا؛ تہ خانے میں جھاڑو دینا اور قاتیوں اور کٹوریوں کے جھوٹوں کی جھاڑ پونچھ کرنا؛ اپنے اور کوکب کے کپڑے دھو کر دیوار پر پھیلا کر سکھانا اور جب سوکھ جائیں تو تہ کر کے رکھنا؛ اچھی چائے بنانا اور پیالیوں میں اس طرح نکالنا کہ سطح پر جھاگ بن جائے؛ انگیٹھی کی [illegible] پہلو کے بل لیٹ کر افیون کا شیرہ تیار کرنا، اور نے کو صاف کرنے کے لیے تھوڑی تھوڑی دیر بعد ایک کش لینا۔

[illegible] بچے ہوئے شیرے کو کھرچ کر ایک ڈبے میں جمع کرنا ہوتا تھا؛ اس بات کا دھیان رکھنا ہوتا تھا کہ کوکب [illegible] جگہ تھی، کسی بات پر خفا نہ ہو جائے، اور اس کے علاوہ اور بہت سے کام جن کے لیے اسے کوکب کے مکان کی دھوئیں سے کالی پڑی ہوئی چھت کے نیچے سر [illegible] گھومتے رہنا پڑتا تھا۔ سب کاموں میں کوکب نے صرف آب گوشت [illegible] کی ذمہ داری لے رکھی تھی، اور وہ بھی اس لیے کہ اسے یقین تھا کہ آب گوشت پکانا

اس سے بہتر کوئی نہیں جانتا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ جوانی میں وہ حاجی ملا میر کی، خدا اس پر رحمت کرے، پیش خدمت رہ چکا ہے--- کسی کسی دن کوکب دوپہر کے کھانے کے بعد چھت پر دھوپ میں ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ جاتی اور سر رحمت کی گود میں رکھ لیتی اور اسے جوئیں چننے کو کہتی۔ لمبے کالے سفید بال رحمت کی ٹانگوں پر پھیل جاتے۔ رحمت اپنے نازک ناخن اس کے بالوں میں احتیاط سے پھیرتا اور اگر کوئی جوں ہاتھ آتی تو اسے ناخنوں میں دبا کر مار دیتا اور اس کا گہرا سرخ خون اس کے ناخنوں پر پھیل جاتا۔

ہر جوں کو کچل کر مارتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آجاتی اور وہ یوں خوش ہو اٹھتا جیسے اس نے کوکب کے سر سے کوئی بلا دور کر دی ہو۔ کبھی کبھی وہ جوؤں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر مارنے میں اتنا منہمک ہو جاتا کہ اس کی ناک میں سے رینٹھ نکل کر کوکب کے چہرے پر گر پڑتی، مگر وہ اس سے بے خبر اپنے کام میں لگا رہتا۔

۴

قوس اور عقرب کے مہینے نزدیک آ رہے تھے اور صحرا سے لوٹنے والا ہر شخص اپنے ساتھ ایندھن کی خشک لکڑیاں اکٹھی کر کے لاتا تھا تاکہ آنے والے جاڑوں کے لیے ذخیرہ کر سکے۔ کوکب نے بھی صبح سویرے، ناشتے سے پہلے، رحمت کو لکڑیوں کے چار گٹھے جمع کر کے لانے کو روانہ کر دیا تھا کہ پہلے سے انتظام رہے اور جاڑا انہیں بے خبری میں نہ آ لے۔ رحمت انہیں کاموں میں بڑا ہونے کی وجہ سے ہندوستانی مرچ کی طرح تیز طرار ہو چکا تھا، دوپہر سے پہلے ہی چار آدمیوں کے کندھوں پر لکڑیوں کے چار گٹھے لدوا کر لوٹ آیا، اور کوکب کی آنکھوں کے سامنے انہیں مزدوری دی۔ پھر وہ گٹھوں کو کھینچ کر سامان کی کوٹھری میں لے گیا اور آٹے کی ناند کے پاس رکھ دیے۔ کام ختم ہونے کے بعد، جب اس کے ہر لفظ اور ہر جنبش سے تکان ظاہر ہو رہی تھی، وہ لوہے کی بالٹی لیے ہاتھ منہ دھونے چل دیا۔ پھر وہ، تکان سے چور مگر پُر غرور، واپس آیا اور آ کر کوکب کے سامنے انگیٹھی کے پاس بیٹھ گیا۔

اس حال میں وہ خود کو ایک ایسا پہلوان تصور کر رہا تھا جس نے اپنی ماں کی نظروں کے سامنے اپنے حریف کو پچھاڑ دیا ہو۔ کوکب نے نے کو ایک سلاخ کی مدد سے اندر سے صاف کیا اور رحمت نے اسے ہونٹوں میں دبا لیا--- پھر ایک بار اور--- تب اس کے گھٹنوں میں کچھ طاقت آئی اور اس نے ٹانگیں سیدھی کیں، پاس رکھا ہوا ایک سگریٹ اٹھا کر سلگایا اور کہنیاں تکیے میں گڑو کر ٹانگیں ایک دوسرے کے اوپر رکھ لیں، اور کسی خدمت عادی تماش بین کے سے انداز میں ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ کوکب پہلو بدل کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے ہر حرف و حرکت سے احسان مندی کا اظہار ہوتا تھا۔ اس نے چھ انڈے اور انگور کا رس ڈبے کی چربی میں ڈال کر اسے جوش دیا،

Scanned with CamScanner

اسے تانبے کے ایک پیالے میں انڈیل کر بڑی سی کشتی میں رکھا۔ اس کے ساتھ رات کی بچی ہوئی تین نرم روٹیاں بھی رکھ دیں اور کشتی لا کر رحمت کو تھما دی۔ پھر اس نے رحمت کے کندھے پر ایک بوریا ڈالا اور اسے اوپر چھت پر جانے کو کہا اور خود بھی چراغ، تکیہ اور دری لے کر اس کے پیچھے پیچھے چھت پر آگئی۔ رحمت نے کھانے کی کشتی اور بوریا دیوار کے پاس رکھ دیا اور کوکب کے کہنے پر زرد مصر آبادی خربوزہ، جو کوکب نے روٹی کے برتن میں چھپا رکھا تھا، لینے چلا گیا۔ دونوں کو محسوس ہوتا تھا کہ خربوزہ اور افیون ساتھ ساتھ بہت مزہ دیتے ہیں اور ایک دوسرے کے نشے کی تکمیل کرتے ہیں۔ اور دھوپ ان دونوں کا لطف بڑھا دیتی ہے۔ اسی لیے وہ دونوں اکثر چھت پر بساط بچھاتے تھے۔

کوکب نے دری اور اس پر بوریا بچھا کر بیچ میں کھانے کی کشتی سجالی تھی اور روٹیوں کے ٹکڑے کر رہی تھی کہ رحمت بھی آپہنچا۔ اس نے خربوزے کو تکیے کے پاس لڑھکا دیا اور کوکب کے روبرو دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ کھانا ختم کر کے انھوں نے افیون کے دو پیالے پیے، سگریٹ سلگایا اور دیوار کے سہارے بیٹھ کر دھوپ میں سستانے لگے۔

دھوپ گرم اور بہت خوش گوار تھی۔ کوکب نے سر سے رومال ہٹا دیا تھا اور اس کی پانچوں انگلیاں پانچ سانپوں کی طرح اپنے بالوں میں پھر رہی تھیں۔ پھر اس نے کراہتی ہوئی سی آواز میں رحمت سے تھوڑا پیچھے ہونے کو کہا۔ وہ کھسک کر رحمت کے پاس آگئی اور پیٹھ پھیر کر اس کے گھٹنوں سے ٹیک لگالی۔

رحمت کی پتلی، سرمئی انگلیاں کوکب کے بالوں میں بھٹک رہی تھیں کہ اس کی آنکھ لگ گئی، بدن ڈھیلا پڑ گیا اور وہ رحمت کی آغوش میں جا پڑی۔ رحمت نے اپنا گھٹنا سیدھا کیا کیوں کہ اس کا پیر سو گیا تھا۔ کوکب کی پشت رحمت کے پیٹ سے لگی ہوئی تھی اور اس کے گھنے بالوں والا سر رحمت کے سینے پر رکھا ہوا اس کی ٹھوڑی کو چھو رہا تھا۔ وہ دونوں کی ٹانگیں ساتھ ساتھ دراز تھیں۔

سامنے سے دیکھنے پر وہ دونوں ایک جسم معلوم ہوتے تھے: ایک بڑا سا جسم جو دیوار سے ٹیک لگائے دھوپ میں ٹانگیں پھیلائے پڑا ہوا ہو۔

رحمت کی انگلیاں بالوں سے کھیلتے کھیلتے تھم ہو گئی تھیں اور کوکب ہر سانس کے ساتھ اس کی آغوش میں اور نیچے سرک رہی تھی۔ کوکب کے بالوں کی مہک اس کی ناک میں گھسی جا رہی تھی اور اس کا سینہ، پیٹ اور رانیں تمام پسینے میں بھیگ کر تپنے لگی تھیں۔ اس کے پورے جسم سے آنچ نکل رہی تھی جیسے اسے پکڑ کر تنور کے بالکل سامنے بٹھا دیا گیا ہو۔ اس کے رخسار سلگ رہے تھے اور اسے محسوس ہوتا تھا جیسے اس کی چھوٹی، دھنسی ہوئی آنکھوں میں سے آگ نکل رہی ہو۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور سینے میں سے کوئی شے قطرہ قطرہ ٹپکتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس پر ایسی سستی طاری تھی کہ وہ خود کو کسی مادن کی طرح ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔

ایک انوکھی کیفیت اس پر چھایا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور کانوں کی لووں سے جیسے خون ٹپک رہا تھا۔ منہ اور ہونٹ لکڑی کی چھیلن کی طرح خشک تھے۔ سوکھے گلے سے تھوک نہیں نکل رہا تھا اور زبان بکی ایسٹ کی طرح لگ رہی تھی۔ وہ سر سے پیر تک ایک آگ میں جل رہا تھا اور اس میں سے ایسی لذت محسوس ہو رہی تھی گویا اس کی رگوں میں شراب دوڑ رہی ہو۔ اسے خود اپنی عمر کا اندازہ نہیں تھا۔ تیرہ سال؟ یا چودہ؟ یا، بعض لوگوں کے بقول، اس کی عمر پندرہ سے زیادہ تھی اور وہ بالغ ہو چکا تھا؟ جو بھی ہو، یہ موسم ایک نشے سے پُر تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور ہر پرواہ سے آزاد ہو گیا۔ اس نے اپنے ہاتھ کوکب کے بازوؤں کے نیچے سے لے جا کر اس کے پستانوں کے نیچے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پیوست کر لیں۔ اس نے اپنا سر کوکب کی گردن پر جھکا کر خود کو کندھوں تک اس کے بالوں میں چھپا لیا، اور ایک انوکھی لذت کے ساتھ کوکب کو اپنے بھینچ لیا جیسے اسے خود میں جذب کر لینا چاہتا ہو۔ کچھ کچھ دیر بعد کوکب کے بدن کو جنبش ہوتی، وہ بار بار پہلو بدلتی۔ رحمت لرز رہا تھا اور اس کے لمس کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے بھی ادھر ادھر نظر ڈالی: آس پاس کوئی نہ تھا۔

تین طرف کر تک اونچی دیوار تھی۔ سامنے کی جانب گلی تھی اور اس کے پیچھے کچھ کھنڈر تھے کھنڈر، پتھریلے میدان اور پہاڑیاں تھیں جو بالکل سنسان اور ہر ذی روح سے خالی تھیں۔

"کوئی گلی میں نکل آئے تو؟"

اس نے کوکب کی بات سنی مگر ظاہر کیا کہ نہیں سنی۔ اس نے خود کو کوکب سے جدا کیا اور اسے دیوار سے بالکل لگا کر لٹا دیا، دری کو نیچے سے کھینچ لیا اور اپنے اور اس کے اوپر ڈال لیا۔

جس وقت دونوں نیچے آنے کو تھے کوکب زینے کے اوپر سے اسے دیکھ کر مسکرائی، رحمت سرخ ہو گیا اور اس کا سر جھک گیا، اور رات کو انھوں نے اپنے بستر ساتھ لگا لیے۔

■

رحمت اپنی جگہ اکڑوں بیٹھا اندھیرے میں دور کسی نقطے پر نگاہ جمائے ہوئے تھا۔ اس کی آنکھوں کے کاسے بالکل خشک اور ہونٹ ایک دوسرے سے چپکے ہوئے تھے۔ ایک گھنٹے سے زیادہ ہو گیا تھا کہ وہ اسی طرح بے حرکت بیٹھا تھا گویا لکڑی کا بنا ہوا ہو۔

گزشتہ رات اسی وقت وہ ایسے رودیک بے تاج بادشاہ تھا۔ تب وہ کوکب کی چھت کے نیچے کی گرم اور چہل پہل سے بھری زندگی کا حصہ تھا۔ اس کے ہاتھ اور بازو کھلے تھے اور وہ میزبانی کر رہا تھا۔ افیون کی چلم انگیٹھی کے بالکل پاس، اس کی دسترس میں تھی۔ جب بھی اس کا منہ خشک ہوتا اور دل چاہتا، بے کھٹکے چائے پی لیتا۔ افیون سے بھرا ڈبا، انگیٹھی کے نیچے دھرا، اس کی تحویل میں تھا۔ وہ جتنی چاہتا نے میں ڈال کر گاہک کو دے دیتا اور جو باقی رہ جاتی وہ نے کو صاف کرنے کے

Scanned with CamScanner

لیے خود پکی ہوتا۔ چھوٹی سی ہانڈی، ان دونوں کے واسطے کافی، بھری ہوئی اور گرم تھی، دستر خوان پر روٹی موجود تھی اور نمک، مرچ اور ترشی ہر چیز مہیا تھی۔

کرسی گرم اور لوگوں سے پُر تھی۔ ہر طرح کا آدمی جسے دیکھنے کو جی چاہے وہاں موجود تھا۔ ہر کسی کے پاس کہنے کو کوئی نہ کوئی لطف تھا۔ ہر چیز کے بارے میں باتیں ہوتی تھیں؛ محصول، اس سال یا مہینے کی فصل، خشک سالی اور سرما، لڑکیاں جو بیاہی جا چکی تھیں، لڑکے جو آنے والے سال میں شادی کرنے والے تھے، اور یہ کہ پارسال برف سے کئی کمزور مکان ڈھے گئے اور ایک شخص بے کار ہو گیا صد ارحم کرے اور یہ سال خیریت سے گزرے، اور یہ کہ بیس سال پہلے برف باری کی شدت سے لوگ اپنے گھروں میں قید ہو کر رہ گئے تھے اور پھر انہیں گلیوں میں برف کھود کر اپنے چلنے پھرنے کے لیے سرنگیں بنانی پڑی تھیں، اور پرانے اچھے دنوں کا ذکر جب توشہ خانوں میں گندم اور روغن، کشمش اور اخروٹ کے انبار لگے رہتے تھے اور شیرہ الگ جو کے بھاؤ ملتا تھا اور جو کے دام بھی پانچ سی ٹی تومان تھے۔ اور امیر ارسلان اور فرخ زاد اور رستم کی داستانیں، حمد اور حیسر کی جنگوں اور عہدی عہدوں کے قصے، قتل و غارت کی کہانیاں، اور ایسی ہی دوسری باتیں جن میں رات گزر جائے اور لوگ محو ہو کر سنا کریں۔

اسد اللہ چوپداری، جو اپنے بقول راز ملتان اور بلوچستان کا چپہ چپہ دیکھ چکا تھا اور خط تہران اور ملک رے سے اپنی جنسیلی کی طرح واقف تھا، اپنی جوانی کی اور عشق آبادروس کے سفر کی داستان سناتا۔ اور سید موسیٰ، دراز قد اور کمر میں تنکی شال لپیٹے، کرسی کے ایک گوشے میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھتا اور اگر موقع ہوتا تو نیما کے بیت گنگنا کر سناتا۔

حلیمہ بھی وہاں موجود ہوتی تھی۔ پختہ کار، چوتی وچوبند اور ملاحت کی کان۔ اس کے رخساروں پر گلاب کھلتے تھے اور مسکراہٹ اس کے لبوں سے کبھی دور نہ ہوتی تھی۔ اچھی باتیں کرتی اور اچھی ہی باتیں سنتی تھی۔ یہ فکر اسے کبھی نہ ہوئی کہ کوئی فضول گو جا کر اس کے شوہر کے کان بھرے گا۔ وہ اپنی چادر کے پلو میں تھوڑی سی گندم باندھ کر لے آتی اور اس کے عوض مٹر کے دانے کے برابر افیون خریدتی اور اس درد کو آرام دینے کے لیے وہیں بیٹھ کر پیتی جو اس کی داڑھ میں کبھی کبھی اٹھتا تھا۔ رحمت کی نگاہ میں اس کی آنکھیں پہاڑی ہرنی کی آنکھوں کی طرح اور رانیں گھوڑی کی سی تھیں۔ چادر کے تلے اس کا بدن بھیڑ کی طرح گرم و گداز اور بھرا بھرا تھا، اور رنگت میدے کی طرح سفید۔ اس کے لب گویا انگارے تھے اور چال ڈھال مورنی کی سی تھی۔

رحمت بہت دنوں سے حلیمہ کو دل دیے بیٹھا تھا، مگر دل کی بات زبان پر لاتے ڈرتا تھا، کیوں کہ اگر لوگوں کو اس کے خیالوں کی بو تک مل جاتی تو وہ اسے کالے گدھے پر الٹا سوار کر کے گلیوں میں کھینچے پھرتے۔

کہاں وہ اور کہاں اللہ موقوف کے پیشکار کی بیوی! اس کے پاؤں چادر سے باہر نکل جاتے تو

Scanned with CamScanner

کاٹ ڈالے جاتے۔ وہ خود بھی یہ بات جانتا تھا اور فقط دیکھتے رہنے پر قانع تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ کچھ ایسا ہو کہ حلیمہ ہر لمحے اس کی نظروں کے سامنے رہے، بہت سے ایسے گاہکوں کی طرح جو جب دیکھو وہاں موجود رہتے تھے۔ اس کے دل میں کسی کا درد نہیں تھا، اور وہ بیٹھے چلم اور سگریٹ پیتے رہتے تھے، چائے کی پیالیاں چڑھاتے رہتے تھے، افیون کے شیرے کا دھواں اڑاتے رہتے تھے، سسکتے جھینکتے اور زمین و زماں کو گالیاں دیتے رہتے تھے اور آخر چلے جاتے تھے۔

یہ لوگ صرف غم کے زیادہ ہونے کا سبب بنتے تھے۔ مگر حلیمہ ایسی نہیں تھی؛ آدمی کی آنکھیں اسے دیکھتے رہنے سے سیر نہیں ہوتی تھیں اور دل اس کی خوشبو سونگھنے کو چاہنے لگتا تھا۔ وہ وقت جب رحمت اس کے چہرے اور بالوں کو قریب سے دیکھ سکے اور اس کے سانس کی خوشبو کو محسوس کر سکے، صرف تب آتا تھا جب وہ اس کے پہلو بہ پہلو، انگیٹھی کے پاس تکیے سے ٹیک لگائے، ورئے کے لب سے لب ملائے، نیم دراز ہوتی تھی۔ کبھی کبھی جب اس کی چادر سرک جاتی تو چولی میں چھپے اس کے بڑے، بھرے بھرے پستان دکھائی دینے لگتے۔ مگر کوکب اسے اس موقعے کا لطف اٹھانے نہ دیتی اور اس میں رکاوٹ ڈال دیتی۔ وہ فوراً رحمت کے لیے کوئی نہ کوئی کام ڈھونڈ کر اسے حلیمہ کی قربت کے موقعے سے محروم کر دیتی اور حلیمہ کی میزبانی کا کام خود سنبھال لیتی۔

ابھی پچھلی ہی رات کوکب نے حلیمہ کو، اسے چھیڑنے اور مذاق کرنے کی غرض سے، یک قینچی اٹھا کر رحمت کے کانوں کے اوپر کے بالوں کو اپنی انگلی میں لپیٹتے دیکھا اور یہ کہتے سنا: "چلو میں کوکب کے بندر کے بال تراش دیتی ہوں۔" اس پر رحمت بھی ہنسنے لگا۔ تب کوکب نے اسے کمرے کے ایک کونے میں بٹھا دیا کہ وہ افیون کے اُبلنے کو دیکھتا رہے۔ حلیمہ کو اس نے اپنے پاس جگہ دی اور اسے اس کی باری آنے سے پہلے ہی افیون دے دی گئی تاکہ وہ جلدی فارغ ہو کر چلی جائے۔

ظاہر تھا کہ وہ حلیمہ کی شکل نہیں دیکھنا چاہتی تھی اور اگر اس کے بس میں ہوتا تو وہ اس کی پرچھائیں کو تیروں سے چھلنی کر دیتی۔ اس آدھے من گندم کے لیے بھی، جو حلیمہ موقع بہ موقع لاتی رہتی تھی، کوکب کا لالچ جاتا رہا تھا۔ مگر حلیمہ کو اس کی کچھ پروا نہ تھی۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ افیون کی رکابی کے پاس لگائے سینہ آگے کو نکالے بیٹھی تھی۔ چادر سرک کر اس کے شانوں پر آ رہی تھی، سر کھل گیا تھا اور بال چہرے کے دونوں طرف بکھر گئے تھے۔ وہ اپنے شوہر کی شب کوری کے بارے میں کوئی قصہ سنا رہی تھی کہ کس طرح پارسال عید کی رات کو اس کا پیر کنوئیں کی منڈیر میں اٹک گیا تھا اور اس نے اتنے زور کا نعرہ بلند کیا تھا کہ گھر میں شاہ نشین پر بیٹھے بیٹھے وہ بری طرح ڈر گئی تھی۔ ہمسائے ہر طرف سے ان کے گھر میں آ گئے تھے۔ وہ شکایت کر رہی تھی کہ گاؤں بھر کا جگر کھلانے پر بھی اس کے شوہر کی شب کوری دور نہیں ہوئی بلکہ صرف اس کا بدن پھیل گیا اور سنہ

Scanned with CamScanner

سے نوٹ نے لگی۔ پھر وہ یہ بتانے لگی کہ اس کا شوہر کس طرح شکر کے کعب ٹکڑوں کو گن گن کر شکردان میں رکھتا ہے۔۔۔

یہ قصے سناتے ہوئے وہ کرسی کے گرد بیٹھے لوگوں کے ساتھ زور زور سے ہنس رہی تھی۔ کوکب مسلسل کاڑھ رہی تھی اور رحمت، کمرے کے کونے میں ایک گھٹنے پر بیٹھا، کان حلیمہ کی باتوں پر لگائے ہوئے تھا، اور اپنی باری کا انتظار کرتے گاہکوں کی طرف کچھ کچھ دیر بعد انکھیوں سے دیکھ لیتا تھا۔

آگ سے شعلے اٹھ رہے تھے اور اس سے انگیٹھی کے ارد گرد ایک ہالہ سا بن گیا تھا، مگر لگتا تھا جیسے رحمت اس میں پتھر پگھلا رہا ہو۔ پھر اس نے انگیٹھی کے نزدیک ایک گاہک کو حرکت کرتے دیکھا اور اس کا دل ڈوب گیا۔ حلیمہ نے اپنے ہاتھ کرسی پر سے اٹھا لیے تھے، اور اپنی چادر اور بال درست کرتے ہوئے چلنے کی تیاری کر رہی تھی۔ رحمت جھنجھلا گیا اور چولہے میں ہوا بھرنے لگا جیسے چولہے اور انگیٹھی کو حلیمہ کے جانے کا ذمے دار سمجھ رہا ہو؛ گویا انھوں نے قہوے کے ابالنے میں سستی نہ دکھائی ہوتی تو کوکب کی چائے جلدی چلی جاتی اور وہ حلیمہ کی میزبانی کر سکتا۔

رحمت دھونکنی سے ہوا بھر رہا تھا اور سر پر دباؤ سے چولہے میں ہوا کا دباؤ بڑھ رہا تھا اور اس کے نیچے سے نکلنے والی آواز تیز ہو رہی تھی۔ اسے کچھ خبر نہ تھی کہ کیا کر رہا ہے۔ جب اسے احساس ہوا کہ شعلے مدھم پڑتے جا رہے ہیں، اور حلیمہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ کر اپنے بدن پر چادر ٹھیک کرتے ہوئے کوکب کی طرف بڑھ رہی ہے، تو اس کا پارہ چڑھ گیا، اس نے دانت بھینچ لیے اور چولہے میں اور زور سے ہوا بھرنے لگا۔ تبھی اس وقت اسے کوکب کی آواز، گویا کسی کنوئیں کی تہہ میں سے آتی ہوئی، سنائی دی: کیا کر رہا ہے؟ خدا تجھے غارت کرے۔ چولہا پھٹ جائے گا۔

رحمت چونک کر اچھل پڑا جیسے چتڑ میں کسی نے اسے تپتی ہوئی سلاخ سے داغ دیا ہو۔ دھونکنی اس کی طرف جھکی ہوئی تھی، اور چولہا اور اس پر رکھی ابلتی ہوئی دیگچی دونوں بری طرح لرز رہے تھے۔ اس نے ایک چیخ ماری اور خود کو فرش پر گرا۔ اس کا پیر چولہے میں اٹک گیا اور جھٹکے سے دیگچی ابلتی ہوئی کھانے کے برتن سے جا ٹکرائی۔ پیر چھڑانے کی کوشش میں رحمت کا پائنچہ پھٹ گیا اور پنڈلی پر بالشت بھر حصہ آبلوں سے بھر گیا اور اونٹ کی زبان کی طرح نظر آنے لگا۔ رحمت نے پنڈلی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ ہاتھوں کے دباؤ سے آبلے پھٹ گئے اور بے رنگ مائع اس کی انگلیوں میں سے رس کر باہر نکلنے لگا۔ اس کی فریادیں آسمان تک بلند ہونے لگیں اور وہ زخمی سانپ کی طرح تڑپتا ہوا فرش پر لوٹنے لگا۔

کراہتے ہوئے اور فرش پر لڑھکتے ہوئے وہ دیوار سے جا ٹکرایا، پھر اٹھ کر بیٹھ گیا، خود کو خاک پر رگڑنے لگا، پھر اٹھا، دوبارہ گرا، اور اسی طرح تڑپتا رہا یہاں تک کہ گاہکوں کا ضبط ٹوٹ گیا۔ اسد اللہ جاریہ چی نے لپک کر رحمت کو بازوؤں میں جکڑ لیا اور باقی لوگ ان دونوں کے گرد گھیرا باندھ کر

Scanned with CamScanner

ٹکڑے ہو گئے۔

رحمت کچھ دیر تک اپنی ایڑیاں زمین پر مارتا اور سر کو صداقت کے سینے سے ٹکراتا رہا، پھر رفتہ رفتہ اس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگا اور اسے آرام سا آنے لگا۔ ہمیشہ کی طرح اس پر مرگی کا دورہ پڑ گیا تھا اور سر ٹیڑھا ہو کر کندھے سے جا لگا تھا۔ اس کے زخموں پر پٹی باندھ کر اسے دری کے پاس لٹا دیا گیا اور سب لوگ تعجب سے اس کے ارد گرد بیٹھ گئے۔ ان کا نشہ ہرن ہو چکا تھا۔

کہنیاں زمین پر لگائے بیٹھی کوکب کی آواز سنائی دی: "نہیں، یہ یہاں اس کا پہلا اور آخری دورہ ہو گا، فاطمہ، میری قسم۔۔۔" اس کا چہرہ سیاہ چھت کی طرف اٹھ گیا اور وہ مٹھیاں بھینچ کر اپنا سینہ کوٹنے لگی۔ پھر اس نے وہاں موجود تمام لوگوں کے سامنے قسم کھا کر کہا کہ صبح ہوتے ہی رحمت کو گھر سے نکال کر خدا کے حوالے کر دے گی۔ کہنے لگی کہ آج تک رحمت کی دیکھ بھال میں اس نے جس قدر سختیاں اٹھائی ہیں وہ اس کی سات پشتوں کے لیے کافی ہیں۔

اس نے اپنی بات پر حرف بہ حرف عمل کیا۔

رحمت پر یہ بات روزِ روشن کی طرح ظاہر تھی کہ کوکب اپنا دل مضبوط نہیں رکھ سکے گی اور ضرور کسی کو اس کے پیچھے روانہ کرے گی۔ مگر پورا دن گزر گیا اور رحمت کو کوئی آتا دکھائی نہ دیا۔ رات تیز ہوا کے جھکڑوں کے ساتھ آئی۔ رحمت گاؤں کی گلیوں میں تنہا رہ گیا جبکہ سب لوگ اپنے بستروں میں لحافوں کے ساتھ جا سوئے۔ تب وہ ایک خیرات خانے میں آ پڑا اور کسی خانہ بدوش کے گھوڑے کی کاٹھی میں بیٹھ کر صبح ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

۶

چاند نکل آیا تھا اور ہوا کے جھکڑ دور بیابان سے بھیڑیوں کے غول کے غرانے کی آوازیں اپنے ساتھ لا رہے تھے۔ چوپائے کا سر ناند میں تھا اور اس کے جبڑے حرکت کر رہے تھے۔ اصطبل میں خاموشی تھی اور دیوار کے گول سوراخ میں سے ستاروں کا ایک جھرمٹ دکھائی دے رہا تھا۔ رحمت کسی خارپشت کی طرح سکڑا ہوا بیٹھا تھا اور اس کی آنکھوں کی سفیدی اندھیرے میں چمک رہی تھی۔ برف پر کسی کے قدموں کی چاپ قریب آتی گئی، برابر کے کمرے کا دروازہ چرچرایا اور مدھم روشنی گول رکابی کی طرح اصطبل کے فرش پر پڑ رہی تھی۔ نصف تہائی رات بیت چکی تھی۔

رحمت اٹھ کر دیوار کے سوراخ کے پاس گیا اور چہرہ اس سے لگا دیا۔ اسے برابر کا کمرہ پورا دکھائی دینے لگا۔ سامنے کی دیوار پر ایک لالٹین کیل سے لٹک رہی تھی۔ اس کے بالکل پاس ایک آدمی سی تختے پر نگاہ جمائے کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ بدنما اور رنگت جو کی روٹی کی طرح سانولی تھی۔ اس کا بدن مضبوط تھا جو اور لکڑی کے تختے کی مانند سخت معلوم ہوتا تھا۔ اس نے گھٹنوں تک بکی

Scanned with CamScanner

سیاہ قبا پہن رکھی تھی اور کمر پر ایک زرد پٹکا باندھے ہوئے تھا۔ اس کی ناک سیدھی اور بھدی، آنکھیں سیاہ اور پلکیں خنجر کی طرح مڑی ہوئی تھیں۔ روشنائی کے رنگ کی بھنویں اتنی گھنی ہوئی تھیں کہ کنپٹیوں کے پاس تک پہنچتی تھیں۔ اونٹ کی کھال کے رنگ کی شال اس کی گردن کے گرد لپٹی ہوئی تھی اور ٹھوڑی بھی اس میں چھپ گئی تھی۔ وہ کسی آہنی ستون کی طرح ساکت کھڑا تھا۔ ایسے قدوقامت کی رحمت کو ہمیشہ آرزو رہی تھی؛ اگر ایسا سر اور گردن اور طاقت اس کے پاس ہوتی تو وہ بہت سے کام کر سکتا تھا۔

آدمی نے جھک کر پنڈلیوں تک اونچے بوٹ کھولے، قبا اتاری اور عورت کی طرف چلا۔ عورت کے پہلو میں بیٹھ کر اس نے اپنی کہنی زمین پر لگادی اور اپنے کھردرے ہاتھ سے عورت کے گال سہلانے لگا۔ پھر اس نے گردن جھکا کر عورت کے ہاتھ کو چوما۔

عورت نے آنکھیں بند کر لیں۔ اپنے مرد کو دیکھ کر ایک نرم مسکراہٹ اس کے بھرے بھرے سانولے ہونٹوں پر کھیلنے لگی تھی۔ اس نے آدمی کی انگلیاں اپنی انگلیوں میں پھنسا کر انہیں اپنے سینے سے لگا لیا۔ کچھ دیر دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے رہے، پھر آدمی نے کھردرا کمبل ایک طرف ڈال کر عورت کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ اس نے اپنا سر عورت کی گردن اور کانوں سے لگا دیا، ہاتھ اس کے کندھوں کے پیچھے لے جا کر دیر تک اپنے ساتھ چمٹائے رہا، یہاں تک کہ عورت کے ہاتھ اس کی گردن کی پشت کو سہلانے لگے۔

رحمت، تشنہ اور بیدار، خانہ بدوش مرد اور عورت کو تکتا رہا۔ وہ دیوار کے سوراخ سے یوں لگا کھڑا تھا جیسے اس کا چہرہ سوراخ کے حلقے سے پیوست ہو گیا ہو۔ مرد نے عورت کو بازوؤں میں لیے لیے اوپر اٹھا لیا، لالٹین کے پاس جا کر بتی دھیمی کی اور پھر وہیں بوریے پر آ گیا۔ چاندنی دروازے کی تین جھریوں سے اندر آ کر تین باریک پروں کی صورت بوریے پر پڑ رہی تھی۔

رحمت کا حلق خشک تھا اور کنپٹیاں جل رہی تھیں۔ اس کے کانوں کی لویں انار کی طرح سرخ ہو کر سلگ رہی تھیں۔ اس کا پورا بدن تپ رہا تھا جیسے اس کی رگوں میں شراب دوڑ رہی ہو۔ وہ خواہش کے اس قدر شدید غلبے میں کبھی نہیں آیا تھا اور اگر اس کے بس میں ہوتا تو وہ زمین چیر کر حلیمہ کو اس کی گہرائیوں سے بھی نکال لاتا۔ اس کے برابر میں کھڑے چوپائے کو چھینک آئی اور اس کے کان زور سے ہلے۔

رحمت مڑا اور آخر ناند کے کونے پر بیٹھ گیا۔ اسے بار بار تیز سانسوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ چھت پر بنے روشن دان میں سے چاندنی جانور کی پیٹھ پر پڑ رہی تھی اور اس کے جسم کے خطوط کو روشن کر رہی تھی۔ اس کا بدن کسا ہوا اور چھریرا، ٹانگیں مضبوط، کان چھوٹے اور نوک دار اور گردن پتلی اور لمبی تھی۔ یہ ایسا جانور تھا کہ آدمی اطمینان سے اس پر دو گھروں کا اسباب لاد کر ایک قصبے سے دوسرے قصبے کا سفر کر سکتا تھا۔ اس کی ٹانگیں پتلی، رانیں تنی ہوئی اور کولہے گول اور سفید

Scanned with CamScanner

تھے جیسے چاولوں سے بھری دور کابیاں رکھی ہوں۔

اسے اچانک کسی خیال نے گھیر لیا۔ کسی درد سے بھری لہر کی طرح اسے سر سے پیر تک شرابور کر دیا اور وہ ناند سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے اپنی ٹانگ کے زخم بھی یاد نہیں رہے تھے۔

۷

ٹپ ٹپ۔۔۔ خانہ بدوش مرد اس آواز کو پہچانتا تھا اور اسے سنتے ہی اچھل کر بورے سے باہر نکل آیا۔ اس نے جلدی جلدی لالٹین کی بتی اونچی کی اور اپنی قبا پہنی۔ اسے خیال ہوا کہ کسی بھیڑیے نے اس کے خچر پر حملہ کر دیا ہے۔ جاڑا سخت تھا، برف گر رہی تھی اور مدتوں سے بھیڑیں غائب ہو چکی تھیں۔ اصطبل کا دروازہ کم زور تھا اور بھیڑیے کا وزن نہیں سہار سکتا تھا۔ اس نے اپنی کدال اٹھائی اور اصطبل میں پہنچا۔ خچر اپنی اگلی ٹانگوں پر اٹھ چکا تھا کہ خانہ بدوش نے سیٹی بجائی اور اسے ایک طرف ہٹا دیا۔

رحمت جو ناف تک جھکا ہوا تھا اپنے پیروں پر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس کا کینے سے بھرا سر دیوار سے ٹکرایا اور وہ پھسل کر ناند کے پاس گر پڑا۔ آدمی اس کے پاس پہنچ کر لالٹین اس کے چہرے کے سامنے لایا۔ رحمت کا منہ کھلا ہوا تھا اور اس میں سے جھاگ نکل رہا تھا۔ اس کی آنکھیں پیالے کی تہ میں پڑے پکے ہوئے مٹر کے دانوں کی طرح زرد تھیں، کنپٹی پھٹ گئی تھی اور خون اس میں سے اُبل اُبل کر چہرے پر گر رہا تھا اور منہ سے نکلتے جھاگ میں مل رہا تھا۔

یہ دیکھ کر آدمی کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں درد کی ایک لہر محسوس ہوئی اور دل بھر آیا۔ اس نے تلخی کے ساتھ اپنے جانور کی طرف دیکھا جو ایک کونے میں کھڑا ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ آخر ہوا کیا؟ اس پر خوف طاری ہو گیا مگر ہمیشہ سفر میں رہنے والے مردوں کو ایسی باتوں سے اکثر سابقہ پڑتا ہے۔

آدمی نے رحمت کی چادر الگ کر کے اچھی طرح اس کے بدن پر لپیٹی۔ پھر کاٹھی کو اپنے خچر کی پیٹھ پر کسا اور اسے باہر لے گیا۔ پھر اس نے اصطبل کا دروازہ بند کیا، برابر کے کمرے میں گیا، بوریا سمیٹا، شمعدان اٹھایا اور اسباب باندھنے لگا۔

اس کی عورت نے پوچھا: "کیا ہوا؟"

بیابان بے آب و گیاہ تھا۔ چاند ڈوب رہا تھا۔ عورت خچر پر بیٹھی اونگھ رہی تھی۔ لالٹین خچر کی کاٹھی کے ساتھ لٹک رہی تھی۔ اور آدمی اب تک خاموش تھا۔

OO

(فارسی عنوان: "ادبار")

نسیم خاکسار

فارسی سے ترجمہ: اجمل کمال

رات کا سفر

جب روشنی اس کے چہرے پر پڑی تو ڈرائیور نے سٹیئرنگ گھمایا، مگر آگے نہ بڑھ سکا۔ اگر بڑھ سکتا تو گزر جاتا۔ وہ یوں سڑک کے بیچ میں کھڑا تھا کہ اس کے برابر سے نکل نہیں جایا جا سکتا تھا۔ جب ڈرائیور نے بریک پر پیر رکھے تو اس نے ہاتھ نیچے کر لیے۔ وہ کمر سے نیچے سے معذور تھا، جیسے کوئی ایسا شخص جس کی ٹانگ میں گولی لگی ہو، پانچ اور امید و دہشت۔

ڈرائیور بولا: "لنگڑا، کتیا کا بچہ!"

اس نے دروازہ کھولا تو سردی کا جھونکا اندر گھس آیا۔

ڈرائیور دوبارہ بولا: "لنگڑا، کتیا کا بچہ!

اس نے چہرے پر ایک گہرا جیسا ڈھکا تھا جس میں سے صرف آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ پیٹھ پر ایک تھیلا لٹکا تھا جسے اس نے اندر رکھ کر دروازہ بند کر دیا۔

ڈرائیور جو ابھی تک جھنجھلایا ہوا تھا، غصے سے بولا: "کیا لیے جا رہے ہو؟"

کہنے لگا: "کچھ نہیں۔ کھانا دوست۔" اس کی آواز سینے میں سے گھٹی گھٹی نکل رہی تھی۔

ڈرائیور نے کہا: "نہیں سنوں گا۔ پہلے بتا، کیا لیے جا رہا ہے؟"

حنا۔

"ہاں واقعی، کیوں نہیں! مجھے بدنام کرانا چاہتا ہے؟"

اس کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی اور چھوٹی چھوٹی تھیں۔ وہ خود بھی چھوٹے قد کا تھا، اور جس طرح خود ... تھا اس سے اور بھی چھوٹے قد کا لگتا تھا۔ اس کا پرانا کوٹ کندھے پر سے پھٹا ہو

Scanned with CamScanner

تھا۔ دونوں کندھوں پر سے پھٹا ہوا تھا۔

بولا: "برادر، میں ایسا کس طرح کر سکتا ہوں؟"

ڈرائیور کہنے لگا: "یہ کیا طریقہ ہے گاڑی روکنے کا؟ تجھے ڈر نہیں لگتا؟ اگر کچلا جاتا تو؟"

اس نے اپنے حواس درست کیے۔ "ڈرتا کیوں؟ دو گھنٹے سے سردی میں انتظار کر رہا تھا۔ اگر کچلا نہ جاتا تو ٹھٹھر کر مر جاتا۔"

ڈرائیور کا غصہ کچھ کم ہوا۔ "شکر ہے ورنہ تجھے رات مار کے باہر پھینک دیتا۔ کیوں اپنے سر مصیبت مول لوں۔" اس نے ایکسلریٹر پر پیر رکھ دیا۔ "کوئی رات ایسی نہیں ہوتی کہ صلوات و سلام پڑھے بغیر خیر سے اس سڑک سے گزر جاؤں۔ خدا کی قسم بے جواب کبھی رات کو اس سڑک پر گاڑی چلائی ہو۔"

اس نے پیچھے گردن گھمائی۔ "ابھی ایک ہفتہ پہلے ایسے ہی ایک شخص کی وجہ سے دو دن تھانے میں رہنا پڑا تھا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اس آدمی کی طرف اشارہ کیا۔ "معاف کیجیے حضور، شاید آپ اس طرح کی حرکت نہیں کریں گے!"

آدمی نے پلک تک نہ جھپکائی۔ بس آہستہ چل رہی تھی۔ تمام دن بارش ہوتی رہی تھی اور بس کی روشنیوں کے سڑک پر پڑنے سے عجیب طرح کی چمک پیدا ہوتی تھی۔ رات اندھیری اور ابر آلود تھی۔ آسمان پر کوئی ستارہ نہ تھا۔ سانسوں کی بھاپ نے شیشوں کو دھندلا دیا تھا۔ سڑک پر اس قدر پھسلن تھی کہ گاڑی اس سے زیادہ تیز نہیں چل سکتی تھی۔ آدمی نے اپنے تھیلے پر بیٹھ کر دروازے سے ٹیک لگائی تھی اور بالکل بے حرکت بیٹھا تھا۔ باہر کی سخت سردی اب تک اس کے جسم میں موجود تھی۔ اس نے ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں ڈال لیے تھے اور کبھی کبھی کپکپا اٹھتا تھا۔

بارش دوبارہ شروع ہو گئی۔ بہت آہستہ شروع ہوئی اور اس کے قطرے گر گر کر شیشے پر ٹھہرنے لگے۔ ڈرائیور نے وائپر چلایا۔ ایک ہی کام کرتا تھا۔ اور اپنے سامنے کا شیشہ صاف کیا۔ سڑک پر کھڑے پانی کی وجہ سے بس کی روشنیاں عجیب سی چمک پیدا کر رہی تھیں۔ جب ڈرائیور نے ایکسلریٹر پر سے پیر اٹھایا تو آدمی سمجھ گیا، فوراً سمجھ گیا۔

ڈرائیور کے منہ سے نکلا: "آ گئی مصیبت!"

آدمی نے اٹھ کر کھڑکی میں سے باہر دیکھا۔ گشت کے سپاہی تھے۔ جب روشنی ان کی خاکستری رنگ کی وردیوں پر پڑی تو ان کی بندوقیں چمک اٹھیں۔ ان میں سے دو کے پاس بندوقیں تھیں۔

آدمی تھیلے کے اوپر آدھا اٹھا ہوا اور بالکل ساکت تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے تھیلے کو پکڑ رکھا تھا اور دوسرے سے دروازے کو۔ پہلے سپاہی کے دروازہ کھولتے ہی آدمی تیزی سے کود پڑا، چیتے کی طرح، اور اسے ایک طرف دھکیل کر برق رفتاری سے نیچے اتر گیا۔ دوسرا سپاہی جو دروازے کے

Scanned with CamScanner

سے بھاگ رہا تھا، زمین پر گر پڑا، اور ان کے کھڑا ہونے تک آدمی سڑک سے نیچے اتر کر کھیتوں میں غائب ہو چکا تھا۔

دونوں اس کے پیچھے دوڑے۔ کھیتوں میں چھپ چھپ کی آوازیں آئیں اور اندھیرے میں کوئی زور سے چلایا: "ٹھہرو!" یہ پکار پیچھے سے دو مرتبہ سنائی دی۔ تیسری بار یہ آواز جست لگا کر گم ہو گئی جیسے کوئی چیل ہو۔ سانس سینے میں رک سا گیا۔ جب دوبارہ گولی چلنے کی آواز گونجی تو رات کی سڑک بند ہو چکی تھی۔

ڈرائیور بولا: "بھیا، کسی سواری نے مو تیں تو بس نکال لے جاتا۔"

خوف سے ڈرائیور کی ٹھوڑی کانپ رہی تھی۔ سڑک دور تک اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ جب سپاہی واپس آئے تو ان کے ساتھ کوئی نہ تھا۔ آدمی جا چکا تھا۔ کھیتوں کی ریت زیادہ تھی کہ وہ اس کا پیچھا نہ کر سکے۔

سپاہی ویگن پر چڑھتے ہوئے بولا: "تو تم نے اسے خبر کر دی؟ سرکاری کام میں مداخلت کرتے ہو۔ تم سے تو ابھی سمجھ لیں گے۔"

ڈرائیور نے کہا: "خدا کی قسم مجھے کچھ خبر نہیں۔" اور سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "پوچھ لیجیے، مسافروں سے پوچھ لیجیے۔ ان میں سے کسی سے بھی پوچھ لیجیے۔"

سب ڈرے سہمے بیٹھے تھے۔ دروازے میں سے اندر آنے والی سرد ہوا نے انھیں سُن کر دیا تھا۔

دوسرا سپاہی اپنے بوٹوں پر لگی کیچڑ صاف کر رہا تھا۔ ان میں سے جو سڑک پر گر پڑا تھا، کہنے لگا: "یعنی تم اسے نہیں جانتے؟"

ڈرائیور بولا: "اپنے بچوں کی جان کی قسم کھاتا ہوں مجھے کچھ خبر نہیں۔ کسی کو کچھ خبر نہیں۔ اس نے سب کو بے وقوف بنا دیا۔ کہتا تھا اپنے گھر جا رہا ہوں۔"

سپاہی نے چاروں طرف نظر ڈالی، پھر اپنے ساتھی کو دیکھا۔ دوسرا سپاہی بھی اندر آ گیا۔ وہ ڈرائیور کا وقت نکال۔ اس سے کہنے لگا: "ارے تم، حضور!"

ڈرائیور نے کہا: "قسم کھاتا ہوں جو مجھے کچھ بھی معلوم ہو! مسافروں کو بھی کچھ پتا نہیں۔"

مسافروں میں سے ایک بولا: "ٹھیک کہتے ہیں سرکار، ہم سب بے چارے پھنس گئے۔ بس بے چارہ تو بڑی ہمدردی کی سزا بھگت رہا ہے۔ آپ جانتے ہیں سرکار، کتنی سردی ہے، رات کا وقت ہے۔ کسی کو یوں سڑک پر چھوڑ دینا گناہ ہے۔ پھر سرکار، ہم سب نے بھی اس سے کہا کہ بیٹھ لے۔"

دوسپاہی کو غصہ تھا اور بھڑک رہا تھا۔ تفتیش پوری کرنے کے بعد انھوں نے ڈرائیور سے چلنے کو کہا۔ کہتے ہو کہ وہ تھانے پر اتر جائیں گے۔ بارش ابھی تک ہو رہی تھی۔

پہلا سپاہی بولا: "چاہے صبح ہو جائے اُسے پکڑیں گے ضرور۔"
دوسرے نے اپنی بندوق کندھے پر سنبھالی۔
"اس سے تو بارش ہی نمٹ لے گی۔ کیچڑ میں کب تک ٹھہرے گا؟ سردی سے مر جائے گا۔"

دروازہ بند ہونے سے سردی کچھ کم ہوئی۔ بس آہستہ چل رہی تھی، اس کے پہیے سڑک کی کیچڑ میں دھنس کر گھوم رہے تھے اور ایسی آواز پیدا کر رہے تھے جیسے گرمیوں کی دوپہر میں پگھلے ہوئے کولتار پر حرکت کر رہے ہوں۔ تھانے کی مدھم بتیاں بارش میں اور بھی مدھم دکھائی دے رہی تھیں۔ بس رکی تو سپاہی اتر گئے۔ پہلے والے نے ڈرائیور کو تنبیہ کی: "کسی کو بٹھانے وقت خبردار رہا کرو۔"

ڈرائیور نے کہا: "اچھا سرکار،" اور اطمینان کا سانس لیا۔ "کیسا عجیب آدمی تھا، اوہ---"
کوئی بولا: "بہت عجیب، اور کیسا مظلوم بن رہا تھا!"
ڈرائیور نے کہا: "خیر اچھا ہو کہ بچ نکلا، مگر مجھے ڈر ہے کہ پکڑا جائے گا۔"
"اگر ان کے ہاتھ آ گیا تو اس کے باپ سے بھی سمجھ لیں گے۔"
ڈرائیور بولا: "یہ جانور تو بالکل زخمی سانپ کی طرح ہو رہے ہیں،" اور ایکسلریٹر پر پیر رکھ دیا۔ "ہم خوش نصیب ہیں کہ بچ گئے۔"

بارش اور تیز ہو گئی تھی اور کیچڑ بھری سڑک پر پہیوں کے گھوم کر آگے بڑھنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ بس کی روشنی سڑک کے کنارے لگی علامتی تختیوں پر پڑتی تو یوں معلوم ہوتا جیسے کوئی آدمی اندھیرے میں کھڑا ہو۔ دور سے ایسا دکھائی دیتا جیسے کوئی سڑک سے اٹھ کر کھڑا ہو رہا ہو۔ رات اندھیری تھی اور جب بجلی چمکتی تو بیاباں روشن ہو جاتا اور ایک لمحے کو چٹانیں اور چھوٹے چھوٹے ٹیلے نمودار ہو جاتے۔ قہوہ خانے کے پاس پہنچنے پر ڈرائیور نے بس روک لی۔
"اگر اجازت ہو تو ذرا ان کو ایک نظر دیکھ لوں اور فلیوں کا ایک دم لگا لوں۔"

قہوہ خانے کے پاس چار لدے ہوئے ٹرک کھڑے تھے۔ ان کے ڈرائیور قہوہ خانے کے ایک گوشے میں ستا رہے تھے اور چائے پی رہے تھے۔ ڈرائیور انجن کو دیکھنے میں مصروف ہو چکا تھا۔ ٹرک ڈرائیوروں کے علاوہ کرخت دکھائی دینے والے چند اور لوگ رسائیاں پہنے تخت پر بیٹھے فلیوں کے کش لے رہے تھے۔ ڈرائیور اندر داخل ہوا تو قہوہ خانے کا لڑکا اس کے لیے فلیون تیار کرنے لگا۔ ایک بس قہوہ خانے کے سامنے آ کر رکی اور اس کے مسافر بھی قہوہ خانے میں پھیل گئے۔ ڈرائیور چائے پی کر اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے ساتھ کے باقی لوگ بھی باہر نکل آئے۔

بارش رک گئی تھی۔ اسی وقت وہ ٹھیک طرح بیٹھے ہی تھے کہ وہی آدمی ٹرکوں کے درمیان سے نمودار ہوا۔ وہ بری طرح ٹھٹھرا ہوا اور اس کے گھٹنوں تک کپڑے بھیگے ہوئے تھے۔ تھیلا ابھی تک اس کے کندھے پر دھرا ہوا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا تو ڈرائیور نے رحم لہجے میں کہا: کہاں چلا گیا تھا تو؟ اور پھر اس کے لیے جگہ بناتے ہوئے کہنے لگا: آجا، آ جا اوپر، کچھ اپنے کو گرم کر لے۔

یوں لگا جیسے اس کے بیٹھنے سے بہت ساری بوجھ اتر گیا ہو۔ آدمی سر سے پیر تک بھیگا ہوا تھا۔ اس نے مفلر کو چہرے پر سے کھولا۔ چہرہ سنولایا ہوا تھا اور اس پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں۔ کپڑوں سے ٹپکتے ہوئے [illegible] سے وہ عمر رسیدہ دکھائی دیتا تھا۔ اس کی ٹھوڑی کے نیچے زخم کی ایک پتلی سی لکیر کھنچی ہوئی تھی۔ پلکوں سے محروم اس کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور اندر کو دھنسی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ تھیلے کو نچوڑتے ہوئے بولا: جب میں کپڑے [illegible] تو مجھے پتا تھا کہ وہ اتنے بہادر نہیں ہیں۔

ڈرائیور نے پوچھا: چوکی پر [illegible] سے پکڑ ہیں۔

تھیلے کو ایک طرف رکھتے ہوئے کہنے لگا: میں چپکے چپکے چوکی کے پیچھے سے نکل آیا۔

اس کا سر سیٹ کی پشت سے لگا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ کاندھے لرز رہے تھے۔

اس کے بعد [illegible] سستی سے ایک بس والے نے ہٹا دیا۔

"تمہیں ڈر نہیں لگا کہ پکڑے جاؤ گے؟"

وہ کمزور اور ٹوٹتی ہوئی آواز میں ہنسا۔ رات کے وقت نکلنے والے کو پکڑے جانے کا ڈر نہیں ہوتا۔

اس کے جسم پر سردی کا اثر ابھی تک باقی تھا۔ بات کرتے ہوئے اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

بولا: چائے کا [illegible] تو پلاسٹک میں تھا، مگر سگریٹ سب گیلے ہو گئے۔ پھر اس نے سر گھما کر پیچھے دیکھا۔ کسی وقت [illegible] سگریٹ خرید لے ہیں؟

ڈرائیور نے کہا: ہاں۔

خرید لیے ہیں۔

ٹھیک ہے۔

گاڑی تیز چل رہی تھی اور اس کے پہیوں سے نکلنے والی آواز بھی تیز ہو گئی تھی۔

آدمی بولا: بہت سستے داموں کا [illegible] خرید [illegible] ہیں

ڈرائیور کچھ دیر بعد گردن گھما کر اس پر ایک نگاہ ڈال لیتا تھا۔ آدمی آرام سے بیٹھا قمیص کی جیبوں سے سگریٹ کے ڈبے نکال نکال کر انہیں ترتیب سے رکھ رہا تھا۔ باہر اب بھی سخت [illegible] تھا اور [illegible] جب بجلی چمکتی تو دور تک بیابان روشن ہو جاتا اور ٹیلے اندھیرے میں

تحاشا لٹکے ہوئے آدمیوں کی لاشیں دکھائی دینے لگے۔

OO

(اخباری عنوان: شب چودہ)

امین فقیری

فارسی سے ترجمہ: اجمل کمال

تین اُداس بھائی

میں تہہ خانے سے ہمیشہ ڈر لگتا تھا۔ اگر اس کی تاریکی میں دس منٹ کھڑے رہیں تب بھی آنکھیں اس عجیب و رعشہ زا اندھیرے سے مانوس نہیں ہو سکتی تھیں۔ بڑی عمر کے لوگ کہا کرتے تھے: وہ جگہ قبر کی طرح اندھیری ہے۔ اگر چراغ بھی ساتھ لے جاتے تو وہ رد و گرد کے ایک میٹر سے زیادہ حصّے کو روشن نہیں کر سکتا تھا۔ میں وہاں جانے کی کبھی ہمت نہیں کرتا تھا۔ شاید میرے بھائیوں کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا۔ جب وہ پانچ سیڑھیاں اُتر کر نیچے کے ڈش تک پہنچتے تو میرے چھوٹے چھوٹے پیروں کی نرم آہٹ سے بھی ڈر جاتے۔ میرا بڑا بھائی کہتا: 'ارے یہ تم ہو؟'

میں ہنستا اور تاریکی میں آنکھیں گاڑ دیتا۔ منجھلا بھائی کہتا: 'یہ ضرور یہاں کوئی چیز گم کر بیٹھا ہے۔ اندھیرے نے جیسے اس پر جادو کر دیا ہے۔' تہہ خانے کی سیڑھیوں کے پاس اب بھی تھوڑی سی روشنی تھی اور گاڑھا اندھیرا اس ذرا سی روشنی کو بھی پیچھے دھکیلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ابا نصیحت کیا کرتے: کم سے کم سنگلے پیر تو وہاں مت جایا کرو۔ سانپ بچھو بہت ہیں۔ کیا پتا کون چیز وہاں چل پھر رہی ہو۔ کئی بار ایسا ہو کہ ابا کسی کا ہاتھ پکڑ کر تہہ خانہ دکھانے لے گئے تاکہ وہ اس میں بھرے ہوئے کاٹھ کباڑ کو صاف کرے۔ مگر ہر بار جب وہ شخص تہہ خانے سے باہر آتا تو اس کا رنگ اُڑا ہوا ہوتا اور وہ ہکلاتے ہوئے کہتا: "یہ جگہ تو قبر کی طرح تاریک ہے۔"

ابا کہتے: "میں تمھارے لیے چراغ کا بندوبست کر دیتا ہوں۔ اگر کوئی ڈھنگ کی چیز دکھائی دے جائے تو وہ تمھاری۔"

وہ شخص اس دلکش وعدے سے کبھی محروم نہ ہوتا۔ مغرب کے وقت تینوں بھائیوں کے ساتھ جا کر تہ خانے کا بھاری بھرکم دروازہ بند کر دیتا۔ سورج ڈوبنے کے بعد اونچی چار دیواری اور اس سے بھی اونچے شہتوت کے پیڑ مکان کی فضا کو حزن انگیز اور بوجھل کر دیتے اور کھڑکیوں کے رنگین شیشوں کے رنگ پھیکے اور بےجان معلوم ہونے لگتے۔ ہم ڈرتے رہتے اور خود سے کہتے: چلو چل کر تہ خانے کا دروازہ بند کر دیں تاکہ رات ہمارے گھر میں اتنی جلد داخل نہ ہو۔

ابا فقط اخبار پڑھتے رہتے۔ اگر وہ گھر پر نہ بھی ہوتے تو ان کا وجود محسوس ہوتا رہتا جیسے وہ حوض کے پاس سوئے ہوئے پتھر کے شیر کے برابر میں بیٹھے ہماری خیالی دنیا کو تک رہے ہیں۔

ایسی ہی ایک شام کو جب آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا، ہمیں شہتوت کے پیڑوں کے پتے سیاہ دکھائی دے رہے تھے، حوض کا پانی کثیف اور غمناک تھا اور بادلوں کے کالے سایوں کی وجہ سے وہ پانی کے بجائے کوئی اور ہی چیز معلوم ہو رہا تھا، تہ خانے کا دروازہ زور سے دھڑدھڑایا۔ ہمارے چہرے ایک دم زرد پڑ گئے۔ ہم تینوں نے سراسیمہ ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ابا گھر پر نہیں تھے۔ دروازہ اور زور زور سے بجنے لگا۔ دروازہ کھول دیں کیا؟

ہم خوف زدہ اور متردد تھے۔ منجھلا بھائی بولا: چلو چل کر ہمسایوں کو خبر کریں۔

بڑا بھائی کچھ سوچ کر کہنے لگا: تم چاہتے ہو وہ یہ باتیں کریں کہ محلے کے گھر میں جن آ گیا ہے؟ پھر سب ہمارے گھر کو جنوں والا مکان کہنے لگیں گے اور یہ بہت برا ہو گا۔

اس کی منطق تو درست تھی مگر ہمارے خوف کی کچھ حد نہ تھی۔ تہ خانے کا دروازہ مسلسل بج رہا تھا اور لگتا تھا اس کے ساتھ سارے دروازے اور پھیکے رنگ کے شیشوں والی سب کھڑکیاں بھی ہل رہی ہیں۔ یہ خیال ہم سب کے ذہن سے گزرا کہ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہو گا۔ فوراً ہی کچھ کرنا ہو گا ورنہ زلزلے جیسی یہ دھڑدھڑاہٹ کہیں مکان کی بنیادیں نہ ہلا دے۔ ہم تینوں ڈرتے کانپتے آگے بڑھے۔ تہ خانے کے دروازے کی جھری میں سے ہلکی سی روشنی نکل رہی تھی جس سے ہم سب سخت حیرت میں پڑ گئے۔ جب میرے بھائی نے دروازے کی کنڈی کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو ہمیں وہ لمحہ ہزاروں سال طویل محسوس ہوا۔ سب سے اوپر کی سیڑھی کے پاس ایک چھوٹا سا چاند دکھائی دیا جو مرغی جیسا لگ رہا تھا اور ہمیں اپنی قہوہ رنگ آنکھوں سے گھور رہا تھا اور اس کے بدن سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔

معلوم نہیں کتنی دیر تک ہم اسے دیکھتے رہے۔ ہمارے ہاتھ بےاختیار اس کی طرف بڑھے۔ وہ چاند نہ ڈرا نہ گھبرا کر پیچھے بھاگا۔ بس شاید تھوڑا سا چونک گیا۔ ایک لمحے بعد وہ بدن جس سے روشنی پھوٹ رہی تھی میرے بھائی کے ہاتھ میں تھا۔ وہ مسحور آنکھوں سے اسے تک رہا تھا۔ ہم سب پر سحر سا طاری تھا۔ اسی لمحے ہمارے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ اسے اپنے قبضے میں کر لیں۔ نہایت پرشکوہ ہونے کے باوجود وہ بےحد بےبس معلوم ہو رہا تھا۔

Scanned with CamScanner

بڑے بھائی نے کہا: "اسے اٹھالیں گے۔"

منجھلا بھائی بولا: "ابا کو بتائیں یا نہیں؟"

میں نے کہا: "اور دادی کو؟"

بڑا بھائی غصے سے چیخا: "کسی کو نہیں بتائیں گے۔ بس اپنے تک رکھیں گے۔"

میں نے پوچھا: "اور رکھیں گے کہاں؟"

"یہیں تہہ خانے میں۔"

میں نے کہا: "ہم اسے جو کچھ ہم کھاتے ہیں وہی یہ بھی کھائے۔"

بڑا بھائی بولا: "ذرا روٹی کا ٹکڑا لانا۔"

ہم نے روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ڈالے۔ کتنا تیز اس کا جھوکا ہے۔ پلک جھپکتے میں تمام ٹکڑے غائب تھے۔

پانی بھی دیا گیا۔ پانی پی کر اسے کچھ سکون ہوا۔ اس سے پھوٹتی ہوئی روشنی کی چھوٹ ہم سب کو مسحور کیے ہوئے تھی۔

کئی دن سے ہم تینوں [illegible] تھے۔ ہر روز کی [illegible] نہیں تھے۔ مگر اس کا [illegible] سوچا تھا۔ اس میں سے نکلنے والی کی خوشبو آتی تھی اور اس کا رنگ گوشت روٹی کی طرح رہتا تھا۔ تہہ خانہ روشن تھا۔ ہم نے اس کے سب کونوں پر نظر ڈالی۔ وہاں پڑے [illegible] بو دیتے ہوئے [illegible] کچھ بھی نہیں تھا۔

ابا نے دادی سے کہا: "یہ سب کے سب [illegible] سے تہہ خانے میں کیا کرتے رہتے ہیں؟" پھر ہماری طرف دیکھ کر بولے: "تمہیں اندھیرے سے ڈر نہیں لگتا؟ کم سے کم چراغ تو ساتھ لے جایا کرو۔"

ہم تینوں حیران ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ یعنی ان کو کچھ بھی پتا نہیں؟ کیا [illegible] رات کو نکلنے والی روشنی بھی نہیں دیکھی؟ ظاہر ہے، نہیں دیکھی ہوگی ورنہ تہہ خانے میں جا کر جھانکتے تو سہی۔

دادی بولیں: "بچوں کے واسطے کتاب کھول کر دعا کرنی چاہیے۔ کہیں جنوں کے ہاتھوں میں نہ پڑ جائیں۔ ضرور انہیں کچھ ہو گیا ہے۔ [illegible] کے بچے دن رات اپنی ہی دھن میں لگے رہتے ہیں۔ پتا نہیں کیا کرتے رہتے ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ فوراً ہی [illegible] لیے بغیر محلے کے تعویذ لکھنے والے کے پاس چل دیں۔ ہم تینوں کے لیے چار [illegible] ایک ایک تعویذ منگوا لیں اور ہمارے گلوں میں ڈال دیے۔ [illegible] ہم ایک دوسرے سے [illegible] اور [illegible] عجیب [illegible] اور بھی نزدیک آ گئے۔ ہم گھنٹوں بیٹھے [illegible] رہتے۔ تہہ خانہ ہمارے کھیلنے کی جگہ بن گیا تھا۔ کبھی کبھی ہم [illegible] دادی کی

نظر بچا کر وہاں لے جاتے اور اُس منوّر جسم کے پاس بیٹھ کر کھاتے۔ وہ بے پر کا پرندہ بھی ہمارے ساتھ کھاتا۔ ہم میں سے ہر ایک اسے باری باری اپنے ہاتھ سے کھلاتا۔

مگر کیسے؟ یہ ہماری سمجھ میں نہ آتا تھا۔ ہمارے ہاتھ اور اس کے منہ کے درمیان کوئی چیز جاتی دکھائی نہ دیتی اور دم بھر میں بس غائب ہو جاتی۔

میرے بھائی نے کہا: "دیکھنے میں یہ بالکل پرندوں کی طرح ہے مگر اس کے بال و پر کچھ نہیں ہیں۔ ابھی اڑنا نہیں آیا۔"

میرا دل لرزنے لگا۔ اگر یہ اُڑ گیا تو ہمارے تہ خانے میں پھر اندھیرا ہو جائے گا۔ دوسری طرف یہ جگہ ایسی مخلوق کے لائق تو بالکل نہیں تھی۔

اگلے دن سے ہم پَر جمع کرنے میں لگ گئے۔ ہم بازار چوک کے کونے پر کھڑے ہو جاتے اور ہر اُس شخص پر نگاہ رکھتے جو سیّد احمد قصّاب سے مُرغ ذبح کرانے آ رہا ہوتا، اور اگلے روز جا کر اس کی دکان کے کوڑے کے ڈھیر میں سے پَر چن کر لے آتے۔ ان پروں کو ہم اچھی طرح دھو کر صاف کرتے اور بے بال و پر کے اُس پرندے کے بدن پر چپکاتے جاتے۔ اس عمل سے اسے تکلیف ہوتی مگر وہ برداشت کر جاتا۔ ہوتے ہوتے اس کا پورا بدن پَروں سے ڈھک گیا اور عجیب بات یہ کہ پَر آگ آئے۔ اُن کا رنگ جیسا بھی تھا اگنے پر آتشیں سُرخ ہو گیا۔ ایسا رنگ جیسا آگ کے شعلے کا ہوتا ہے۔ ارغوانی قرمزی۔ یا شاید ایسا قرمزی رنگ جس کا کوئی نام نہیں ہے۔ ہمارے پرندے کے بدن میں سب کچھ تھا مگر اس کے بازو نہیں تھے۔ کیا یہ ان کے بغیر بھی اُڑ سکے گا؟ خیر، خدا کا کرنا یہ ہوا کہ ایک روز ہمارے گھر میں بھی مُرغ آیا۔ عید کا موقع تھا۔ ہم تینوں مرغ کو ذبح کرانے سیّد احمد کی دکان پر لے گئے۔ دیکھا کہ بڑے بھائی نے آہستہ آواز میں سید احمد سے کچھ کہا جو ہماری سمجھ میں نہ آیا۔ لیکن جب ابّا نے گھور کر بڑے بھائی کو دیکھا اور پوچھا: "اس کے بازو کہاں ہیں؟" تو سمجھ میں آ گیا۔ سید احمد نے مُرغ کے بازو کاٹ کر الگ کر دیے تھے۔ بھائی بولا: "بازو نہیں ہیں تو پیلیے میں مرغ کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔"

ابّا کا غصّہ جلد ہی اُتر گیا۔ دسترخوان پر ہمارے سوا کسی کو بازوؤں کا خیال نہیں تھا، اور ہم جانتے تھے اب اُس عجیب مخلوق کے بازو بھی لگ جائیں گے۔ جس وقت ہمارا پرندہ اُڑے گا، سب لوگ حیران رہ جائیں گے اور خود سے کہیں گے: "معلم کے گھر میں آگ کے رنگ کا پرندہ ہے۔"

اس کے بازو بھی اُگ آئے۔ سال گزرتے رہے۔ ہم تہ خانے کا دروازہ کھلا رکھتے تھے مگر اس نے اڑنے کی کوشش نہیں کی۔ ہمیں خیال آیا: بتاوی کے پیڑوں سے بہتر کون سی جگہ ہو گی جن کی شاخیں اور پتّے بہت گھنے ہیں۔ ہم اُس کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے بازو ہوا میں لہرانے لگے جیسے اُسے رٹا سکھا رہے ہوں، ورنہ تو وہ تہ خانے کے گھُپ اندھیرے میں پڑا سڑتا رہے گا۔ اس نے بھی ہماری دیکھا دیکھی اپنے بازو لہرانے شروع کیے لیکن اڑ نہیں۔ ہمیں بہت افسوس ہوا۔ سارے

پرندے اڑتے ہیں، یہاں تک کہ پنجروں میں بند پرندے بھی پنجروں کے دروازے توڑ کر دور آسمان میں پہنچ جاتے ہیں۔ تو پھر ہمارا پرندہ، جو ان سب سے زیادہ خوب صورت ہے، کیوں نہیں اڑتا۔ ہم اس پرواز کرنا چاہتے تھے۔ مگر وہ تو تہ خانے سے نکل کر حوض تک ہی نہ جاتا تھا۔

ہم ناامیدی کے عالم میں، جب کہ ہم پرندے سے بھی زیادہ غمگین تھے، اچانک ہم نے دیکھا کہ آگ کے رنگ کا وہ پرندہ صحن میں کھڑا ہے اور اس کے بازو حرکت کر رہے ہیں۔ ہم بھی اس کے ساتھ ساتھ بازو ہلانے لگے۔ اینٹوں سے بنے ہمارے صحن اور بیٹھے ہوئے مکان میں جیسے جان پڑ گئی۔ درختوں پر پھر سے بہار آ گئی۔ ہم بھی مست ہو کر پرندے کے ارد گرد چکر کاٹنے اور بے خودی میں رقص کرنے لگے۔ وقت کی رفتار گویا تھم گئی۔ ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ ہمارا اور پرندے کا وجود ایک ہو گیا تھا۔ ہم ایک دوسرے کے گرد گھوم رہے تھے۔ پرندہ ہماری طرف مسکرا کر دیکھ رہا تھا، جیسے ہمارا شکریہ ادا کر رہا ہو۔ رقص کے ہر دائرے کے ساتھ وہ اونچا ہونے لگا۔ اب وہ سارا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ اچانک ہم سب ساکت ہو گئے جیسے کسی بات کے ہونے کے منتظر ہوں۔ ہماری بے تابی اس کے روپ تک بھی پہنچ گئی۔ بڑی دقت کے ساتھ اس نے خود کو زمین سے اٹھا کر حوض کے کنارے تک پہنچایا۔ ہم گم سم کھڑے دھڑکتے دل کے ساتھ منتظر کھڑے رہے، یہاں تک کہ اس میں حرکت پیدا ہوئی۔ وہ تھوڑا سا اوپر اٹھ کر بادام کے پیڑ کی سب سے نچلی شاخ پر جا بیٹھا۔ ہمیں توقع تھی کہ کچھ دیر وہاں بیٹھ کر وہ دوبارہ حوض کے پاس اتر آئے گا۔ لیکن وہ اچانک اور اوپر اٹھنے لگا: پہلے تین میٹر، پھر چھت کے قریب ہو گیا۔ ہم جلدی سے بھاگ کر چھت پر پہنچے۔ ہم خوش تھے۔ وہ چار بار پر پھیلا کر دو گھر تک آ گیا۔

ہمارے مکان کی دیوار اور اونچی تھی۔ میرا بھائی چلایا: اگر یہی طرح اڑتا رہا تو وہ لوگ اتنا خوب صورت پرندہ دیکھ کر پکڑ لیں گے۔ ایسے رنگ کا پرندہ کس کے پاس ہوگا؟ دیکھو دیکھو، بالکل آگ کے گولے جیسا ہے! آس پاس ہر چیز اس کے رنگ کی ہو گئی ہے۔ جہاں بیٹھتا ہے آگ سی لگ جاتی ہے ... وہ، میرے سر سے ہو کر اڑ گیا!

پرندہ اڑ کر برابر کے مکان کی چھت پر جا بیٹھا۔ مکان کا صحن سرخ ہو گیا تھا، ہرے پتے بھی ہرے نہیں رہے تھے۔ کھڑکیاں بھی سرخ ہو گئی تھیں۔

ہمسائے کہنے لگے: ہماری چھت پر کیا کر رہے ہو؟

ہم نے کہا: اپنا پرندہ لینے آئے ہیں۔

انھوں نے دیکھا۔ ان کا صحن ارغوانی رنگ کا ہو رہا تھا۔ شاید انھیں اب تک اس کا احساس نہیں ہوا تھا۔

وہ کچھ دیر تک ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ ان کی آنکھیں عجیب سی روشنی سے چمک اٹھی تھیں۔

Scanned with CamScanner

"تمہارا پرندہ؟ یہ تو ہمارا ہے! تمہارا ہوتا تو تمہارے گھر میں ہوتا۔ محلے میں کوئی نہیں جانتا کہ تمہارے پاس ایسا پرندہ ہے۔"

میرا بھائی چلایا: "نہیں، آپ لوگ جھوٹ کہہ رہے ہیں۔ آپ کو تو اس کا پتا بھی نہیں تھا۔ آپ تو اس کو دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔"

ہم سایوں نے کہا: "ہم کچھ سننا نہیں چاہتے۔ جس کے پاس ہے اُسی کا مال ہے۔"

ہمارا دل مضبوط تھا۔ ہم نے برسوں اس کی دیکھ بھال کی تھی۔ وہ کیسے کسی اور کے پاس چلا جائے گا؟ مجھے تو اب تک اپنی انگلیوں تلے اُس کے دل کی دھڑکن محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ میرے بھائی بھی یہی محسوس کر رہے ہوں گے۔

پرندہ پھر اڑنے لگا۔ اب وہ اس سے بھی اونچی کسی جگہ پہنچنا چاہتا تھا۔ تمام شہر پر ارغوانی رنگ کا پارچہ سا اڑ رہا تھا۔ لوگ اپنی اپنی چھت پر آ کھڑے ہوئے۔ ہم اس بھیڑ میں گم ہو گئے۔ آسمان سُرخ ہو گیا تھا۔ سورج دکھائی نہ دیتا تھا۔ یہ پتا نہیں چلتا تھا کہ دن ہے یا رات۔ ہمارے چیخنے چلّانے پر کسی کی توجہ نہ تھی۔ ہمارا پرندہ سر للہ اور اوپر اڑ رہا تھا۔ مگر اس کا اُڑنا معلوم نہ ہوتا تھا، بلکہ لگتا تھا جیسے وہ ہوا سے لڑ رہا ہو۔ اس کی پرواز بہت بھاری تھی۔ بھائی بولا: "ڈر رہا ہے۔ آسمان میں نہیں اڑ سکتا۔ لوگ اسے پکڑ لیں گے۔ بہت ہنگامہ ہو گا۔"

ہمارا پرندہ دس دس میٹر، پانچ پانچ میٹر، دو دو میٹر اڑتا ہوا اوپر جا رہا تھا۔ مینار سے اونچی جگہ شہر بھر میں نہ تھی۔ وہ بے پناہ کوشش کر کے وہاں تک پہنچ گیا۔ ایسے کھڑا تھا جیسے لوگوں سے بات کرنا چاہتا ہو۔ میرا بھائی مینار کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جانے لگا۔ تمام لوگ شہر بھر پر پھیلے ہوئے ارغوانی چھتر کے سائے میں بے تاب کھڑے تھے۔ ہم اپنے بھائی کے لیے بے چین تھے، سب کو بتا رہے تھے کہ وہ ہمارا بھائی ہے اور یہ کہ کس طرح ہم نے پرندے کو پالا تھا۔

لوگ ہمیں یوں دیکھنے لگے جیسے احمقوں کو دیکھا جاتا ہے۔ ہمارا مذاق اڑانے لگے۔

"ایسا پرندہ تمہارے ہاتھ کس طرح لگ گیا؟"

کسی نے ہماری کہانی پر یقین نہ کیا۔ سب نے اسے ہمارا بچپنے کا تخیل سمجھا۔ بھائی اب پرندے کے پاس جا پہنچا تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ کسی اور کو مینار کے اوپر چڑھنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ سب کی نظریں بھائی پر جمی ہوئی تھیں۔ ہمیں خوف کے عالم میں بھی غرور کا سا احساس ہو رہا تھا۔

ہوا چلی اور ارغوانی چھتر کا حجم ذرا سمٹ گیا۔ بھائی نے پرندے کو پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

پرندہ بھائی کی آغوش میں آنے کو ہوا مگر لڑھک کر پتھر کی طرح ہوا میں سے گزرتا نیچے آنے لگا اور اس کے زمین پر گرنے کی ذرا بھی آواز نہ ہوئی۔ اس نے دو تین بار اپنے بازوؤں کو حرکت دی

اور ساکت ہو گیا۔

دنیا کے دوسرے کونے سے تیز ہوا چلنے لگی۔ ہر چیز اس کی رو میں آ کر درہم برہم ہو گئی۔ ہوا کے زور سے ہر چیز ایک دوسرے سے ٹکرانے لگی۔ دیوار بیچ سے ٹوٹ کر زمین پر ڈھیر ہو گئی۔ پرندہ اب پرندہ نہیں تھا۔ اب وہ کچھ بھی نہیں تھا۔ بجلی جلنے کی طرح پھوٹا اور تحلیل ہو کر غائب ہو گیا۔

OO

(فارسی عنوان: پرواز تخیل)

منیرو روانی پور

فارسی سے ترجمہ: اجمل کمال

لمبی رات

جُفرہ کا پورا گاؤں گُلپر کی چیخوں تلے جان دے رہا تھا۔ خزاں کی ہوا سوختہ کشاں سمندر کی جانب سے، کھجور کے پیڑوں میں سے گھوم کر نکلتی اور مٹی اور خاشاک اور مڑے تڑے کاغذوں کو اپنے زور میں لپیٹ لیتی، چلی آ رہی تھی۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ مریم اپنی جگہ پڑی پڑی کروٹیں بدل رہی تھی۔

"اماں، دروازہ بند کر دو۔"

"سب دروازے بند ہیں۔ بس سو جاؤ۔"

وہ اُسے مار رہا ہے، ہے نا اماں؟ محمد ابراہیم اُسے مار رہا ہے نا؟

"نہیں، پُچکار رہا ہے۔ مریم، بس اب سو جاؤ۔"

"صبح وہ کھیلنے آئے گی نا؟ سمندر پہ آئے گی نا؟"

"ہاں، میں خود بلا لاؤں گی۔ اگر تم سو جاؤ گی تو خود اُسے بلا لاؤں گی۔"

ایک دلخراش چیخ تاریکی کو چیر کر گویا مریم کے سر میں آ کر لگی۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔

"وہ مر رہی ہے اماں، سچ مچ مر رہی ہے۔۔۔"

اس کو ماں کی دبی دبی ہنسی کی آواز سنائی دی اور ابا کی سرگوشی جو ماں سے کہہ رہے تھے:

"بچی ڈر رہی ہے۔۔۔"

سب دروازے بند کر دیے ہیں، پھر بھی آواز نہیں رک رہی۔

Scanned with CamScanner

"اب اس کے جنگل میں ایک کبوتری پھنسی ہے، سے جانے کہاں دے گا۔"

پانچ دروازوں والے کمرے کے سب کواڑ بند تھے۔ پانی کے سفالی ظرف کے اوپر آدھی بتی والی لالٹین ٹمٹما رہی تھی۔ مریم اماں ابا سے دور ہو کر بالکل دیوار کے پاس لیٹی تھی۔ مضطرب کرنے والی ہولناک آوازیں اس کے سر میں گونج رہی تھیں۔ تیز ہوا کی آواز، آندھی کے زور سے کھلتے بند ہوتے دروازوں کی آوازیں، اور ان لگڑی ہوئی دردناک چیخوں کی آوازیں جو گلپر کے چھپر میں سے آ رہی تھیں اور لحہ بہ لحہ اور زیادہ عجیب ہوتی جاتی تھیں۔

"خدا کے لیے۔۔۔ خدا کے لیے۔۔۔ میں مر جاؤں گی۔"

ایک ہفتہ ہو گیا تھا کہ مرغ کی بانگ کے بعد گلپر کی آواز گاؤں میں سنائی نہیں دیتی تھی۔ اس کی صاف اونچی آواز جو بچوں کو گھروں سے باہر کھینچ لاتی تھی اور آبی پرندوں کو بھی گیروں کے گھاٹ پر جمع کر لیتی تھی۔

سورج نکلنے سے پہلے گاؤں کے بچے سمندر کے کنارے رفع حاجت کے لیے قطار بنا کر بیٹھ جاتے اور اس کے بعد سمندر کا خنک اور مہربان پانی انھیں اپنی آغوش میں لے لیتا۔ گلپر کے بازو ہوا کو کاٹتے، پانی کو چیرتے ہوئے تیزی سے آگے بڑھتے جاتے۔ ماہی گیر جو دور سمندر میں لنگر ڈالے بیٹھے ہوتے تھے، گلپر کی آواز سن کر اپنے جال سمیٹ لیتے اور جزیرہ کی طرف روانہ ہو جاتے۔

آ۔۔۔ آ۔۔۔ سنگر آ۔۔۔ آ۔۔۔ سمندر۔۔۔ آ۔۔۔ آ۔۔۔ آ۔۔۔

آبی پرندے بچوں کو چونچ نہیں مارتے تھے بلکہ ان کے اردگرد جمع ہو جاتے، ان کے ننگے کندھوں پر آ بیٹھتے، یا اپنی چھوٹی چھوٹی سرخ چونچوں سے گلپر کے سمندر کی سطح پر تیرتے اور لہروں کے ساتھ تلے اوپر ہوتے سنہری بالوں سے کھیلنے لگتے۔

ایک ہفتہ ہو گیا تھا کہ گلپر نے کسی کو نہیں پکارا تھا، اور اب اس کی جگر خراش چیخیں گاؤں کے باسیوں کی نیند اڑا رہی تھیں۔

مریم کانپ رہی تھی، اس کا منہ خشک تھا اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے پانی کے ظرف اور ٹمٹماتی لالٹین کو گھور رہی تھی۔

"اٹھ کیوں بیٹھیں؟ چلو سو جاؤ۔۔۔"

"پانی۔۔۔"

اس کی آواز گلے میں گھٹ کر رہ گئی۔ پھر اسے اماں کی نیند میں ڈوبی آواز سنائی دی:

"منو اسے پانی لا کر دو۔ منوں نے بھی کیا مصیبت کر رکھی ہے۔"

اماں بڑبڑاتی ہوئی اٹھیں اور پانی کا کٹورا بھر کر مریم کے پاس آئیں۔

"خاک پڑے اس شادی پر اور شادی کرنے والوں پر۔"

"اماں، کتنا اندھیرا ہے۔۔۔"

Scanned with CamScanner

"چلو--- پانی پیو اور سو جاؤ۔"

"بتی اونچی کر دو، بہت اندھیرا ہے۔"

تیز ہوا کا ایک جھکڑ زور سے دروازے سے ٹکرایا۔ لالٹین کا مدھم سا شعلہ کپکپایا۔ مریم دونوں بازوؤں سے اماں سے چپٹ گئی۔

"اماں، سنتی ہو؟ آواز آ رہی ہے، اس کی آواز آ رہی ہے۔"

"ہوا ہے بیٹی، ہوا ہے۔"

"نہیں، وہ گھر سے نکل آئی ہے۔ جاؤ، جا کر دروازہ کھول دو۔"

"نہیں بیٹی، ہوا ہے۔ گلپر تو اپنے گھر میں ہے۔"

ہوا کا شور ایک بار پھر اٹھا۔ یوں لگا جیسے کوئی بال بکھرائے خون آلود ہاتھوں سے دروازہ کھٹکھٹا رہا ہو۔

"لالٹین کو اس کونے میں لے جاؤ۔ بجھی جا رہی ہے۔"

یہ ابا کی آواز تھی جو اٹھ بیٹھے تھے اور سگریٹ سلگا رہے تھے۔

"ابا، اماں سے کہو دروازہ کھول دیں۔ باہر وہ ہے نہ---"

"کوئی نہیں ہے۔ ہوا ہے۔"

"نہیں نہیں، وہ چیخ رہی ہے، وہی ہے۔"

"لہروں کا شور ہے۔ اور چیخیں بھی آبی پرندوں کی ہیں۔ طوفان سے ڈر رہے ہیں۔ چلو سو جاؤ، ابھی صبح ہوئی جاتی ہے۔"

"دروازہ کھول دو، خدا کے لیے، اماں---"

"عجب مصیبت ہے! اب سوتی ہو یا نہیں؟ اور تو سب خوش ہیں بس ہماری بدبختی ہے۔"

اماں نے مریم کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی لٹا دیا اور چادر اڑھا دی۔ ابا تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے۔

"اماں، لالٹین کو پاس لے آؤ، مجھے ڈر لگتا ہے۔ اژدہے سے ڈر لگتا ہے۔"

"خدا کی پناہ! اژدہا کہاں ہے؟"

"عصائے ابراہیم کا اژدہا۔"

ابا کے ہنسنے کی آواز آئی۔ اماں نے لالٹین لا کر اس کے سرہانے رکھ دی۔

"بس اب سو جاؤ۔ سب سو رہے ہیں۔ کوئی نہیں ہے دروازے پر۔"

"کوئی نہیں ہے؟"

"نہیں۔ بس ہوا ہے اور لہروں کا شور۔ اور بچے اٹھانے والا گھوم رہا ہے گلیوں میں۔ اس

Scanned with CamScanner

بچوں کی بولتی بند رہا ہے جواب تک نہیں سونے۔ اگر اسے پتا چل گیا تو آ کے تمہیں لے جائے گا۔ اور وہ اتنا طاقتور ہے، کوئی بھی اس کا سامنا نہیں کر سکتا۔۔۔

آخر اس بچے اٹھانے والے کو گلپر کی چیخیں کیوں سنائی نہیں دیتیں؟ وہ تو اتنا لمبا ہے کہ اس کا سر آسمان تک پہنچتا ہے اور انگلیاں بڑی کیکروں کے کانٹوں جیسی ہیں، اور وہ رات کے وقت چھپ کر گاؤں میں گھومتا ہے، کھڑکیوں کے پاس کھڑا ہوتا ہے اور مچھلی پکڑنے کے کانٹوں جیسی اپنی انگلیاں گھر میں ڈال دیتا ہے اور جو بچے جاگ رہے ہوں انہیں اٹھا لے جاتا ہے۔ اے خدا، بچے اٹھانے والے کو بھیج دے، اے خدا، بچے اٹھانے والے کو گلپر کی چیخیں سنائی دے رہی ہیں، وہ جان جائے کہ یہ وہی گلپر ہے، وہی گلپر جو بچی تھی ہے، بڑی نہیں ہوئی، اس کے ہاتھوں میں چوڑیاں نہیں ہیں اور نہ اس کے ہونٹوں پر لالی لگی ہے۔۔۔

آنسو مریم کے گالوں پر آ کر ٹک گئے۔۔۔ نہیں، بچے اٹھانے والا گلپر کو نہیں پہچان سکتا۔ وہ کتنا ہی بولتا پھرے سب بے فائدہ ہے۔۔۔ یہ گلپر کی آواز ہی نہیں ہے، یہ تو کسی عورت کی خراش دار چیخیں ہیں جیسے اس کے، تو پیر کاٹے جا رہے ہوں، کسی ایسی عورت کی فریادیں جسے کسی اژدہے نے جکڑ لیا ہو۔ گلپر کی آواز گم ہو گئی ہے، دور، بہت دور چلی گئی ہے، کہیں ستاروں کے درمیان بیٹھی رو رہی ہے؟ اس کی آواز گم ہوئے ایک ہفتہ گزر گیا ہے۔۔۔ پہلے دن جب گلپر نے کسی کو نہیں پکارا تو گاؤں کے بچے اس کی کٹیا کے پیچھے جمع ہو گئے تھے۔ خشک اور ہیبت ناک بند دروازوں نے ان کی نگاہوں کا راستہ روک دیا تھا۔

دروازے پہ مُکے مارنے سے کچھ نہیں ہوگا، چلو پتھر مارتے ہیں۔'

آواز دیتے ہیں۔ مریم، تم سے آواز دو۔

لگتا ہے گھر پر نہیں ہے۔"

شاید بیمار ہو۔

پتھر مارو، مگر اس کی ماں کو پتا نہ چلے کہ ہم نے مارے ہے۔

وہ پتھر لے کر دروازے پر پل پڑے۔ یہاں تک کہ گلپر کے آنے کی چاپ سنائی دے گئی اور اس نے اپنے چھوٹے چھوٹے گدرائے ہوئے ہاتھوں سے دروازہ کھول دیا۔

آؤ گلپر، پرندے سب کمرے پر جمع ہو گئے ہیں۔

گلپر یوں کھڑی تھی جیسے خود کو تھامے ہوئے ہو۔ اس کے ہاتھوں میں چوڑیاں تھیں اور سفید پھول دار اسکارف سر پر بندھا ہوا تھا۔

بات یہ ہے کہ میں اب بڑی ہو گئی ہوں۔ اب تم لوگوں کے ساتھ نہیں کھیل سکتی۔

بڑی ہو گئی ہو؟ وہ کیسے؟

اماں کہتی ہیں اب مجھے گھر بار سنبھالنا چاہیے

Scanned with CamScanner

"کیوں؟ کیا وہ خود بیمار ہیں؟"

نہیں، ان کا گھر بار نہیں، اپنا گھر بار۔

"اپنا گھر بار؟"

ہاں، عمو ابراہیم چاہتے ہیں کہ وہ اپنا اور میرا گھر بسائیں۔

عمو ابراہیم؟'

ہاں، انھیں نے تو یہ چوڑیاں اور اسکارف خرید ہے۔ جوتے بھی خریدنے والے ہیں۔ امی کے لیے بھی، تاکہ ان کے پیروں پر چھالے نہ پڑیں۔

بچوں کے منہ حیرت سے مچھلیوں کے دہانوں کی طرح کھلے ہوئے تھے۔ باری باری چوڑیوں کو چھو کر دیکھ رہے تھے۔ ان کے چمک دار رنگ سے ان کی آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں۔

کتنی پیاری ہیں! اور اسکارف پر پھول بھی بنے ہوئے ہیں۔

"مگر مجھے یہ چوڑیاں پہن کر دکھاؤ۔"

"ابھی تھوڑی ہیں۔ صابن مل مل کر اتارنا پڑتا ہے۔ ورنہ نہیں اترتیں۔"

"کب دلوائیں؟"

کل رات۔ امی بھی ساتھ تھیں۔ اور ابھی ان سب چیزوں کے علاوہ تین سو تومان بھی دیں گے۔

وہ کس لیے؟'

وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ مجھے نہیں پتا۔ امی کو پتا ہے۔"

اور گڑیا؟ گڑیا بھی دلوائی ہے؟"

نہیں۔ کہہ رہے تھے تمھارے لیے گڑیا خود بناؤں گا۔

"وہ کیسے؟'

پتا نہیں۔ کہہ رہے تھے ذرا صبر کرو، باتیں کرنے والی گڑیا بنا کر دوں گا۔

ارے واہ! تم تو بہت خوش قسمت ہو!

پریشان مت ہو۔ میں ان سے کہوں گی کہ تمھارے لیے بھی ایک گڑیا بنا دیں۔ مگر امی کو پتا نہ چلے، کیوں کہ بڑے ہونے کے بعد گھر بار سنبھالنا پڑتا ہے۔ پھر کھیل کود نہیں سکتے۔۔۔ اب امی آ رہی ہیں۔ شام کے وقت آنا جب وہ روٹی پکا رہی ہوں۔۔۔ دیر سے آنا۔

کوئی دروازہ پیٹ رہا تھا، اس کا بدن زمین پر لوٹ رہا تھا۔ بکھرے ہوئے بالوں میں خاک بھر گئی تھی، اور دروازے کی درزوں میں سے مٹھیاں بھر بھر ریت کمرے کے اندر پھینک رہا تھا۔ لالٹین کا شعلہ شعلہ کانپ رہا تھا۔ مریم نے لالٹین کو دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔ لالٹین چھوٹی

Scanned with CamScanner

سی تھی اور شمار رہی تھی۔

بڑ بوں کتنی مشکل بات ہے۔ خدا کرے کوئی بڑ نہ ہو۔ خدا کرے عمو ابراہیم مر جائے، مر جائے تاکہ گلپر پھر سمندر پر آ سکے۔

وہ سب شام کے ستارے تک گلپر کے بغیر ساحل پر بیٹھے رہے۔ آبی پرندے بھی گھاٹ پر غمگین اور نقرئی مچھلیوں کے منتظر چکر کاٹ رہے تھے، جیسے گلپر کے نہ ہونے سے سمندر ان کے لیے اجنبی ہو گیا ہو۔

"مریم، چلو تیریں۔"

"نہیں، جی نہیں چاہ رہا۔

"دیکھو پرندے بھی آ گئے ہیں۔"

"نہیں، گلپر کوئی نہیں ہے۔"

جب شام ہوئی تو سب نے گلپر کو دیکھا۔ اس کی زمردی آنکھیں چمک رہی تھیں اور سات لمبی سنہری چوٹیاں اس کے شانوں پر جھوم رہی تھیں۔

"ارے۔۔۔ تم کب گئیں سمندر پر؟"

میں تو نہیں گئی۔ اماں نے گھر ہی پر میرا سر دھو دیا۔ دوپہر کو جب عمو ابراہیم آئے تو انھوں نے مجھے کنگھی عطا کر دی۔

اس نے انھیں اشارے سے اپنے بالوں میں پھنسی ہوئی سونے کے رنگ کی کنگھی دکھائی۔

عمو ابراہیم جو بھی کچھ لاتے ہیں ان میں سے ایک مجھے ضرور دیتے ہیں۔

"تم بڑی خوش قسمت ہو گلپر!

میں نے ان سے کہا ہے تمھارے لیے بھی لائیں۔

"پھر کب لائیں گے؟"

"جب ہماری شادی ہو گی۔"

"شادی؟ تم شادی کرنا چاہتی ہو؟"

"ہوں۔"

"شہنائی بھی لائیں گے؟"

"ہاں۔ اور سازندوں کو بھی لائیں گے۔"

ہونی اور گلپر کی فریادیں سن کر جو مل کر ایک ہو گئی تھیں، مریم دوبارہ بیٹھ گئی۔ اماں زور زور سے خراٹے لے رہی تھیں۔ عمو ابراہیم کی گھنی مونچھیں اور ان کے سینے پر گدا ہوا اژدہا اس کی نگاہوں کے سامنے سے دور ہی نہیں ہو رہا تھا۔

"گلپر تمھیں ڈر نہیں لگتا؟"

"ڈر کا ہے سے؟"

"اژدہے سے۔"

"ارے نہیں، وہ اژدہا تھوڑی ہے، تصویر ہے۔ میں نے تو اسے چھو کر بھی دیکھا ہے۔ وہ خود بھی کہہ رہے تھے۔ کہہ رہے تھے، 'جاؤ، ڈرو مت۔' پھر میں نے چھو کر دیکھا۔ کچھ بھی نہیں تھا۔"

"اور اُن کی مونچھیں؟ اُن سے بھی ڈر نہیں لگتا؟"

"نہیں۔ وہ ڈراونی تو نہیں ہیں۔ بہت اچھے ہیں وہ۔ اگلے سال وہ ہمیں مکان بھی بنوا دیں گے۔ پتھر کا مکان، جیسا تمہارا ہے۔ پھر جب ہماری شادی ہو جائے گی تو وہ اماں کو دوسروں کے لیے روٹیاں نہیں پکانے دیں گے۔ بس ہمارے لیے پکائیں گی۔ ممو براہیم بہت اچھے ہیں۔ مجھے ان سے ڈر نہیں لگتا۔"

ممو براہیم کو سب گاؤں والے پہچانتے تھے۔ ہر ہفتے اس کی موٹر سائیکل کی آواز سن کر سب چوک میں جمع ہو جاتے تھے۔ ممو براہیم اپنی موٹر سائیکل کے پیچھے بندھے ہوئے کیبن میں سے چیزیں نکال نکال کر لوگوں کو دکھاتا تھا۔ اس کا گریبان ہمیشہ کھلا رہتا تھا اور اژدہے کی لمبی نوک دار زبان دیکھ کر بچے موٹر سائیکل کے پاس سے بھاگ جاتے تھے۔

طوفانی ہوا غراتی ہوئی کواڑ کی درزوں میں سے مریم پر حملہ آور ہو رہی تھی۔ اسے لہروں کے شور سے ڈر لگ رہا تھا۔ اندھیرے میں پانی کا ظرف دیکھ دیکھ کر اسے پیاس لگ رہی تھی۔ وہ اٹھ کر ظرف کے پاس گئی، ٹٹول کر کٹورا ڈھونڈا۔ ظرف کے پاس ہی مٹھائیوں سے بھرا خوان رکھا تھا۔ اس نے وحشت زدہ ہو کر ہاتھ کھینچ لیا، کٹورا رکھا اور واپس پلٹ آئی جیسے مٹھائیوں میں سے خون کی بُو آ رہی ہو۔ بچے دوپہر ہی سے کٹیا کے آس پاس چکر کاٹ رہے تھے۔ گاؤں کے گھر سب کے سب خالی ہو گئے تھے اور عورتیں سج بن کر، ایک ایک کر کے آ پہنچی تھیں۔ شادی ہو رہی تھی اور نے نواز کی بانسری کی آواز دور دور تک پہنچ رہی تھی۔ عورتیں گیت گا رہی تھیں:

زندہ باد زندہ باد   زندہ تی شاہ داماد

شام ہوئی تو گلپر حجلے میں بیٹھ گئی۔ اس کے بالوں پر پیچھے کی طرف سبز رنگ کا پارچہ لپیٹ دیا گیا تھا۔ گلپر کی بھنویں باریک اور لمبی تھیں اور ہونٹوں پر گاڑھی چمک دار لالی تھی۔ اس کے ہونٹ ایسے سرخ سرخ تھے جیسے ان پر مرکیورو کروم لگا ہو۔ گلپر کی متعجب نگاہیں لوگوں کے ہجوم اور مٹھائیوں کے خوانوں کے درمیان گردش کر رہی تھیں۔ مہندی کے پیالوں میں شمعیں روشن تھیں۔ کہیں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ مریم بڑی مشکل سے جگہ بنا کر گلپر کے پاس پہنچی تھی۔ گلپر اسے دیکھتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اماں نے پیچھے سے اس کے ہاتھ کو ٹھوکا دیا تھا۔

"تم دلہن ہو، بیٹھ جاؤ۔"

"مگر مریم آئی ہے!"

Scanned with CamScanner

"عورت، بیٹھ جاؤ اپنی جگہ!"

گلپر کے چہرے پر تمام رنگ ایک ساتھ دوڑ گئے تھے۔ شاید وہ بھی تھی، کسی کھونٹے کی سی ہی، کسی ایسے بچے کے چہرے کی سی ہنسی جو چپکے بڑا ہو گیا ہو اور جان گیا ہو کہ اس کا اختیار دوسروں کے ہاتھ میں ہے۔ اب وہ مریم تک سے بات نہیں کر سکتی تھی، اور نہ لڑکیوں کے ساتھ مل کے باہر جا سکتی تھی کہ وہ دوڑ کر باہر جا کر شیریں کی سینیں اور میٹھی روٹیوں کے ٹکڑے کر کے مچھلیوں کے سامنے ڈال سکیں، نقرئی دموں والی اُن مچھلیوں کے سامنے جو جوٹی کے دریا کے کنارے کے پتھروں کے درمیان تیرا کرتی تھیں۔۔۔

ہوا اپنے گرد چکر کاٹتے ہوئے گزر رہی تھی۔ دریا کا بے پایاں شور دور دور تک گونج رہا تھا۔ دروازے بجنے کی آوازیں مریم کو ہراساں کیے دیتی تھیں۔ کوئی مہندی لگے ناخنوں سے دروازہ کھرچ رہا تھا۔

"مریم تمہارا جی کرتا ہے مہندی لگانے کو؟"

"نہیں۔"

"بھلا کیوں؟"

"تم اب سمندر پہ تو آتیں نہیں۔۔۔"

"نہیں نہیں، شادی پوری ہو جائے، پھر آؤں گی۔ کل ہی صبح آؤں گی۔ صبح ہوتے ہی تم سب کو جگا دوں گی۔ میں نے عموابریم کو بھی بتا دیا ہے۔"

عموابریم کتنا برا تھا! گلپر اس کی کمر تک پہنچتی تھی اور انا نے اس کا ہاتھ عموابریم کے ہاتھ میں دے دیا تھا، اور وہ اپنے سونے کے زرد دانت نکالے ہنس رہا تھا۔ شادی کا کچھ فائدہ نہیں۔ سوا اس کے کہ بچیوں کا کھیل ختم ہو جاتا ہے، آبی پرندے گھاٹ پر بیٹھے انتظار کرتے رہ جاتے ہیں، اور گلپر کے چہرے پر رنگ تھوپ دیے جاتے ہیں، اور رات کو جب سب چلے جاتے ہیں تو گلپر کی چیخیں سنائی دینے لگتی ہیں۔ مریم کی پلکیں بھاری ہونے لگیں، اس کے سر میں اندھیرا چکر کاٹ رہا تھا، وہ تھکن سے نڈھال ہو کر لیٹ گئی۔ کسی کے آنے کی چاپ سنائی دے رہی تھی، کوئی دوڑ رہا تھا۔ شاید بچے ٹھونسنے والے نے گلپر کو پہچان لیا ہو، شاید اس نے اپنے مچھلی پکڑنے کے کانٹوں جیسے ہاتھ بڑھا کر اسے اژدہے کے منہ سے باہر کھینچ لیا ہو اور اب اسے اٹھائے لیے جا رہا ہو۔ بچے اٹھانے والا اپنی پتلی اور لمبی ٹانگوں سے دوڑ رہا تھا وہ دوڑتا ہوا سمندر کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے گلپر کو بغل میں دبا رکھا تھا۔ گلپر کی آواز گھٹ سی گئی تھی۔ مریم نے گلپر کو آواز دی اور وہ بچے ٹھونسنے والے کی بغل سے نکل آئی۔ اس نے کسی آبی پرندے کی طرح پر پھیلائے، مریم کے گرد ایک چکر لگایا، گلپر کے پر خون آلود اور شکستہ تھے۔ مریم اس کے پر تھامنا چاہتی تھی، انہیں سمندر کے پانی سے دھو کر صاف کرنا چاہتی تھی۔ مگر گلپر نے اس کی طرف یوں دیکھا جیسے آبی پرندے

Scanned with CamScanner

دیکھتے ہیں، جیسے چھوٹی چھوٹی نقرئی مچھلیاں دیکھتی ہیں۔ مریم پر یک نگاہ ڈال کر وہ اوپر اٹھنے لگی، اس کے پر حرکت کرنے لگے اور وہ دور جانے لگی۔ مریم اس کے پیچھے دوڑی، بے تحاشا دوڑی مگر اسے پکڑ نہ سکی--- اس کے منہ سے چیخ نکلی: گلپر!--- گلپر!--- گلپر کے پر شکستہ تھے اور ان میں سے خون کے قطرے نیچے مریم کے چہرے پر گر رہے تھے۔

وہ چونک کر اٹھ بیٹھی۔ اس کا ہاتھ لالٹین پر لگا اور وہ الٹ گئی۔ اس کا شعلہ بھڑک کر بجھ گیا۔
ماں اور بابا خوف زدہ ہو کر دروازے کی طرف لپکے۔ باہر سے جو چیخ سنائی دے رہی تھی وہ گلپر کی نہیں تھی۔ مریم بھی سراسیمہ ہو کر باہر دوڑی۔ صبح کہر آلود اور زرد تھی۔ سب گلپر کے گھر کی طرف بھاگنے لگے۔ کٹیا پر پہنچے۔ گلپر کی ماں اس کے سفید، خون آلود پیراہن کو چہرے سے لگائے زور زور سے رو رہی تھی۔ دو آدمی چادر میں لپٹی ہوئی سی چیز کو باہر لا رہے تھے۔ گلپر کے سنہری بال چادر پر بکھرے ہوئے تھے۔ چادر کا نچلا حصہ خون میں تر تھا۔ عورتیں رو رہی تھیں اور رقص کر رہی تھیں، اور نا گلپر کے سکارف کی جھالر کو ہوا میں گھماتے ہوئے کسی دلہن کی رخصتی کا گیت گا رہی تھی۔

OO

(فارسی عنوان: "شبِ بلند")

فریدہ رازی

فارسی سے ترجمہ: نیر مسعود

بلی کا خون

اب میں اپنی بلی کے بدن پر نظر کرتی ہوں۔ کیسا سوکھ کر رہ گیا ہے! یہ مجھے اچھی لگ رہی ہے۔ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہی ہوں۔ کوئی خاص بات نہیں: وہ مر گئی، ہم دونوں کو چین پڑا۔

○ ○ ○

جب سے وہ اپنی موت کی طرف گھسٹ رہی تھی۔ اس کی میاؤں میاؤں سے پتا چلتا تھا کہ دکھ جھیل رہی ہے مگر ظاہر نہیں کرتی۔ اس کی گھٹی گھٹی پتلی آواز میں فریاد کی سی کیفیت آ گئی تھی۔ وہ سارے وقت کسی کونے میں سکڑی پڑی رہتی اور بھیگی بھیگی آنکھوں سے میری طرف دیکھا کرتی تھی۔ اس کی نگاہیں، غصے میں بھری، ٹٹولتی ہوئی نگاہیں، میری ہڈیوں کے گودے تک کو جلائے ڈال رہی تھیں۔

دن بہ روز وہ کمزور اور دبلی ہوتی جا رہی تھی۔ بال اس کے سوکھے ہوئے بدن پر چپک کر رہ گئے تھے اور ان کی آب جاتی رہی تھی۔ وہی بلی جو پہلے جب بھی دیکھ پاتی تو چیتے کی طرح جست بھرتی اور ایسا پھنکارتی کہ مجھ کو خوف آنے لگتا، اب ایسی بے جان ہو گئی تھی کہ میں اسے جتنا بھی چھیڑتی وہ شل پڑی رہتی یا میری طرف توجہ کیے بغیر اٹھ کر کسی اور گوشے میں پڑ رہتی۔

اس سے پہلے وہ مگن مست رہتی تھی۔ قالین پر لمبی لمبی لیٹ جاتی، نرم سفید سینہ ابھار ابھار کر سبز آنکھوں سے مجھ کو نوچتی تھی۔ چاہتی تھی میں اس کو گدگدا دوں، اس کا سینہ کھجاؤں اور وہ خرخر کرنا شروع کر دے۔ آنکھیں تنگ بنا کر میرے پیچھے پڑ جاتی کہ اس کے ساتھ کھیلوں۔ جب وہ ٹھیک تھی تو سوتے سمے ایک کنارے پھیل کر لیٹ جاتی اور خراٹے بھرا کرتی تھی۔ اس زمانے میں اس

Scanned with CamScanner

کے گدے جسم پر بھورے بھورے بال چمک مارتے تھے۔

اس کے گول منہ اور صاف ستھری مونچھوں سے خوشی برستی تھی؛ لیکن اب اسے دیکھ رہی ہوں تو جی مسلا رہا ہے۔ وہ گھل کر رہ گئی تھی۔ ہر وقت روتی رہتی تھی۔ میں اسے بہلانے کے لاکھ جتن کرتی، کوئی فائدہ نہ ہوتا تھا۔ نہ جانے کیوں اس کا کچھ دل ہی نہ چاہتا تھا۔ بس مجھے دیکھ کر رہ جاتی تھی۔ نہ کھانا پینا، نہ گھومنا پھرنا، نہ کھیلنا کودنا، کچھ نہیں۔

یہ سب گزشتہ سال بہار کے موسم میں شروع ہوا۔ کئی دن سے ایک سُرمئی بلا منڈیر پر آ کر میاؤں میاؤں کیا کرتا تھا، اور میری بلی کے کان پھڑکنے لگتے، بدن تن جاتا اور وہ لپک کر کھڑکی کے پاس پہنچ جاتی۔ میں دروازے بند رکھا کرتی تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو وہ باہر نکل جائے، پھر بچوں کا جھول چھوڑ دے تو میری مصیبت ہو جائے۔ لیکن ایک دن جو میں گھر لوٹی تو وہ غائب تھی۔ میں نے سب جگہ ڈھونڈھا، کہیں نہیں ملی۔ کئی دن بعد کھڑکی کے باہر اس کی آواز سنائی دی۔ میں نے دروازہ کھولا تو وہ جست مار کر اندر آ گئی اور مجھ کو نظر انداز کرتی ہوئی سیدھی باورچی خانے میں گھس گئی۔ معلوم ہوتی تھی بہت بھوکی ہے۔

وہ دُبلی ہو گئی تھی مگر چاق چوبند تھی۔ ہر چیز کے گرد گھومتی، جو پاتی کھا لیتی اور کسی گوشے میں پڑ کر سو رہتی۔ کچھ دن تک مجھ سے کھنچی کھنچی رہی لیکن رفتہ رفتہ اس کی پرانی عادتیں لوٹ آئیں۔ اب وہ مجھ سے کبھی کبھار کھیلنے لگی۔ صبح صبح میرے بستر پر آ جاتی اور میرے چہرے پر آہستہ آہستہ تھپکی مار کر مجھے جگا دیتی۔

یہاں تک کہ ایک دن پھر اسی سُرمئی بلے کی آواز سنائی دی۔ میری بلی کی آنکھیں چمکنے لگیں، بال کھڑے ہو گئے، اس نے انگڑائی سی لی اور اور اپنی جگہ پر چکر کاٹنے لگی۔ پھر دونوں نے کھڑکی کے آر پار سے کھیلنا شروع کیا۔ سُرمئی بلے کی سبز سبز آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اس کے بھورے بھورے نرم بال تھے اور چھوٹا سا گول منہ بھلا لگتا تھا۔ دونوں دیر تک اپنے کھیل میں مست ایک دوسرے کو گھورتے، میاؤں میاؤں کرتے، غراتے رہے، پھر تھک کر کھڑکی کے قریب پڑ رہے اور آہستہ آہستہ دُمیں ہلانے لگے۔

آخر میری بلی سے نہ رہا گیا، دھیرے دھیرے چلتی ہوئی میرے پاس آئی، کود کر میرے زانو پر بیٹھ گئی، چاپلوسی شروع کر دی۔ اس کی جو جو ادائیں مجھے پسند تھیں، سب اس نے دکھائیں۔ سر میری گردن سے رگڑا، آنکھیں میچ کر زمین پر لوٹیں لگائیں، لیکن میں ذرا سی نہ پسیجی کیوں کہ میں خوب سمجھ رہی تھی وہ کیا چاہتی ہے۔ میں نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اچانک وہ اُچھل کر پیچھے ہٹ گئی اور میرے سامنے کھڑے ہو کر پھنکارنے لگی۔

سُرمئی بلا دیر تک کھڑکی کے پیچھے میاؤں میاؤں کرتا رہا، آخر وہاں سے چلا گیا، لیکن میری بلی صبح تک کھڑکی کے سامنے بیٹھی رہی۔

Scanned with CamScanner

میں نے سوچا کوئی بات نہیں، کچھ دن میں معمول بحال ہو جائے گی اور وہ بھی اپنے گھر لوٹ جائے گا۔ لیکن ایک رات جب میں گھر آئی تو دیکھا سرمئی بلا کھڑکی کے پیچھے بیٹھا ہے اور دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں۔ مجھے تاؤ آ گیا، ڈپٹ کر اس کی طرف لپکی اور وہ بھاگ گیا۔ میری بلی نے ناچ ناچ کر میاؤں میاؤں کرنا شروع کر دیا، پھر پنجوں سے دروازہ کھرچنے لگی۔ میں اسے چھوڑ کر اپنے کام میں لگ گئی۔ کئی دن تک میں نے نگرانی رکھی کہ دروازہ بند رہے اور وہ بھاگنے نہ پائے۔ میری بھی مرضی تھی، وہ میری بلی تھی۔

ایک دن پھر شام کے وقت سرمئی بلا احاطے میں نظر آیا۔ میں بھنا کر رہ گئی۔ لکڑی اٹھا کر میں نے احاطے بھر میں اس کو پیٹا اور مار مار کر باہر نکال دیا۔ واپس آئی تو میری بلی چیتے کی طرح میرا راستہ روکے کھڑی تھی۔ میں جدھر بھی مڑتی وہ اچھل کر ادھر آ جاتی۔ بری طرح بھڑکی ہوئی تھی۔ اس کی انگارے برساتی ہوئی آنکھیں پھیل کر دگنی ہو گئی تھیں، تنا ہوا منہ بھیانک ہو رہا تھا۔ میں نے اسے ٹھنڈا کرنے کی سبھی ترکیبیں آزما ڈالیں لیکن وہ اپنے آپے میں نہیں تھی۔ آخر وہ مجھ پر جھپٹ پڑی۔ میری گردن میں لپٹ کر اس نے اپنے نکیلے دانت میرے چہرے میں اتار دیے۔ میری سانس رکی جا رہی تھی۔ میں خوف زدہ ہو کر چیخنے لگی یہاں تک کہ کسی نے مدد کو آ کر اسے ہٹایا۔ میں نے برے حالوں کمرے کے اندر گھس کر دروازہ بند کر لیا۔ میری بلی نے بغاوت کر دی تھی، میرے خلاف اور میرے ظلم کے خلاف۔

صبح تک وہ دالان میں روتی پھری۔ میں نے اسے نکلنے کا موقع نہیں دیا۔ اس کے بعد سے وہ روزانہ رات بھر کھڑکی سے لگی بیٹھی رہتی، مگر سرمئی بلے کا کہیں پتا نہ تھا۔ میں نے اس کے لیے بہترین کھانے تیار کیے، جو جو اسے بھاتا تھا سب دیا، لیکن اس نے کسی چیز کو منہ نہیں لگایا۔ میں اس کے جتنے لاڈ کرتی تھی اتنی ہی وہ ضدی اور چڑچڑی ہوتی گئی۔ میں نے اسے کھلی چھوٹ دے دی کہ جن جگہوں پر اس کو پاؤں دھرنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی وہاں جا کر سوئے، لیکن وہ روز بہ روز نڈھال ہوتی جا رہی تھی۔

ایک دن پڑوس کے کوٹھے پر کسی بلی کی آواز سن کر وہی میری بلی جو بہ مشکل خود کو ایک سے دوسرے کمرے تک گھسیٹ کر لے جاتی تھی اور جس کے اندر کچھ نہیں رہ گیا تھا، اچانک اس طرح چھلانگ مار کر کھڑکی سے باہر کودی کہ ٹانگ توڑ بیٹھی اور فریادیوں کی طرح گلی میں رونے لگی۔ میں اسے گھر میں اٹھا لائی۔ بہت دن میں جا کر ٹھیک ہوئی لیکن لنگڑانے لگی۔ کوشش بے کار تھی۔ وہ بدل چکی تھی اور اب میرا بھی حوصلہ جواب دینے لگا۔ اس کی سسکیوں، اس کی چیخوں، اس کی بدمزاجی، اس کی خستہ حالی سے میرا ناک میں دم تھا۔ اس کا ایک کونے میں مرے ہوئے چوہے کی طرح پڑے رہنا مجھے دق کیے دے رہا تھا۔ میں سمجھتی تھی، اچھی طرح سمجھتی تھی کہ وہ دکھ جھیل رہی ہے اور گھل رہی ہے۔ میں اس کے قریب جاتی تو اس کی آنکھیں پتھرا کر گھورنے لگتیں، وہ سر

اٹھاتی، کچھ دیر تک پلکیں جھپکاتی، پھر گردن ڈال دیتی اور سو جاتی۔

o o o

کل ایک بلی کی آواز سنائی دی۔ میں نے کھڑکی کھول دی کہ اس کا جی چاہے تو باہر چلی جائے۔ اس نے سر اٹھایا، کان ہلائے، مونچھیں سیدھی کیں اور کھڑکی کی جانب دیکھا۔ پھر اس کی تھکی تھکی بجھتی ہوئی نگاہیں مجھ پر جم گئیں۔ اس نے کئی بار فریاد کے انداز میں میاؤں میاؤں کی، دانت نکوسے اور دوبارہ سو گئی۔ اور آج میں نے اس کو مار ڈالا۔

oo

(فارسی عنوان: "گربہ ام را کشتم")

یہ مضمون ڈاکٹر نیر مسعود کے اس تعارف کی مکمل صورت ہے جو ان کے کیے ہوئے فارسی کہانیوں کے
ترجموں پر مشتمل مجموعے ایرانی کہانیاں میں مقدمے کے طور سے شامل ہوگا۔ یہ کتاب اسی سال ہندوستان
میں شائع ہونے والی ہے۔ ان تیرہ کہانیوں کے علاوہ جو اس شمارے کا حصہ ہیں، سات اور کہانیاں بھی شامل ہوں
گی۔ ان سات میں سے چار کہانیاں آج کے پچھلے شماروں میں بھی شائع ہو چکی ہیں: ...رے ... مقدم ...
۱۹۹۹ میں، اور ... (منوچہر خسروشاہی)، ... اور ... (... مقدم) اور ... احسان سیر صادق،
خزاں ۱۹۹۰ میں۔ ان کہانیوں سے ... مسعود کی ... ہے۔ ۱۹۶۹ میں ... سے
... لکھنؤ ... شمیم ... کی کہانی ... عشق کا ترجمہ کیا، ... کے نقوش سے ... (...
... کے پچھلے ... ہے۔ ۱۹۷۱ میں ... مقدم کی کہانی ... کا ترجمہ (...) ...
... میں شائع ہوا۔ ... حسین ... کے ... کا ترجمہ (...) ...
... کہانیوں میں ان کے علاوہ ... صادق ہدایت کی کہانی ... کا ترجمہ (... قیدی)
بھی شامل ہوگا۔

نیر مسعود

فارسی کہانی: ایک مختصر تعارف

عربی ادب میں خیالات کے اظہار اور مفہوم کی وضاحت کے لیے مختصر کہانی سے کام لینے کی روایت زیادہ تر ہندوستان کی مرہونِ منت ہے۔ پنچ تنتر کے پہلوی اور فارسی ترجموں نے اس روایت کو مستحکم کیا اور اس کے بعد سے فارسی کی غیر افسانوی تالیفوں میں بھی حکایتوں کا استعمال کثرت سے ہونے لگا۔ قابوس نامہ، مرزبان نامہ، سیاست نامہ وغیرہ حکایتوں کے اہم خزانے اور گلستان اور اخلاقِ محسنی وغیرہ ان کا نقطۂ عروج ہیں۔ اخلاقِ محسنی کے مصنف ملا حسین واعظ کاشفی نے پنچ تنتر کی کہانیوں کو انوارِ سہیلی کے نام سے رنگین فارسی نثر میں لکھا جس کا اردو میں سب سے اچھا ترجمہ فقیر محمد خاں گویا نے بستانِ حکمت کے نام سے کیا۔ اخلاقِ محسنی اور گلستاں وغیرہ کے بھی اردو میں ترجمے ہوئے۔ ان کتابوں کے اثر سے اردو میں بھی کہانی کا رواج عام ہوا؛ گویا ہندوستانی کہانی ایران کا چکر لگا کر ہندوستان کی اردو میں واپس آ گئی۔

o o o

بیسویں صدی آتے آتے روایتی حکایتوں کا زمانہ ختم ہوا اور ان کی جگہ نئے طرز کے مختصر افسانے نے لے لی۔ ایران میں میر محمد حجازی اس نئے دور کا سب سے ممتاز ناول نویس اور افسانہ نگار تھا۔ حجازی اور اس کے ہم عصر پیچ اور ابہام سے خالی، خطِ مستقیم پر بڑھنے والے، جذبات آمیز اور پُر اثر افسانے لکھتے تھے جن کا مرکزی خیال بہت واضح ہوتا تھا، بلکہ کبھی کبھی تو یہ افسانہ نگار افسانے کے آخری حصوں میں اس کے مرکزی خیال یا افسانے سے برآمد ہونے والے نتیجے کی نشان دہی بھی کر دیتے تھے (یہ غالباً حکایتوں کا بچا کھچا اثر تھا)۔

حجازی وغیرہ فارسی فکشن کے اس جدید دور کے نمائندے تھے جس کے آغاز سے پہلے ہی اردو ادب اپنے معاصر ایرانی ادب سے بے نیاز، اور شاید بے خبر بھی، ہو چکا تھا۔ اسی لیے اردو کے بیش تر مصنف

Scanned with CamScanner

نے اپنے سامنے ایرانی فارسی مصنف کو ماڈل کے طور پر رکھا تھا لیکن اب وہ اپنے طور پر آگے بڑھ رہا تھا، یا یہ ماڈلوں کے لیے ایران کے بجائے مغرب کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ اردو فکشن کے سامنے سے بھی ایرانی ماڈل ہٹ گیا تھا، لیکن دورِ جدید کے ان ابتدائی مرحلوں میں بھی اردو اور فارسی فکشن ایک دوسرے سے بہت زیادہ مختلف نہیں تھے، اس لیے کہ اب دونوں کے سامنے فکشن کا مغربی ماڈل آ گیا تھا جس کے زیرِ اثر دونوں زبانوں کے افسانوی ادب میں غیر معمولی اور تیز رفتار پیش رفت شروع ہو گئی تھی۔ ایران میں اس پیش رفت کی اہم ترین علامت صادق ہدایت ہے۔

صادق ہدایت ایرانی فکشن کا سب سے بڑا نام ہے۔ اس نے مغربی ادبیات کا وسیع مطالعہ اور کئی ملکوں کی سیر کی تھی۔ اسی کے ساتھ اس کو قدرت کی طرف سے قصہ گوئی کی زبردست صلاحیت ملی تھی۔ بوف کور (اندھا الو) اس کا شاہکار ناولٹ (یا طویل افسانہ؟) ہے جس نے مغربی دنیا کو بھی اس قدر متاثر کیا کہ مائیکل بیرڈ (Michael Beard) نے ایک پوری کتاب Hedayat's Blind Owl as a Western Novel لکھی اور اس میں اس کے تفصیلی تجزیے کر کے اس نتیجے پر پہنچا کہ بوف کور صرف فارسی نہیں بلکہ عالمی ادب میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہدایت ہندوستان اور اس کی روایات سے خاصا متاثر تھا جس کا اظہار اس کی تحریروں میں بھی ہوا ہے۔ بوف کور کا مرکزی کردار بنارس کے ایک مندر کی رقاصہ کا بیٹا ہے اور اس انوکھی داستان میں ہندوستان ایک پراسرار سرزمین کے طور پر ابھرتا ہے۔ فرانسیسی زبان میں بھی ہدایت کی ایک کہانی Lunatique کا محلِ وقوع بمبئی اور کردار ہندوستانی ہیں۔ اس کہانی میں ہدایت نے کچھ مکالمے اردو زبان میں بھی لکھے ہیں۔

ہدایت نے کافکا، سارتر وغیرہ کے فارسی میں ترجمے بھی کیے اور اس کو صحیح معنی میں ایرانی فکشن کی عہد ساز شخصیت کہا جا سکتا ہے۔ اور یہ شخصیت جنون کی حد تک غیر معتدل اور نفسیاتی الجھنوں سے بھری ہوئی تھی۔ یہ شخصیت بہ آسانی مریضانہ بھی ہو سکتی تھی، اور اس کے افسانے اسی شخصیت کا نقش ہیں۔ یہ فارسی افسانے کے حق میں نیک فال تھی، اس لیے کہ ابھی تک یہ افسانہ معتدل اور صحت مند ذہنوں کے قبضے میں تھا۔ ہدایت کی قلم رو میں پہنچ کر اس نے ایسے ایسے روپ اختیار کیے جن سے فارسی ادبیات کی رچی ہوئی روایت کا تربیت یافتہ ذہن مانوس نہیں تھا لیکن مانوس ہونے پر تیار تھا، اور مانوس ہوا۔ اور دیکھتے دیکھتے فارسی افسانے کا افق وسیع ہونے لگا۔ لیکن خود ہدایت اپنی شخصی الجھنوں اور افتادِ طبع کے جال میں پھنستا چلا گیا۔ اس نے کئی مرتبہ خودکشی کی کوشش کی اور آخر گیس سے اپنا دم گھونٹ کر مرنے میں کامیاب ہو گیا۔ سینتالیس اڑتالیس سال کی عمر میں اس کا اس طرح اٹھ جانا ایرانی ادب کا بڑا سانحہ تھا، لیکن وہ ایرانی زبان کو فکشن کا جو معیار دے گیا اس کے اثر سے ایران میں عمدہ افسانہ نگاروں کی ایک پوری کھیپ تیار ہو گئی۔ ایرانی رسالوں، خصوصاً سخن وغیرہ میں تکنیک کے تجربوں اور اچھوتے موضوعات والے افسانوں کو بطورِ خاص جگہ دی جانے لگی۔ اس خصوص میں مجلہ سخن، تہران، قابلِ ذکر ہے جس میں تواتر کے ساتھ بہت اچھے فارسی افسانے شائع ہوتے رہے۔ جمال میر صادقی، عباس حکیم، بابا مقدم، غلام حسین ساعدی، غلام حسین نظری وغیرہ سخن کے مستقل لکھنے والے تھے جن میں کئی کے تراجم مغربی زبانوں میں بھی ہوئے۔ ان کے علاوہ جلال آلِ احمد، ان کی بیوی سیمین دانشور، صمد بہرنگی وغیرہ کو بھی

مغرب کے اعتنا کی نظر سے دیکھا۔ منیرُو روانی پور، اسماعیل شاہرودی، محسن دامادی، فریدون تنکابنی اور متعدد دوسرے افسانہ نگاروں نے بھی فارسی فکشن میں اپنے انفرادی نقوش قائم کیے۔

○ ○ ○

جدید فارسی افسانے کے مقابل جب ہم اپنے اردو افسانے کو رکھتے ہیں تو دونوں میں مماثلتیں، مغائرتیں کم نظر آتی ہیں۔ فنی حرکت کے لحاظ سے بھی اردو افسانہ فارسی افسانے سے پیچھے نہیں ہے، لیکن فارسی افسانوں میں تنوع اردو افسانوں سے شاید کچھ زیادہ نکلے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ایرانی افسانہ نگار ہمارے مقابلے میں عالمی ادبیات سے زیادہ آشنا ہیں۔ اہلِ ایران مغربی فکشن کے قریب قریب ہر شاہکار کو، اور دوسرے ملکوں کے بھی اہم افسانوں کو، اپنی زبان میں منتقل کر لیتے ہیں (اردو افسانہ نگاروں میں بھی پریم چند، کرشن چندر، مدن تین راؤ وغیرہ کی بعض چیزوں کے فارسی ترجمے چھپے ہیں)۔ ترجمے کے میدان میں وہ ہم سے بہت آگے ہیں، اور جب ایران کے مقابلے میں ہم اپنے یہاں تراجم کی صورت حال پر نظر کرتے ہیں تو سخت احساسِ کمتری پیدا ہوتا ہے۔ تراجم سے اس غیر معمولی شغف کا مثبت اثر لازماً ایرانی فکشن پر اردو سے زیادہ پڑا ہے۔

فارسی اور اردو افسانے میں سب سے زیادہ فرق استعمالِ زبان کا نظر آتا ہے۔ ایرانی افسانہ نگار بول چال کی زبان اور عوامی تلفظ کو ہم سے بہت زیادہ بے تکلفی کے ساتھ تحریر میں لاتے ہیں۔ وہ الفاظ کی لغوی ہیئت کے علاوہ اُس ہیئت کو بھی استعمال کرتے ہیں جو زبان سے ادا ہوتی ہے، مثلاً 'میشود' کی جگہ 'میشہ'، 'بیاید' کی جگہ 'بیان'، 'را' کی جگہ صرف 'و' کی آواز۔ ہمارے یہاں "حضرت" کی جگہ "حضَت" کے قبیل کی مثالیں خال خال ملیں گی، لیکن فارسی افسانوں میں محلی لہجوں اور لغاتِ عامیانہ کا استعمال اتنا عام ہے کہ اُن کی فرہنگیں تیار کر لی گئی ہیں۔ اور زبان کے ساتھ یہ آزادانہ روِش اُن کے یہاں صرف مکالموں تک محدود نہیں ہے بلکہ اس انداز کے بیانیے کے ساتھ پورے پورے افسانے لکھے جا رہے ہیں۔

فارسی افسانوں کو پڑھتے ہوئے یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ ایرانی افسانہ نگار فطرت سے جتنے قریب ہیں اتنے ہم نہیں ہیں۔ موسموں اور فضاؤں کی کیفیت کا بیان اُن کے یہاں بہت جان دار ہوتا ہے اور یہ عناصر اُن کے افسانے میں اہم کردار بھی ادا کرتے ہیں۔ درختوں میں بھی ایرانی افسانہ نگاروں کی دلچسپی ہم سے زیادہ ہے۔ بابا مقدم کے افسانوں میں "کاشمَر" (مُردہ سانپ) کا دارزعفران، "گلہای زرد و کلشہای میخدار" کا گھنا درخت، منوچہر خسروشاہی کے "نرگس" کا کیڑوں بھرا درخت اور دوسرے بہت سے افسانوں کے پیڑ پھول پودے انسانی کرداروں سے کم اہمیت نہیں رکھتے۔

فطرت سے اسی علاقہ مندی کا اثر یہ بھی ہے کہ ایران کے افسانہ نگاروں کے یہاں جانور ہمارے یہاں سے زیادہ ملتے ہیں۔ اُن کے یہاں ہمارے رفیق حسین کا جواب تو پیدا نہیں ہو سکا، لیکن جانوروں کو مرکزی کردار بنا کر لکھے جانے والے افسانے فارسی میں اردو سے بہت زیادہ ہیں۔ صادق ہدایت کا "سگِ ولگرد" ("کتّا آوارہ") عالمی شہرت کا افسانہ ہے۔ صادق چوبک کا "انتر، سگِ من" اس سے بھی کچھ بہتر افسانہ ہے۔ فریدہ رازی کے "گربہ ام را کشتم" (بلی کا خون) اور ہدایت کے "سہ قطرہ خون" میں بلی کو افسانے کا اہم کردار بنایا گیا ہے۔ بابا مقدم کے "باران و اشک" (بارش اور آنسو) میں گھوڑے اور

Scanned with CamScanner

قصے ("پیکرے") میں پڑھے، عمدہ ایرانی افسانوں کے اصلی کرداروں کی طرح نظر آتے ہیں۔ اس لحاظ سے، اور عمومی طور پر بھی، ایرانی افسانوں کا مطالعہ اردو کے قارئین اور افسانہ نگاروں کے لیے دلچسپی اور فائدے سے خالی نہیں، اس لیے ضروری ہے کہ فارسی کے عمدہ اور زیادہ سے زیادہ افسانوں کو اردو میں منتقل کیا جائے۔

o o o

اردو میں فارسی افسانوں کے ترجموں کی تعداد اطمینان بخش نہیں ہے۔ صادق ہدایت کے ترجمے نسبتاً معقول تعداد میں ہوئے ہیں اور ان کا ایک مجموعہ بھی "سگِ آوارہ" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ سید حامد حسن قادری مرحوم نے بھی فارسی افسانوں کے تراجم کا ایک مجموعہ شائع کیا۔ کچھ ترجمے وقتی ضرورتوں کے تحت بھی ہوئے، لیکن حقیقت یہی ہے کہ اردو میں ترجمے کے ذریعے فارسی افسانوں کی نمائندگی اتنی نہیں ہوئی جتنی ہونی چاہیے تھی۔ زیرِ نظر مجموعہ اسی کمی کی تلافی کی ایک کوشش ہے جس کی تحریک میرے کچھ عزیز دوستوں کی طرف سے ہوئی تھی۔

ترجمے کے لیے افسانوں کے انتخاب میں صرف یہ معیار پیشِ نظر رکھا گیا ہے کہ افسانہ اچھا ہو اور اس کا ترجمہ نسبتاً آسان ہو۔ کئی بہت اچھے افسانے محض مترجم کی کم استعدادی کی وجہ سے انتخاب میں شامل نہ ہو سکے۔ ان مجموعوں میں ساعدی کا افسانہ "فقیر" (روضۂ سوالی) بھی تھا جسے چھوڑنے پر میرا دل راضی نہ ہوتا تھا، لیکن فارسی افسانوں کی جس خصوصیت یعنی بول چال کی زبان کا اوپر ذکر آیا، وہ ترجمے کی راہ میں حائل تھی۔ کسی طرح افسانے کا ترجمہ تو کر لیا لیکن بیس پچیس تیس لفظ اور فقرے ایسے باقی رہ گئے جن کا مطلب ڈکشنریوں کی ورق گردانی سے بھی حل نہیں ہوا۔ اپنے ایرانی دوست آقائے ابراہیم حسنی کا ممنون ہوں کہ ان کی مدد سے آخر یہ مشکل آسان ہوئی۔

فارسی کی ان کہانیوں کو اردو روپ دینے میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ ترجمے کی زبان اردو محاورے کے مطابق ہو، مگر اتنی مطابق بھی نہ ہو کہ ایرانی کہانی پر ہندوستانی کہانی کا گمان گزرنے لگے۔

OO

لکھنے والوں کا تعارف

صادق ہدایت

اگرچہ مختصر افسانے کی مغربی صنف سے ایرانی قارئین کو متعارف کرانے کا سہرا محمد علی جمال زادہ (پ ۱۸۹۲) کے سر ہے، جس نے برلن سے نکلنے والے فارسی ماہنامے "کاوہ" میں اپنی اولین کہانیاں شائع کیں اور پھر ان کا پہلا مجموعہ "یکی بود یکی نبود" بھی برلن ہی سے ۱۹۲۱ میں شائع ہوا، لیکن صادق ہدایت کو مستقل طور پر فارسی فکشن کا پہلا بڑا نام سمجھا جاتا ہے۔ ہدایت ۱۹۰۳ میں تہران کے ایک معزز اور متمول گھرانے میں پیدا ہوا اور وہاں کی اعلیٰ ترین درسگاہوں میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۲۶ میں اسے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے یورپ بھیجا گیا لیکن اس نے اپنے چار سالہ قیام کو درسی تعلیم کی نذر کرنے کے بجائے یورپی ادب اور آرٹ سے شناسائی پیدا کرنے میں صرف کیا۔ وہ ۱۹۳۰ میں تہران واپس آیا اور اس کے کچھ ہی عرصے بعد اس کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ "زندہ بگور" شائع ہوا۔ ۱۹۳۰ سے ۱۹۳۴ تک کا زمانہ ہدایت کی ادبی زندگی کا سب سے زیادہ ثمر آور دور تھا۔ یہ زمانہ ایران میں سیاسی اور معاشرتی اعتبار سے بڑی تبدیلیوں کا تھا۔ بیسویں صدی کے آغاز پر شروع ہونے والی دستوری اصلاحات کی تحریک ۱۹۲۱ میں اپنے مقاصد حاصل کرنے میں ناکام رہ کر ختم ہو چکی تھی اور رضا شاہ کی آمرانہ بادشاہی کی گرفت مضبوط ہو رہی تھی۔ مگر مغربی فکر سے آشنائی ایرانی معاشرے کی بظاہر پرسکون سطح کے نیچے بڑی ہلچل پیدا کر رہی تھی۔ تہران لوٹنے کے بعد ہدایت کو چند ہم مذاق دوستوں کا ساتھ میسر آیا جن میں بزرگ علوی، مسعود فرزاد اور مجتبیٰ مینوی شامل تھے۔ یہ چاروں دوست۔۔۔ جنھیں فرزاد نے [illegible] "ربعہ" کا نام دیا، اور یہ نام تہران کے ادبی حلقوں میں کسی حد تک مشہور بھی ہوا۔۔ ہر روز شام کا وقت کیفے میں گزارتے اور کتابوں اور خیالات کا آپس میں تبادلہ کرتے۔ مگر ہدایت طبعاً تنہا اور قنوطی تھا اور عملی سیاست میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا تھا جبکہ اس کے ساتھی سیاسی طور پر سرگرم تھے۔ آخر ۱۹۳۷ میں بزرگ علوی کے قید کر دیے جانے کے بعد یہ گروپ منتشر ہو گیا۔ چار سال کے اس عرصے میں ہدایت کی کہانیوں کے چار مجموعے "سہ قطرہ خون" (۱۹۳۲)، "سایہ روشن" (۱۹۳۳)، "وغ وغ ساہاب" (۱۹۳۳) اور "سگ ولگرد" (۱۹۴۲)، ایک طویل کہانی "علویہ خانم" (۱۹۳۳) اور ناول "بوف کور" (۱۹۳۷) شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ اس نے مختلف دوسرے موضوعات پر بھی کتابیں لکھیں جن میں تاریخی ڈرامے، طنزیہ خاکے (قصیے)، تنقیدی مقالے اور مغربی زبانوں کے فکشن کے ترجمے شامل ہیں۔ ہدایت نے کافکا کی شاہکار کہانی

Scanned with CamScanner

Metamorphosis کا ترجمہ "مسخ" کے نام سے کیا اور اس کے بارے میں ایک طویل تنقیدی مضمون بھی لکھا۔ کافکا کے علاوہ خیام سے بھی اس کو ایک طبعی مناسبت تھی۔ اس کے بارے میں ہدایت کا ایک طویل مقدمہ "ترانہ ہائی خیام" کے نام سے رباعیات خیام کے ایک نئے ایڈیشن میں مقدمے کے طور پر چھپا اور اس مقالے نے خیام کے مطالعے میں ایک سنگ میل کی حیثیت اختیار کر لی۔

ہدایت کی شخصیت کا ایک اہم پہلو اس کا قدیم فارس کی تہذیب سے گہرا لگاؤ ہے۔ یورپ سے واپسی پر اس نے پہلوی زبان کی باقاعدہ تحصیل کی اور کئی قدیم زرتشتی مخطوطوں کو فارسی میں منتقل کیا۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۹۳۷ کے لگ بھگ ہندوستان کے سفر کے دوران اس نے بمبئی کے پارسیوں سے قدیم زرتشتی صحیفوں کا درس لیا تھا۔ وہ فارس کی ماقبلِ اسلام تہذیب کا بہت گرویدہ تھا اور ایران میں اسلام کی آمد کو عرب فتوحات کا نتیجہ اور ایرانی تمدن میں ایک خارجی عنصر کی آمیزش خیال کرتا تھا۔ اس کے تاریخی ڈرامے "پروین دختر ساسان" اور "مازیار" اس کے اسی جذباتی لگاؤ کا اظہار ہیں اور ادبی اعتبار سے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے۔ اپنے زمانے کی مذہبی رسومیات پر اس کی شدید طنز آمیز تحریر "توپ مرواری" اس کی زندگی میں شائع نہ ہو سکی۔ یہ کتاب ۱۹۹۰ میں سویڈن سے شائع ہوئی۔

۱۹۴۱ میں دوسری جنگ عظیم کے دوران ایران پر اتحادی فوجوں کے تسلط اور رضا شاہ کی سبکدوشی کے بعد بیرونی طاقتوں کی مرضی سے اس کا بیٹا محمد رضا پہلوی تخت نشین ہوا۔ تب سے لے کر ۱۹۵۳ تک کا زمانہ ایران میں فکر اور تحریر کی نسبتاً آزادی کا تھا۔ مگر اس وقت تک ہدایت اپنے یاس آمیز طرز احساس کے باعث اپنے گرد کی ہر چیز سے متنفر ہو چکا تھا۔ تب سے لے کر اپنی موت تک کے عرصے میں ہدایت کی کہانیوں کا صرف ایک مجموعہ "ولنگاری"، ایک طویل کہانی "حاجی آقا" اور چند طنزیہ خاکے شائع ہوئے۔

زندگی سے بیزاری، موت کی کشش اور خودکشی کا میلان ہدایت کی کھلی شخصیت کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ پیرس میں اپنے اوّلین قیام کے دوران اس نے دریائے سین میں کود کر جان دینے کی کوشش کی تھی، اور ایک اور موقعے پر تریاق کھا کر۔ اس تاریک طرزِ احساس کی وجہیں اس کے ذاتی احوال میں بھی تلاش کی گئی ہیں اور اپنے وقت کے ایرانی معاشرے سے اس کی عدم مناسبت میں بھی۔ وہ رفتہ رفتہ ایران میں جینے مرنے سے بالکل بیزار ہو چکا تھا اور ادب سے مسرت اٹھانے کی حس بھی کھو بیٹھا تھا۔ اس نے ہندوستان میں جا بسنے کا ارادہ کیا لیکن چند مہینوں سے زیادہ وہاں نہ رہ سکا۔ ۱۹۵۰ میں وہ فرانس چلا گیا اور اپریل ۱۹۵۱ میں پیرس میں گیس سے دم گھونٹ کر خودکشی کر لی۔

صادق ہدایت نے فارسی میں اپنے بعد آنے والے افسانہ نگاروں پر گہرے اثرات مرتب کیے اور اس صنف کی جڑیں فارسی ادب میں مضبوط کرنے میں اس کا بہت اہم حصہ ہے۔ ہدایت نے زبانِ عامیانہ کو ادبی مقصد کے لیے کام میں لانے کی طرح ڈالی جو ایک ادبی انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

صادق ہدایت کے معروف ناول "بوف کور" اور منتخب کہانیوں کا بہت سی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اردو میں ملک حق محمود نے ہدایت کی کہانیوں کا انتخاب اور ترجمہ کیا جسے کتاب کی صورت میں "سنگ آورد" کے عنوان سے ۱۹۷۸ میں لاہور سے سلک بک سروس نے شائع کیا۔ یہ کتاب غالباً اس

Scanned with CamScanner

کے بعد شائع نہیں ہوئی اور اب نایاب ہے۔ ہدایت کی کہانیوں کے جو دو ترجمے موجودہ شمارے میں شامل ہیں اسی کتاب سے لیے گئے ہیں۔ بوفِ کور (ترجمہ: اجمل کمال) ۱۹۸۴ میں آج کی کتابیں، کراچی کے زیرِاہتمام شائع ہوا۔

○ ○ ○

بزرگ علوی

بزرگ علوی کو بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے ادیبوں میں سے ایک سمجھا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ ایرانی حکومت کی عائد کی ہوئی سنسر کی پابندیوں کا نشانہ سب سے بڑھ کر اسی کی تحریروں کو بننا پڑا۔ علوی ۱۹۰۴ میں تہران میں پیدا ہوا۔ اس کا دادا ایک خوشحال تاجر تھا اور دستوری تحریک کا حامی تھا۔ اس کے باپ نے انھیں خیالات کے سبب جمہوریت خواہوں کے گروہ میں شمولیت اختیار کی۔ یہ جماعت ایران میں برطانوی اور روسی موجودگی کی مخالف تھی اور اس سے وابستگی کی پاداش میں اس کے بہت سے ارکان کو، جن میں بزرگ علوی کے باپ مرتضیٰ کے علاوہ محمد علی جمال زادہ اور حسن تقی زادہ جیسی شخصیتیں شامل تھیں، پہلی جنگِ عظیم کے دوران ترکِ وطن کر کے جرمنی جانا پڑا۔ جمال زادہ نے کچھ اور دوستوں کے ساتھ مل کر برلن سے ایک ماہانہ رسالہ کاوہ جاری کیا۔ جنگ ختم ہونے کے بعد یہ گروہ منتشر ہو گیا؛ کچھ لوگ ایران لوٹ گئے، کچھ دوسرے ملکوں کو چلے گئے اور مرتضیٰ نے وہیں رہ کر تجارت کا پیشہ اختیار کر لیا۔ ۱۹۲۰ میں بزرگ علوی بھی جرمنی چلا آیا اور وہاں ۱۹۲۸ میں اپنی تعلیم مکمل کی۔ اس سے ایک سال پہلے اس کے باپ نے تجارت میں ناکام اور قلاش ہو جانے کے بعد خودکشی کر لی تھی۔

تعلیم مکمل کرنے کے بعد علوی تہران واپس آ گیا اور شیراز کے ٹیکنیکل اسکول میں تدریس شروع کر دی۔ اسی زمانے میں اس نے شلر (Schiller) کی The Maid of Orleans کا فارسی میں ترجمہ شروع کیا جس کی چند قسطیں ایک مقامی اخبار میں چھپیں۔ بعد میں یہ ترجمہ کتاب کی صورت میں صادق ہدایت کے دیباچے کے ساتھ شائع ہوا۔ شیراز میں اپنی صورتِ حال سے غیر مطمئن ہو کر اس نے ایک سال بعد ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور گیلان میں ایک برس اپنے چچا کے گھر بے عملی کے عالم میں گزارا۔ ۱۹۳۱ میں وہ تہران آ گیا اور وہاں جرمن ٹیکنیکل ہائی اسکول میں پڑھانا شروع کر دیا۔ تہران میں اس کی ملاقاتیں صادق ہدایت اور دوسرے ہم مذاق افراد سے ہونے لگیں۔ اس گروپ کا ذکر اوپر ہدایت کے تعارف میں آ چکا ہے۔ ہدایت نے ادب کے میدان میں علوی کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی کی۔

۱۹۳۵ میں علوی کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ چمدان (سوٹ کیس) شائع ہوا۔ اس زمانے میں ایران کے دانشور بیرونِ ملک تعلیم کے زیرِ اثر اور ملک کے سیاسی حالات کے باعث مغربی سیاسی خیالات سے آشنا ہو رہے تھے۔ علوی اور اس کے دوست ڈاکٹر ارانی کی ہفتہ وار نشستوں میں شریک ہوتے جہاں مارکس کی تصنیفوں کا مطالعہ کیا جاتا تھا۔ ۱۹۳۷ میں علوی کو باون دوسرے لوگوں کے ساتھ، جن میں ڈاکٹر ارانی بھی شامل تھا، ۱۹۳۱ کے کمیونسٹ سرگرمیوں پر پابندی کے قانون کے تحت گرفتار کر کے تہران کی قصر جیل میں قید کر دیا گیا۔ یہ تمام لوگ ۱۹۴۱ تک قید میں رہے جب ایران پر اتحادی فوجوں کے قبضے کے

بعد عام معافی کے اعلان کے تحت سیاسی قیدیوں کو رہائی ملی۔ جیل میں کاغذ قلم رکھنے پر پابندی تھی مگر علوی نے کسی نہ کسی طرح بندوبست کر کے جیل کی زندگی اور کرداروں پر کئی پانچ کہانیاں لکھیں جن کا مجموعہ ورق پارہ ہای زندان کے نام سے اس کی رہائی کے بعد شائع ہوا۔

علوی کا کہنا ہے کہ وہ جیل جانے سے پہلے سیاسی سرگرمیوں میں عملی طور پر شریک نہیں تھا بلکہ ان لوگوں میں سے تھا جو ارانی کے نظریات سے شناسائی پیدا کر رہے تھے۔ البتہ رہائی کے بعد وہ نئی قائم کی گئی تودہ پارٹی میں شامل ہو گیا اور پارٹی کے اخبار مردم (عوام) کی ادارت کی ذمے داری سنبھالی۔ دوسری طرف اس کی ادبی سرگرمیاں بھی جاری رہیں۔ قید میں بیتے شب و روز کی تفصیل علوی نے ایک اور کتاب پنجاہ و سہ نفر میں تحریر کی اور یہ کتاب بھی ۱۹۴۱ کے بعد کے نسبتاً آزادی کے دور میں چھپی۔ ۱۹۵۱ میں اس کی کہانیوں کا دوسرا مجموعہ نامہ ہا و داستان ہای دیگر (خطوط اور دوسری کہانیاں) اور ۱۹۵۲ میں پہلا ناول چشمہایش (اس کی آنکھیں) شائع ہوا۔ کمیونسٹ پارٹی سے تعلق رکھنے کی بنا پر بعض ناقد علوی کی تحریروں میں سوشلسٹ حقیقت نگاری کی کارفرمائی دیکھتے ہیں مگر خود علوی ان سے اتفاق نہیں رکھتا بلکہ اپنے اسلوب کو تنقیدی حقیقت نگاری کا نام دینا پسند کرتا ہے۔

۱۹۴۸ میں رضا شاہ پہلوی پر قاتلانہ حملے کے بعد تودہ پارٹی کے ارکان کی گرفتاریاں شروع ہو گئیں۔ علوی کو بھی گرفتار کیا گیا مگر چند دن بعد رہا کر دیا گیا۔ ۱۹۵۳ میں جب ایران کے منتخب وزیر اعظم ڈاکٹر محمد مصدق کو معزول کیا گیا، علوی عالمی امن کاؤنسل کی جانب سے طلائی تمغہ وصول کرنے کے سلسلے میں پراگ میں تھا۔ اس کے بعد اسے مشرقی برلن کی ہمبولٹ یونیورسٹی کی طرف سے فارسی ادبیات کے پروفیسر کے طور پر ملازمت کی پیشکش ہوئی جو اس نے قبول کر لی اور یوں اس کی طویل جلاوطنی شروع ہوئی۔

مصدق کی معزولی کے بعد ایران پر شاہی آمریت کی گرفت بہت سخت ہو گئی۔ تودہ پارٹی کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا اور سنسرشپ کے سخت نفاذ کا دور شروع ہوا جو ۱۹۷۸ میں شاہ کی معزولی تک جاری رہا۔ اس تمام عرصے کے دوران ایران میں علوی کی کتابوں پر پابندی رہی۔ ہمبولٹ یونیورسٹی سے وابستگی کے برسوں میں علوی نے جرمن فارسی لغت پر کام کیا، تحقیقی مقالے لکھے، معاصر فارسی ادب کی ایک تاریخ جرمن زبان میں مرتب کی اور کئی فارسی ادیبوں کی تحریروں کے جرمن میں ترجمے کیے جن میں ہدایت بھی شامل ہے۔ اس دوران اس کی کہانیاں کاوہ اور ایران سے باہر سے شائع ہونے والی دوسری مطبوعات میں شائع ہوتی رہیں۔

۱۹۶۰ اور ۱۹۷۰ کی دہائیوں میں لکھی ہوئی ان کہانیوں کا مجموعہ میرزا ایران میں ۱۹۷۸ میں شائع ہوا۔ اسی سال اس کا دوسرا ناول سالاری ہا بھی چھپا۔ علوی کی کہانیوں کا تیسرا مجموعہ دیو! دیو! کے عنوان سے شائع ہوا۔

۱۹۷۹ میں پچیس برس کی جلاوطنی کے بعد علوی نے ایران کا دورہ کیا جہاں ادیبوں اور پڑھنے والوں نے اس کا پرجوش خیر مقدم کیا جنھوں نے پابندیوں اور سنسرشپ کی سختیوں کے باوجود اس کی تحریروں سے رابطہ برقرار رکھا تھا۔ اس دورے اور ۱۹۸۰ میں علوی کے دوسرے دورۂ ایران کے درمیانی عرصے

Scanned with CamScanner

میں ایرانی انقلاب پھر تاریخ تبدیل کر چکا تھا اور آزاد خیال لوگوں کے لیے وہاں کی صورت حال ایک بار پھر دشوار ہو چکی تھی۔ ۱۹۸۰ کے دورے سے لوٹ کر علوی نے اپنے ایک دوست کو خط میں لکھا: "ایران میں اپنے قیام کے دوران میں شیراز، مشہد، نیشاپور، مازندران، گیلان اور پرسی پولس گیا اور فردوسی، خیام، حافظ، سعدی، عطار اور کمال الملک کی قبروں پر حاضری دی۔ میرے محبوب ایران کا بس یہی کچھ باقی رہ گیا ہے۔"

بزرگ علوی کی ایک دو کہانیاں اس سے پہلے بھی اردو میں منتقل کی جا چکی ہیں۔ موجودہ شمارے میں شامل کہانیاں "سپیٹہ کا سپاہی" اور "میرزا" بالترتیب علوی کے مجموعوں "چمدان" اور "میرزا" سے لی گئی ہیں۔

○ ○ ○

جلال آلِ احمد

فارسی فکشن میں ہدایت اور علوی کے بعد آنے والی نسل میں جلال آلِ احمد کا نام اپنے فن اور فکر کے اعتبار سے نہایت اہم ہے۔ مگر اس کی اہمیت صرف فکشن ہی کے حوالے تک محدود نہیں بلکہ جلال کا مقام ایک سماجی نقاد اور مفکر کی حیثیت سے بھی یکساں طور پر اہم، اگرچہ متنازعہ، ہے۔ اس کی افسانوی اور غیر افسانوی تحریریں سنسر شدہ صورت میں شائع ہونے کے باوجود بہت زیادہ پڑھی جاتی رہیں اور انھوں نے ۱۹۵۰ اور ۱۹۶۰ کی دہائیوں میں فارسی ادب کی سمت متعین کرنے میں بہت بڑا کردار ادا کیا۔

جلال (پورا نام سید جلال الدین سادات آلِ احمد) ۱۹۲۳ میں صوبہ گیلان کے گاؤں اورازان سے تعلق رکھنے والے ایک راسخ العقیدہ مذہبی گھرانے میں تہران میں پیدا ہوا۔ اس کے خاندان کا قریبی رشتہ ممتاز عالمِ دین آیت اللہ طالقانی (۱۹۱۰ - ۱۹۷۹) سے تھا۔ جلال کا باپ، بڑا بھائی اور بہت سے دوسرے عزیز باقاعدہ طور پر مذہبی شغل رکھتے تھے۔ وہ ایک بھائی اور سات بہنوں کے بعد پیدا ہوا۔ اس کا بچپن باپ کی سخت گیری، گہری مذہبیت اور معاشی آسودگی کے ماحول میں بسر ہوا۔ ابتدائی اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اسے باپ کی طرف سے تعلیم جاری رکھنے کی اجازت نہ ملی اور اسے کوئی ہنر سیکھنے کا حکم دے کر بازار میں بھیج دیا گیا۔ جلال نے گھڑیوں کی مرمت اور بجلی کا کام سیکھا اور ان کاموں سے ہونے والی یافت کو تہران کے دارالفنون ثانوی سکول میں رات کے وقت تعلیم حاصل کرنے میں صرف کیا۔ جب وہ ۱۹۴۳ میں اس اسکول سے فارغ التحصیل ہوا تو دوسری جنگِ عظیم جاری تھی۔ اس طرح، خود جلال کے لفظوں میں، "مذہبی ماحول کے پروردہ، عقیدت کی انگوٹھی، گھٹے ہوئے سر اور پانچ فٹ نو انچ قد والے ایک نوجوان کو دوسری عالمی جنگ کی افراتفری میں دھکیل دیا گیا۔ ایک ایسی جنگ جس کا مطلب ہمارے خطے میں قحط، تباہی اور بیماری ۔ بے گھری، قحط، تپ محرقہ اور طوائف الملوکی --- اور قابض غیر ملکی فوجوں کی موجودگی --- ضرور تھا۔"

جنگ کے خاتمے پر جلال نے تہران کے ٹیچرز ٹریننگ کالج کے شعبۂ ادبیات میں بطور استاد اپنی تربیت مکمل کی اور ۱۹۴۷ میں تدریس کا پیشہ اختیار کر لیا۔ اس وقت تک وہ اپنے خاندان سے الگ اور تودہ

Scanned with CamScanner

پارٹی میں شامل ہو چکا تھا۔ تودہ سے چار سال کی وابستگی کے اندر اندر، جلال پارٹی کی تہران مرکزی کمیٹی کا رکن ہو گیا اور اس کے اخباروں کے لیے تحریر اور ادارت کے کام کرنے لگا۔ ۱۹۴۵ میں اس کی پہلی کہانی زیارت تہران سے نکلنے والے ماہنامہ سخن میں شائع ہوئی اور پہلے مجموعے دید و بازدید (۱۹۴۶) میں شامل ہے۔ ۱۹۴۷ میں اس کی کہانیوں کا دوسرا مجموعہ از رنجی کہ می بریم شائع ہوا جو جلال کے سیاسی لڑائیوں میں پیش آنے والی شکستوں کے موضوع پر سوشلسٹ حقیقت نگاری کے اسلوب میں لکھی ہوئی کہانیوں پر مشتمل تھا۔ اسی سال کے آخر میں تودہ پارٹی سے ایک دھڑا ٹوٹ کر الگ ہو گیا جس کی قیادت خلیل ملکی کے ہاتھ میں تھی۔ (ملکی ان ۵۳ افراد میں شامل تھا جنھیں ۱۹۳۷ میں کمیونسٹ سرگرمیوں پر پابندی کے قانون کے تحت گرفتار کیا گیا تھا جس کا ذکر اوپر علوی کے تعارف میں آ چکا ہے۔) جلال بھی تودہ سے الگ ہونے والوں میں شامل تھا۔ اس دھڑے نے سوشلسٹ پارٹی قائم کی مگر وہ زیادہ عرصے نہ چل سکی اور جلال نے عملی سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ خاموشی کے اس وقفے میں جلال نے آندرے ژید، کامیو، سارتر اور دستوئیفسکی کی تحریروں کے ترجمے کیے، ایک مجموعہ سہ تار (۱۹۴۸) شائع کیا (جس کا انتساب ملکی کے نام ہے) اور سیمین دانشور سے شادی کی جو ایک طویل اور گہری تخلیقی رفاقت کی ابتدا ثابت ہوئی۔

اس وقفے کا اختتام ڈاکٹر مصدق کی حکومت کی طرف سے تیل کو قومی ملکیت میں لینے کے اقدام اور جبہۂ ملی (قومی محاذ) کے قیام پر ہوا۔ ۱۹۵۰ کے لگ بھگ جلال نے ایک بار پھر عملی سیاست میں قدم رکھا اور نیروی سوم (تیسری قوت) نامی پارٹی کی کمیٹی میں شامل ہو گیا جو قومی محاذ کا حصہ تھی۔ ۱۹۵۳ میں مصدق کی معزولی سے کچھ قبل محاذ کے بعض رہنماؤں سے اختلافات کے باعث جلال نے اپنی سیاسی سرگرمیاں ختم کر دیں جو مصدق کی معزولی اور شاہی آمریت کے مستحکم ہونے پر بالکل ختم ہو گئیں۔ اس عرصے کے دوران ۱۹۵۲ میں اس کا مجموعہ زن زیادی شائع ہوا۔ ۱۹۵۵ میں جلال کا پہلا ناول سرگذشت کندوہا شائع ہوا جو غیر ملکیوں کے ہاتھوں ایران کے معاشی استحصال کے موضوع پر ایک تمثیل ہے۔ آمریت کے ان ابتدائی برسوں میں جلال نے اندرون ملک سفر کر کے دیہی ایران کو قریب سے جاننے کی کوشش کی اور کئی کتابیں اور بشریاتی تحقیق کے کئی مونوگراف تحریر کیے۔ جلال کا دوسرا ناول "مدیر مدرسہ" ۱۹۵۸ میں شائع ہوا اور اس کا موضوع اس کے پیشے یعنی تدریس سے محدود لیکن صورت حال تھی۔ لوگوں نے اس ناول میں اپنی زندگی کے تجربات کو پہچانا اور اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ۱۹۶۱ میں جلال نے اپنا تیسرا اور سب سے اہم ناول نون والقلم شائع کیا مگر اسے شاہی دور کے خاتمے تک فروخت کی اجازت نہ مل سکی۔

۱۹۶۲ میں جلال کی اہم ترین غیر افسانوی کتاب غرب زدگی خفیہ طور پر شائع ہوئی۔ اس سے پہلے اس کے کچھ حصے تہران کے رسالے کتاب ماہ میں چھپے تھے جس کے باعث اس رسالے کو اپنی اشاعت بند کرنی پڑی تھی۔ یہ کتاب جو تند و تیز اسلوب میں مغربی تہذیب کے دیوہیکل اور جارحیت اور مغرب کی تقلید کے باعث مشرق کو پہنچنے والے تہذیبی زیاں سے بحث کرتی ہے، شاہ کے مخالف حلقوں میں بے حد مقبول ہوئی۔

Scanned with CamScanner

۱۹۶۲ء میں جلال نے وزارت تعلیم کی طرف سے درسی کتابوں کی تیاری کے مطالعے کے لیے یوروپ کا دورہ کیا۔ ۱۹۶۳ میں ماسکو میں بشریات کے ماہروں کی کانفرنس ہوئی جس میں جلال نے شرکت کی۔ جلال کی کتاب "سفرِ روس" اس کے مرنے کے بعد شائع ہوئی۔ ۱۹۶۴ میں اس نے حج کے سلسلے میں حجاز کا سفر کیا اور اس سفر کے تاثرات "خسی در میقات" کے نام سے ۱۹۶۶ میں شائع کیے۔ ۱۹۶۵ میں جلال نے ہارورڈ یونیورسٹی میں ادیبوں کی ایک بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کی غرض سے امریکا کا دورہ کیا۔ اس نے اسرائیل کا سفر بھی کیا۔

جلال نے متنوع موضوعات پر بہت سے مضامین بھی لکھے جو نظر کی گہرائی اور اسلوب کی پختگی کے باعث ایک ممتاز معاشرتی نقاد کے طور پر اس کے بلند مقام کے آئینہ دار ہیں۔ اس کی ایک اور سرگرمی طلبا اور نئے لکھنے والوں کی تربیت بھی تھی۔ اس سلسلے میں اس نے کئی اجتماعات سے مختلف ادبی اور سماجی موضوعات پر خطاب کیا۔ یہ تقریریں اور تنقیدی مضامین جلال کی کتابوں "ہفت مقالہ"، "سہ مقالہ دیگر"، "ارزیابی شتاب زدہ" اور "کارنامہ سہ سالہ" میں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ جلال نے دانش وروں پر تنقید کرتے ہوئے کئی سلسلہ وار مضامین لکھے جن کا مجموعہ اس کی وفات کے بعد "در خدمت و خیانت روشنفکران" کے نام سے شائع ہوا۔

۱۹۶۶ میں شاہ کی حکومت نے سنسرشپ کے زیادہ سخت ضوابط نافذ کر دیے جن کی رو سے ہر کتاب کو شائع کرنے سے پہلے وزارت فرہنگ و ہنر کے سامنے منظوری کے لیے پیش کرنا لازمی تھا۔ ۱۹۶۷ کے آخر میں جلال اور سنسرشپ کے مخالف دوسرے ادیبوں نے شاہی حکومت کی طرف سے منعقد کیے جانے والے ایک ادبی سمپوزیم کے بائیکاٹ کی مہم چلائی اور ادیبوں کی ایک انجمن "کانون نویسندگان ایران" کی بنیاد رکھنے کا فیصلہ کیا۔ اپریل ۱۹۶۸ میں اس انجمن کے قیام کا اعلان ایک دستاویز کی صورت میں ہوا جس پر جلال، سیمین دانشور، احمد شاملو، نادر نادر پور، غلام حسین ساعدی، رضا براہنی اور چھیالیس دوسرے ادیبوں کے دستخط تھے لیکن جبر اور پابندی کے ماحول میں ایسی کسی انجمن کا کام کرنا سخت دشوار ثابت ہوا۔ اس سے تعلق رکھنے والے بہت سے ادیبوں کو قید اور تشدد کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ تنظیم ۱۹۶۹ میں جلال کی وفات کے بعد عملاً غیر موثر ہو گئی اور شاہ کے زوال کے دنوں میں دوبارہ سرگرم ہوئی۔ شاہ کی معزولی کے بعد ۱۹۷۹ کے موسم بہار میں اس انجمن کی طرف سے ایک رسالہ "نامۂ کانون نویسندگان ایران" جاری کیا گیا جس کے پہلے شمارے میں پچاس صفحات پر مشتمل ایک گوشہ جلال کی یاد کے لیے وقف کیا گیا۔ ایک سال میں اس رسالے کے چھ شمارے شائع ہوئے جس کے بعد اسے بند کر دیا گیا۔ ۱۹۸۱ میں انجمن اور اس کے رسالے کو قانونی طور پر ممنوع قرار دے دیا گیا۔ انجمن کے ایک سرکردہ رکن سعید سلطانپور کو جون ۱۹۸۱ میں سزائے موت دی گئی۔ وزارت فرہنگ و ہنر کا نیا نام وزارت فرہنگ و ارشاد اسلامی تھا۔

۱۹۶۸ کے شروع میں جلال کا چوتھا اور آخری ناول "نفرین زمین" شائع ہوا جو شاہ کے انقلاب سفید کے تحت کی گئی زرعی اصلاحات پر تنقید کرتا ہے۔ یہ شاہ کے سخت آمرانہ جبر کا زمانہ تھا۔ جلال کو اپنی سرگرمیوں کے باعث شاہ کی خفیہ پولیس سازمان اطلاعات و امنیت کشور (ساواک) کی تہدید اور دھمکیوں کا

Scanned with CamScanner

کئی بار سامنا کرنا پڑا۔ مصدق کی معزولی کے فوراً بعد ہی ساواک کے دباؤ پر جلال نے سیاست سے دست
برداری کا ایک سطری اعلان تحریر کر دیا تھا۔ ۱۹۶۶ میں سنسر شپ کی مزاحمت اور ادیبوں کی انجمن قائم کرنے
کی کوششوں کے نتیجے میں یہ دباؤ اور بڑھ گیا۔ جلال کو کئی بار اپنی تدریسی ملازمتوں سے ہاتھ دھونے پڑے۔
۱۹۶۹ میں جلال نے اپنے ساتھیوں سے ملاقات ترک کر دی اور اپنی بیوی کے ساتھ کیسپین کے کنارے
ایک گاؤں اسالم میں واقع اپنے چھوٹے سے کاٹیج میں منتقل ہو گیا جہاں ستمبر ۱۹۶۹ میں اس کی وفات
ہوئی۔ اس کی موت کا احوال آج تک متنازعہ ہے اور بہت سے لوگوں کو یقین ہے کہ اس کی موت میں
ساواک کا ہاتھ تھا۔

جلال ایک صاحب اسلوب ادیب تھا۔ اس کا اسلوب فارسی نثر کی پختگی کی نشان دہی کرتا ہے اور
اس نے بعد میں آنے والے ادیبوں پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔ جلال کی کہانیوں اور ناولوں میں
ایرانی معاشرے کے مختلف مظاہر کی نہایت حقیقی تصویریں نظر آتی ہیں اور اس کی بے حد حساس اور
مضطرب شخصیت کا عکس بھی جھلکتا ہے۔ اس شمارے میں شامل کہانی "جشنِ مسرت" اس کے بچپن کے
ایک واقعے پر بنیاد رکھتی ہے اور اس مذہبی ماحول کا عمدگی کے ساتھ خاکہ کھینچتی ہے جس میں اس کی
پرورش ہوئی۔ مذہبی پرداخت، تودہ پارٹی سے وابستگی اور پھر علیحدگی، مغرب کے ساتھ تخلیقی ربط اور
دوسرے عناصر نے جلال کی پیچیدہ شخصیت پر گہرے نقوش مرتب کیے تھے جن کا اظہار اس کی تحریروں
میں بھرپور طور پر ہوا۔ خاص طور پر مذہب کی بابت جلال کا رویہ ایک شدید داخلی کشمکش کا اظہار کرتا ہے۔
وہ مذہب کے ظواہر سے اپنی نوجوانی ہی میں بیگانہ ہو چکا تھا مگر مغرب کی معاشی اور تہذیبی جارحیت کے
ردعمل میں مذہب کو مزاحمت کا ایک موثر اجتماعی وسیلہ خیال کرتا تھا۔ اس کی موت کے تقریباً دس برس
بعد ایران کی سیاست نے جو رخ اختیار کیا آیا اسے جلال کی تائید حاصل ہوئی ہوتی، یہ سوال ایک شدید بحث
کا موضوع بن گیا جو ہنوز جاری ہے۔

o o o

غلام حسین ساعدی

جلال آل احمد کے بعد آنے والے فارسی فسانہ نگاروں میں غلام حسین ساعدی کا نام بہت ممتاز
ہے۔ ساعدی جلال کے بہت قریب تھا اور اس سے متاثر بھی، لیکن اس نے ایک اعلیٰ درجے کے ادیب
کے طور پر اپنا منفرد اسلوب وضع کیا جس پر کسی کی چھاپ نہیں ہے۔ کہانیوں اور ناولوں کے علاوہ ساعدی
نے "گوہر مراد" کے قلمی نام سے متعدد ڈرامے بھی لکھے اور کہا جاتا ہے کہ فارسی ڈرامہ نویسی میں اس کا کوئی
مدمقابل نہیں ہے۔ وہ ایک اہم ادبی رسالے "الفبا" کا بانی اور مدیر بھی تھا جس کے چھ شمارے ۱۹۷۳ اور
۱۹۷۶ کے درمیانی عرصے میں شائع ہوئے۔

ساعدی ۱۹۳۵ میں تبریز، آذربائیجان، میں پیدا ہوا اور وہیں تعلیم حاصل کی۔ وہ پڑھے لکھے
آذربائیجانی ترکوں کے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے طالب علمی کے دن وہ تھے جب ڈاکٹر مصدق
نے ایرانی قومیت پر اصرار کرتے ہوئے تیل کی صنعت کو قومی ملکیت میں لیا تھا۔ بہت سے اور طالب

Scanned with CamScanner

حلقوں کے ساتھ ساعدی بھی سیاسی سرگرمیوں میں شامل ہو گیا۔ ۱۹۵۳ میں مصدق کی معزولی اور شاہ کی واپسی پر سے پہلی بار قید میں ڈالا گیا۔ یہ قید و بند کے ایک طویل سلسلے کی ابتدا تھی جس کا آخری موقع ۱۹۷۴ میں آیا۔

ساعدی پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر تھا اور اس نے تہران یونیورسٹی سے نفسیاتی معالج کے طور پر تخصص حاصل کیا تھا۔ اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا زیادہ حصہ اس نے جنوبی تہران کے علاقے میں پریکٹس کرنے میں صرف کیا جہاں، یہاں کی قدیم روایت کا پاس کرتے ہوئے، وہ مریضوں سے صرف اتنی ہی فیس قبول کرتا تھا جو وہ ادا کر سکتے ہوں۔ ایک معالج کے طور پر اس کے تجربات اور ایران کے گوشے گوشے کے سفر نے ساعدی کی طبیعت میں انسانوں کے واسطے ایک گہری دردمندی پیدا کر دی تھی جس کا اظہار اس کی تحریروں میں بہت خوبی سے ہوتا ہے۔

ساعدی ایک بسیار نویس ادیب تھا اور اس نے اپنی پچیس سالہ عملی زندگی میں تیس سے زیادہ کتابیں لکھیں جن میں ناول، کہانیوں کے مجموعے، ڈرامے اور مونوگراف شامل ہیں۔ اس کی پہلی تحریر ۱۹۵۳ کے لگ بھگ چھپی تھی۔ ۱۹۶۰ میں اس کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ "شب نشینی باشکوہ" شائع ہوا۔ اور ۱۹۷۰ کی دہائی کے آخر تک ان مجموعوں کی تعداد چھ تک پہنچ چکی تھی۔ ان مجموعوں میں "عزاداران بیل" (۱۹۶۴)، "دندیل" (۱۹۶۶)، "واہمہ ہای بی نام و نشان" (۱۹۶۷)، "ترس و لرز" (۱۹۶۸) اور "گور و گہوارہ" (۱۹۷۲) شامل ہیں۔ ۱۹۶۸ میں اس کا ناول "توپ" بھی شائع ہوا۔

ساعدی کے کئی مجموعے باہم پیوست کہانیوں پر مشتمل ہیں جن کے ذریعے اس نے کرداروں کے کسی مخصوص گروہ کی زندگیوں کے خدوخال کو واضح کیا ہے۔ مثلاً "عزاداران بیل" کی آٹھ کہانیاں (جن میں سے پہلی کہانی کا ترجمہ موجودہ شمارے میں شامل ہے) بیل نامی گاؤں میں رہنے والوں کی ابتلا سے پر زندگی کو پیش کرتی ہیں۔ "دندیل" کی کہانیاں آذربائیجان کے ایک قصبے میں واقع چکلے کے کرداروں کی سرگزشت پر مبنی ہیں۔ "ترس و لرز" ایران کے جنوبی ساحلی علاقوں میں آباد لوگوں کی زندگی کی سات کہانیوں پر مشتمل ہے۔ ان مجموعوں کی کہانیوں میں، جن کے کردار زیادہ تر درمیانے اور نچلے طبقے سے لیے گئے ہیں، ایران کے عام لوگوں کے شب و روز، ان کی آرزوؤں، امیدوں، شکستوں اور مایوسیوں کو بڑی دردمندی اور تخلیقی مہارت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ساعدی کی کہانیوں کی عمیق فضا اور کسی قدر کے منتظر کردار اس کے حقیقت نگار اسلوب کو ایک گہری رمزیت کا حامل بنا دیتے ہیں جو ان کی فنی کامیابی کی ایک بڑی وجہ ہے۔ اور یہی خصوصیت آمریت کے ہاتھوں ساعدی پر آنے والی مصیبتوں کا بڑا سبب بھی بنی۔

۱۹۶۸ میں ساعدی ان پچاس کے قریب ادیبوں میں شامل تھا جنھوں نے سنسرشپ کے خلاف قانونی مزاحمت کرنے کے مقصد سے ایرانی ادیبوں کی انجمن قائم کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ان کے مطالبات سادہ تھے: مل بیٹھنے کے لیے ایک جگہ، ایک رسالہ جاری کرنے کا حق، اور سنسرشپ کا خاتمہ۔ ان ادیبوں کو حکومت کی طرف سے سخت ردعمل کا سامنا کرنا پڑا اور اس کے بہت سے ارکان کو قید کر دیا گیا۔ ۱۹۷۳ میں ساعدی نے الفبا کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا اور ۱۹۷۴ میں اسے آخری بار گرفتار کر لیا گیا۔ اسے گیارہ مہینوں تک فردِ جرم عائد کیے یا مقدمہ چلائے بغیر قید رکھا گیا جس کے دوران اس پر سخت تشدد

Scanned with CamScanner

کیا گیا اور رہا ہونے پر ایک بیان جاری کرنے پر مجبور کیا گیا جس میں اس نے اپنی تمام پچھلی تحریروں کو گمراہی کا نتیجہ قرار دیا اور شاہ کے انقلابِ سفید کی خوبیوں کو اپنی آئندہ تحریروں کا موضوع بنانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ بعد میں، ایران سے باہر جا کر ساعدی نے اپنے قید کے دنوں کے بارے میں اس طرح اظہارِ خیال کیا:

> جو بات مجھے سب سے زیادہ دہشت میں مبتلا کرتی تھی یہ تھی کہ میری تحریروں کی من مانی تعبیریں کی جا سکتی تھیں۔ اور ہر تعبیر کے نتیجے میں مجھ پر ایک نیا الزام عائد کیا جا سکتا تھا۔ اس طرح لکھنے والے کے ذہن میں شک کا بیج بو دیا جاتا ہے: وہ اپنی کہانیوں کے کرداروں تک کو شک کی نگاہ سے دیکھنے لگتا ہے۔ کہ کہیں فلاں واقعے یا فلاں کردار کو کوئی اور معنی تو نہیں پہنائے جائیں گے؟
>
> اشاعت کی اجازت نہ ملنے یا قید میں ڈال دیے جانے کے امکانات صرف ہمارے بیداری کے لمحات پر حملہ آور نہیں ہوتے بلکہ ہماری نیند میں بھی در آتے ہیں اور ہمارے بھیانک خوابوں میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اور لکھنے والا مسلسل یہی سوچتا رہتا ہے کہ وہ اپنے بے رحم ایذا رسانوں کے بے بنیاد الزامات سے اپنے کرداروں کا دفاع کیوں کر کرے گا۔ ہاں، تفتیش کے دوران اپنی تحریر کا دفاع خود اپنے دفاع سے بھی زیادہ دشوار ہو جاتا ہے۔

ادیبوں کی انجمن ۱۹۷۷ میں دوبارہ فعال ہونا شروع ہوئی جب امریکی صدر کارٹر کی جانب سے انسانی حقوق کے سلسلے میں دباؤ پڑنے پر شاہ کو اپنی آمریت کی گرفت ذرا ڈھیلی کرنی پڑی۔ ۱۹۷۷ کے موسمِ سرما میں انجمن نے "شاعری کی شام" کے عنوان سے ادبی اجتماعات کا ایک سلسلہ شروع کیا جو تہران کے گوئٹے انسٹیٹیوٹ میں منعقد ہوئے۔ متواتر دس راتوں تک ہزاروں لوگوں کی ان اجتماعات میں شرکت نے حکام کو خوف زدہ کر دیا اور آخری اجتماع کا اختتام پولیس کے حملے پر ہوا جس میں سولہ افراد مارے گئے۔ شاہ کا زوال شروع ہو چکا تھا۔

۱۹۷۷ میں اشاعت کی آزادی کی بین الاقوامی کمیٹی کی جانب سے ساعدی کو امریکا کا دورہ کرنے کی دعوت ملی مگر اسے پاسپورٹ جاری کرنے سے انکار کر دیا گیا۔ امریکی ناشروں کی جانب سے شاہ اور ملکہ سے کی جانے والی پے در پے اپیلوں کے نتیجے میں آخر ۱۹۷۸ کے وسط میں ساعدی کو سفر کی اجازت ملی۔ اس سفر کے دوران اس نے ایرانی ادیبوں کی مخصوص صورتِ حال کو دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اس نے بتایا کہ سنسر شپ کے قانون کے تحت نہ صرف ہر نئی کتاب کو اشاعت سے پہلے منظوری کے لیے پیش کرنا ضروری ہے بلکہ ہر تازہ ایڈیشن کے لیے وزارت ثقافت و ہنر کی منظوری لینی پڑتی ہے۔ اس طرح حکومت کسی بھی ایسی کتاب پر پابندی لگا سکتی ہے جو شائع ہونے کے بعد غالباً ردِعمل پیدا کر رہی ہو۔ اس نے کہا کہ شاہ کی حکومت شاعری — خصوصاً جدید شاعری — کے سلسلے میں نہایت حساس ہے جو سنسر کے کارندوں کی سمجھ سے بالاتر ہوتی ہے اور وہ اسے کسی خفیہ پیغام کا حامل سمجھتے ہیں۔ حقیقت یہ تھی کہ

Scanned with CamScanner

آمریت کے جبر اور سنسر کی کشمکش سے شاعروں اور ادیبوں کی تحریروں کو ایک پیچیدہ سیاسی رمزیت کا حامل بنا دیا تھا جسے ان کے پڑھنے والے فوراً پا لیتے تھے۔

ساعدی ایک بار ایران سے باہر آ کر پھر کبھی واپس نہ گیا۔ اس نے پیرس میں سکونت اختیار کر لی اور وہیں ۱۹۸۵ میں اس کا انتقال ہوا

o o o

جمال میر صادقی

جمال میر صادقی ۱۹۳۳ میں تہران میں پیدا ہوا اور وہیں تعلیم حاصل کی۔ ہائی سکول کی تعلیم پوری کرتے ہی اس نے تدریس کا پیشہ اختیار کر لیا اور ساتھ ساتھ فارسی ادبیات کے میدان میں اعلیٰ تعلیم بھی جاری رکھی۔ ۱۹۵۰ کی دہائی کے آخری برسوں میں میر صادقی کی کہانیاں تہران کے ماہنامہ سخن میں شائع ہونا شروع ہوئیں اور پہلا مجموعہ شازدہ خانم چشم سبز ۱۹۶۲ میں چھپا۔ بعد میں اس نے اس مجموعے کا عنوان بدل کر مسافرہای شب کر دیا۔ اس کے بعد میر صادقی کی کہانیوں کے متعدد مجموعے شائع ہوئے جن کے نام یہ ہیں: چشم ہای من، خستہ (۱۹۶۶)، شبہای تماشا و گل زرد (۱۹۷۰)، این سوی تل ہای شن (۱۹۷۴)، نہ آدمی نہ صدایی (۱۹۷۵)، دوالپا (۱۹۷۷) اور مہرہ ی مار (۱۹۷۸)۔ ۱۹۷۹ کے انقلاب سے پہلے اس کے تین ناول درازنای شب (۱۹۷۰)، بادہای شکستہ بادبان (۱۹۷۱) اور "شب چراغ (۱۹۷۷) شائع ہو چکے تھے۔

انقلاب کے بعد بھی میر صادقی کی کئی کتابیں شائع ہوئی ہیں جن میں کہانیوں کا مجموعہ پشہ باد و داستانہای دیگر (۱۹۸۹) اور ناول بادہا خبر از تغییر فصل میدادند (۱۹۸۵)، آتش از آتش (۱۹۸۶) اور "کلاغہا و آدمہا" (۱۹۸۹) شامل ہیں۔

اسی دوران میر صادقی نے تنقید نگار کے طور پر بھی اپنا مقام پیدا کیا اور دو کتابیں عناصر داستان (۱۹۸۵) اور ادبیات داستانی: قصہ، داستان کوتاہ، رمان، با نگاہی بہ داستان نویسی معاصر ایران (۱۹۸۸) شائع کیں۔

میر صادقی کی بیوی میمنت میر صادقی شاعر اور تنقید نگار کے طور پر معروف ہے۔

o o o

غلام حسین نظری

غلام حسین نظری ۱۹۳۳ میں ملایر میں پیدا ہوا اور ۱۹۶۲ میں تہران یونیورسٹی کے دندان سازی کے کالج سے فارغ التحصیل ہوا۔ اس کے ایک برس بعد وہ ترکِ وطن کر کے جرمنی چلا گیا۔

نظری نے گنتی کی چند مختصر کہانیاں یا حکایات لکھی ہیں جو اپنی ساخت اور اسلوب میں کافکا اور بورخیس کی یاد دلاتی ہیں۔ یہ حکایات ۱۹۶۵ اور ۱۹۷۷ کے درمیان ماہنامہ "سخن"، تہران، میں شائع

Scanned with CamScanner

ہو ہیں۔ نظامی کی تحریروں کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا۔

○ ○ ○

اسماعیل فصیح

موجودہ فارسی فکشن کا ایک اہم نمائندہ اسماعیل فصیح ۱۹۳۵ میں تہران میں پیدا ہوا۔ تہران میں ہی ابتدائی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ۱۹۵۶ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے امریکا چلا گیا۔ وہاں سے انگریزی ادب اور سائنس کے مضامین میں اسناد حاصل کرکے وہ ایران واپس آ گیا اور ۱۹۶۳ میں ایران کی قومی آئل کمپنی (شرکت ملی نفت ایران) میں ملازمت اختیار کر لی۔ اس ملازمت میں اس کا کام زیادہ تر آبادان انسٹیٹیوٹ آف ٹیکنولوجی میں تدریس پر مشتمل تھا۔ سترہ سال کی ملازمت کے بعد ۱۹۸۱ میں اسے جبراً ریٹائر کر دیا گیا۔ تب سے وہ تہران میں مقیم اور تصنیف کے کام میں مشغول ہے۔

۱۹۶۸ میں فصیح کا پہلا ناول شراب خام شائع ہوا اور ۱۹۷۰ میں کہانیوں کے دو مجموعے خاک آشنا اور دیدار در ہند چھپے۔ اس کے بعد شائع ہونے والی کتابوں میں فصیح کی کہانیوں کے دو مجموعے عقد و داستانہای دیگر (۱۹۷۸) اور نمادہای دشت مشوش (۱۹۹۰)، اور چھ ناول دل کور (۱۹۷۳)، داستان جاوید (۱۹۸۰)، ثریا در اغما (۱۹۸۳)، درد سیاوش (۱۹۸۵)، زمستان شصت و دو (۱۹۸۷) اور شہباز و جغدان (۱۹۹۰) شامل ہیں۔

فصیح کا مضمون The Status, A Day in the Life of an Iranian Writer جو ۱۹۸۷ میں "تھرڈ ورلڈ ریویو" میں شائع ہوا انقلاب سے پہلے اور بعد کے زمانوں میں ایرانی ادیبوں کی صورتِ حال پر روشنی ڈالتا ہے۔

○ ○ ○

فریدون تنکابنی

فریدون تنکابنی "آموزگار" ۱۹۳۷ میں کیسپین کے ساحلی قصبے تنکابن میں پیدا ہوا۔ فارسی ادبیات میں یونیورسٹی کی سطح تک تعلیم پائی اور پیشے کے اعتبار سے مدرس ہے۔ اپنی نسل کے ایک متعہد (انگیجڈ یا engage) ادیب کے طور پر اس نے کئی بار سنسر شپ کی حدوں کو توڑنے کی کوشش کی۔ ۱۹۶۸ میں وہ ان ادیبوں کی انجمن قائم کرنے والوں میں شامل تھا اور اس کے بعد کے برسوں میں قید بھی کیا گیا۔ تنکابنی نے ۱۹۷۷ میں تہران کے گوئٹے انسٹیٹیوٹ میں منعقد کی گئی شاعری کی شاموں میں نمایاں طور سے حصہ لیا۔

تنکابنی کی پہلی مطبوعہ تحریر ایک طویل کہانی مردی در قفس تھی جو ۱۹۶۱ میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد سے اس کی کہانیوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن کے نام یہ ہیں: سیر خاک (۱۹۶۳) پیادہ شطرنج (۱۹۶۵)، ستارہ ہای شب تیرہ (۱۹۶۸)، یادداشت ہای شہر شلوغ (۱۹۶۹)، راہ و رفتن روی

Scanned with CamScanner

ریل (۱۹۷۷)، سرزمین خوش بختی (۱۹۷۸) اور میان دو سفر (۱۹۷۸)۔ اس کی تحریروں کا ایک مجموعہ دو داستان و نوشتہ‌ہای دیگر ۱۹۷۸ میں کیلیفورنیا سے شائع ہوا۔

ساعدی نے ۱۹۷۹ میں اپنے ایک مطبوعہ مضمون میں اپنی تحریروں کے سنسر کیے جانے کی شکایت کی۔

○ ○ ○

سیمین دانشور

فارسی زبان کی پہلی افسانہ نگار اور ناول نویس سیمین دانشور ۱۹۲۱ میں شیراز میں پیدا ہوئی۔ اس کا باپ ایک ڈاکٹر تھا۔ سیمین کی تعلیم مشنری اسکول میں ہوئی اور اس نے ابتدا ہی میں انگریزی زبان میں مہارت پیدا کر لی۔ سکول کی تعلیم پوری ہونے پر سیمین اپنے والدین کے ساتھ تہران منتقل ہو گئی اور تہران یونیورسٹی میں فارسی ادبیات کے مضمون میں داخلہ لے لیا۔ ۱۹۴۱ میں باپ کی موت نے اسے کام شروع کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے ریڈیو تہران میں ملازمت کی اور مختلف رسالوں میں لکھ لکھ کر تعلیم کے اخراجات پورے کرتی رہی۔ بعد میں سیمین کو اس کی انگریزی کی استعداد کی بدولت غیر ملکی خبروں کے شعبے میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر کی جگہ مل گئی مگر وہ اس کام سے بہت جلد اکتا گئی اور اس ملازمت سے استعفیٰ دے کر ایران نامی ایک اخبار میں کام کرنے لگی۔

۱۹۴۱ کے بعد کے نسبتاً آزادی کے برسوں میں سیمین نے صحافت کو پیشے کے طور پر اپنانے کا ارادہ کیا اور کہانیاں بھی لکھنے لگی۔ اس کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ آتش خاموش ۱۹۴۸ میں شائع ہوا۔ یہ فارسی زبان میں کسی عورت کی لکھی ہوئی کہانیوں کا پہلا مجموعہ تھا اور اسے خاصی پذیرائی حاصل ہوئی۔ بعد میں یہ کہانیاں اپنے خام اسلوب کے باعث سیمین کے دل سے اتر گئیں اور اس نے اس کتاب کی دوبارہ اشاعت کی اجازت نہیں دی۔ "آتش خاموش" کی اشاعت کے اگلے سال سیمین نے تہران یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور اسی زمانے میں اصفہان سے تہران آتے ہوئے اس کی ملاقات نامور ادیب جلال آلِ احمد سے ہوئی۔ ۱۹۵۰ میں ان دونوں نے شادی کر لی۔

۱۹۵۲ میں سیمین کو فلبرائٹ فیلوشپ پر اسٹانفورڈ یونیورسٹی میں دو سال گزارنے کا موقع ملا۔ واپسی پر وہ آرٹ کی تاریخ کی استاد کی حیثیت سے تہران یونیورسٹی سے وابستہ ہو گئی۔ ۱۹۶۱ میں اس کی کہانیوں کا دوسرا مجموعہ "شہری چون بہشت" شائع ہوا اور اس دوران اس نے چیخوف، برنارڈ شا، ہوتھورن، شنٹزلر اور ولیم سیرویان کی تحریروں کے فارسی ترجمے بھی کیے۔ "شہری چون بہشت" میں اس کے اسلوب میں خاصی پختگی آ گئی تھی۔ اس کتاب میں شامل کہانیوں کا بنیادی موضوع ایرانی معاشرے میں عورتوں کی صورت حال ہے۔ جلال کی بیوی ہونے کی وجہ سے سیمین کو ادیب کے طور پر شروع میں وہ اہمیت حاصل نہ ہو سکی جس کی وہ مستحق تھی۔

سیمین نے فارسی ادب میں اپنا بلند مقام اپنے ناول سووشون (۱۹۶۹) کی اشاعت کے بعد حاصل کیا۔ یہ نہ صرف کسی عورت کا لکھا ہوا پہلا ناول ہے بلکہ بعض لوگوں کی رائے میں فارسی کا سب سے زیادہ

Scanned with CamScanner

قابلِ ذکر ناول ہے۔ اس ناول کا محلِ وقوع دوسری جنگِ عظیم کے دنوں کا شیراز ہے اور یہ غیر ملکی فوجوں کے تسلط میں آئے ہوئے شہر میں ایک مقامی خاندان کی سرگزشت بیان کرتا ہے۔ اس ناول میں سیمیں کے اسلوب کی ابتدائی کمزوریوں کا شائبہ تک نہیں رہا اور اس نے معاشرتی توہمات اور مذہبی عقیدوں اور رسموں کو مہارت اور خوبصورتی سے بیان کی ہوئی کہانی میں گوندھا ہے۔ اس کے ابتدائی حصے کو فارسی ادب کے پُراثر ترین پاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔

سووشون کی اشاعت سے چند مہینے پہلے جلال کی وفات ہو چکی تھی۔ اس کے بعد سیمیں نے ان سرگرمیوں میں حصہ لینا جاری رکھا جو جلال کو عزیز تھیں۔ اس نے ادیبوں کی اس انجمن میں رہنمایانہ کردار ادا کرنا شروع کر دیا جس کی بنیاد رکھنے میں جلال کا بہت بڑا حصہ تھا۔ یہ سرگرمیاں ۱۹۷۰ کی دہائی کے وسط میں خاصی کم ہو گئیں مگر سیمیں کی کہانیاں رسالوں میں شائع ہوتی رہیں اور اس کا مجموعہ ۱۹۸۰ میں "بہ کی سلام کنم" کے نام سے شائع ہوا۔ جس کہانی کا ترجمہ موجودہ شمارے میں شامل ہے وہ اسی مجموعے سے لی گئی ہے۔ سیمیں کا دوسرا ناول "جزیرہ سرگردانی" ۱۹۹۳ میں شائع ہوا ہے۔

سیمیں نے جلال کی موت کا احوال اپنے طویل مضمون "غروبِ جلال" میں بیان کیا ہے۔

○ ○ ○

ابراہیم گلستان

جلال آلِ احمد، صادق چوبک اور محمود اعتمادزادہ (بہ آذین) کے ہم عصر ابراہیم گلستان کو فارسی کے افسانہ نگاروں میں بیانیے کی تکنیک اور زبان کے تخلیقی استعمال کے لحاظ سے ممتاز مقام حاصل ہے۔ گلستان ۱۹۲۲ میں شیراز میں پیدا ہوا۔ اس کا تعلق شیعہ عالموں کے گھرانے سے تھا۔ اس کا باپ کچھ عرصے تک شیراز شہر کا میئر بھی رہا اور ایک اخبار نکالتا رہا جس کا نام "گلستان" اس گھرانے کے نام کا حصہ بن گیا۔ مکتب کی تعلیم ختم کرنے کے بعد گلستان نے کچھ عرصے تہران یونیورسٹی میں تعلیم پائی اور پھر ایران کی قومی آئل کمپنی میں ملازم ہو گیا۔

۱۹۴۰ کی دہائی کے آخری برسوں سے لے کر گلستان افسانہ نگار، مترجم، فلم ڈائرکٹر، فوٹوگرافر اور ناشر کی حیثیت سے سرگرم رہا ہے۔ اس نے ہیمنگوے اور فاکنر کی تحریروں کو پہلی بار فارسی میں منتقل کیا۔ ۱۹۶۵ میں ایک دستاویزی فلم "خشت و آئینہ" بنائی اور دوسری فلم "اسرارِ گنجِ درۂ جنی" ۱۹۷۴ میں جس کی بنیاد اس نے اپنے اسی نام کے ناول پر رکھی۔

گلستان کی کہانیوں کے چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں: "آذر، ماہِ آخرِ پاییز" (۱۹۴۸)، "شکار سایہ" (۱۹۵۵)، "جوی و دیوار و تشنہ" (۱۹۶۷) اور "مدّ و مہ" (۱۹۶۹)۔

گلستان ۱۹۷۵ کے لگ بھگ ترکِ وطن کر کے لندن چلا گیا اور ۱۹۸۰ کے دوران جدید ایران کی ایک تاریخ پر کام کر رہا تھا۔

○ ○ ○

نادر ابراہیمی

نادر ابراہیمی ۱۹۳۶ میں تہران میں پیدا ہوا اور وہیں دارالفنون کالج میں پرورش پائی۔ اس نے تہران یونیورسٹی میں قانون اور انگریزی زبان کے مضامین میں تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد سب سے مختلف پیشے اختیار کیے جن کی تفصیل اس نے اپنی خود نوشت سوانح کی طرز کی کتاب ابن مشغلہ (۱۹۷۵) میں بیان کی ہے۔

نادر کی کہانیوں کے سات سے مجموعے شائع ہوئے ہیں جن کے نام یہ ہیں: خانہ ای برای شب (۱۹۶۳)، آرش در قلمروی تردید (۱۹۶۳) جو دوسری بار ۱۹۷۵ میں پاسخ اپدر کے عنوان سے چھپا، مصابا و رویای گاجرات (۱۹۶۵)، مکانہای عمومی (۱۹۶۶)، افسانۂ باران (۱۹۶۷)، در سرزمین کوچک من (۱۹۶۸)، ہزارپای سیاہ و قصہ ہای صحرا (۱۹۶۹)، جزء بحث آقای رشت (۱۹۷۰)، تضادہای درونی (۱۹۷۱) جو دوسری بار ۱۹۷۳ میں دہ داستان کوتاہ کے نام سے شائع ہوا، وسعت معنای انتظار (۱۹۷۳)، رونوشت بدون اصل (۱۹۷۵)، غزل داستان ہای سال بد (۱۹۷۸)، جنگ بزرگ ازدر سر امیریان (۱۹۸۰) اور ذوالشکل مرور نیست (۱۹۸۹)۔

نادر نے ناول بھی لکھے ہیں جن میں بار دیگر شہری کہ دوست میداشتم (۱۹۶۷)، انسان، جنایت و احتمال (۱۹۷۱) اور سات جلدوں پر مشتمل آتش بدون دود شامل ہیں۔ اپنی بیوی کے نام اس کے خطوں کا مجموعہ چہل نامۂ کوتاہ بہ ہمسرم کے نام سے ۱۹۸۹ میں چھپا۔ موجودہ شمارے میں شامل کہانی اس کے مجموعے مکانہای عمومی سے لی گئی ہے۔

O O O

محمود دولت آبادی

محمود دولت آبادی ۱۹۴۰ میں صوبہ خراسان کے شہر سبزوار کے نزدیک دولت آباد نامی قصبے میں پیدا ہوا۔ اسے ۱۹۷۰ اور ۱۹۸۰ کی دہائی میں منظر عام پر آنے والے افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ اس کو بچپن ہی سے روزی کمانے پر مجبور ہونا پڑا اور اس نے تعلیم درسی مدارس کے بغیر خود حاصل کی۔

محمود کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ لایہ ہای بیابانی ۱۹۶۹ میں شائع ہوا اور دوسرا مجموعہ دو داستان ۱۹۷۰ میں۔ اس کے بعد اس نے کئی ناول شائع کیے جن میں سفر (۱۹۶۹)، اوسنۂ بابا سبحان (۱۹۷۰)، گاوارہ بان (۱۹۷۲)، باشبیرو (۱۹۷۳)، ہجرت سلیمان (۱۹۷۳)، عقیل، عقیل (۱۹۷۳)، مرد (۱۹۷۳)، دیدار بلوچ (۱۹۷۸)، ردّ زخم چسپر (۱۹۷۸) اور جای خالی سلوچ (۱۹۷۹) شامل ہیں۔ ناول کی صنف میں محمود کا سب سے بڑا کارنامہ دس جلدوں پر مشتمل کلیدر ہے جس کی پہلی جلد ۱۹۷۸ میں اور آخری ۱۹۸۳ میں شائع ہوئی۔ اس کے ایک اور طویل ناول روزگار سپری شدہ مردم سالخوردہ کا ایک حصہ اقلیم باد کے عنوان سے ۱۹۹۱ میں شائع ہوا۔

Scanned with CamScanner

تین عشروں میں محمود کی کہانیوں کی کلیات "کارنامۂ سپنج" کے نام سے حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ ادیبوں اور مدیروں کی ایک جماعت نے ساتھ محمود کے طویل مصاحبے "ماہیر وری مسیتیم" کے نام سے ۱۹۹۰ میں کتابی صورت میں چھپے۔

محمود نے ۱۹۹۰ میں یوروپ اور ۱۹۹۱ میں امریکا کا دورہ کیا اور وہاں ادب اور سیاست پر لیکچر دیے۔

○ ○ ○

نسیم خاکسار

تارک وطن افسانہ نگار اور سیاسی کارکن نسیم خاکسار ۱۹۴۴ میں آبادان میں پیدا ہوئی اور وہیں پرورش پائی۔ اس نے تہران کی اعلیٰ تدریس کے انسٹیٹیوٹ سے ڈگری حاصل کی اور ۱۹۶۰ کی دہائی کے آخری برسوں میں اس کی کہانیاں مختلف جریدوں میں شائع ہونی شروع ہو ئیں۔ ۱۹۷۳ میں اس کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ "من میدانم بچہ ہا دوست دارند بہار بیاید" کے نام سے چھپا، مگر اس سے پہلے ہی اسے سیاسی سرگرمیوں کی پاداش میں قید میں ڈالا جا چکا تھا جس سے وہ ۱۹۷۸ میں رہا ہوئی۔ رہائی کے بعد اس کے دو مجموعے شائع ہوئے جن میں "گرد و ماہ بد یگر، دوست بدارند" (۱۹۷۸)، "گریک" (۱۹۷۹) اور "روشنفکر کوچک" (۱۹۸۱) شامل ہیں۔ خاکسار کی کہانیاں "کتاب جمعہ" اور "ماہنامہ کانون نویسندگان ایران" میں شائع ہوتی رہیں۔ اس کی تین سلسلہ وار کہانیوں کا مجموعہ "گام ہای مسدود" ۱۹۸۲ میں شائع ہوا۔

۱۹۸۰ کی دہائی کے شروع میں خاکسار کو ایک بار پھر قید کیا گیا اور اس مختصر قید سے رہا ہوتے ہی وہ ایران سے یوروپ چلی گئی۔ خاکسار کے بعد کے دو مجموعے "قصری کوچی بیقرار و چہار پیرزن" (۱۹۸۸) اور "بقال خرزویل: مجموعہ داستان ہای تبعید" (۱۹۸۹) لاس اینجلس سے شائع ہوئے اور ایک اور مجموعہ "سورای کاراست" ۱۹۸۹ میں پیرس سے۔ خاکسار تارک وطن ایرانی ادیبوں کی انجمن کی مجلس عاملہ میں شامل ہے اور لندن سے شائع ہونے والے رسالے "فصل کتاب" میں اس کی تحریریں چھپتی رہتی ہیں۔ موجودہ شمارے میں شامل کہانی خاکسار کے مجموعے "گریک" سے لی گئی ہے۔

○ ○ ○

امین فقیری

امین فقیری ۱۹۴۴ میں شیراز میں پیدا ہوا۔ ۱۹۶۰ کی دہائی کے وسط میں وہ استاد اور سماجی کارکن کے طور پر اس رضاکار تنظیم میں شامل ہو گیا جو ایران کے دیہی علاقوں میں خواندگی بڑھانے کے سلسلے میں کام کر رہی تھی۔ اس نے کئی اور فارس صوبوں کے دیہات میں خدمات انجام دیں۔

فقیری نے انیس برس کی عمر میں لکھنا شروع کیا اور سترہ کہانیوں پر مشتمل اس کا پہلا مجموعہ "دہکدہ پرملال" ۱۹۶۹ میں شائع ہوا۔ اس مجموعے کی کہانیوں کو دیہی زندگی کی حقیقت نگار تصویرکشی کی بنا پر پذیرائی حاصل ہوئی۔ اس کے بعد فقیری کی کہانیوں کے متعدد اور مجموعے شائع ہوئے جن کے نام یہ ہیں:

Scanned with CamScanner

"کوچہ باغ ہای اضطراب" (۱۹۷۰)، "کوفیان" (۱۹۷۱)، "غم ہای کوچک" (۱۹۷۳)، "سیری در جذبہ و درد" (۱۹۷۳)، "سخن از جنگل سبز است و تبردار و تبر" (۱۹۷۹)، "دو چشم کوچک خندان" (۱۹۸۶)، "تمام باران ہای دنیا" (۱۹۸۸) اور "مویہ ہای منتشر" (۱۹۸۹)۔ فقیری نے دو ناول بھی لکھے ہیں جن کے نام "سشیری" اور "دف برای عروسی ہمسایہ" ہیں۔

○ ○ ○

منیرو روانی پور

منیرو روانی پور جس کا نام انقلاب کے بعد منظر عام پر آنے والے افسانہ نگاروں میں ممتاز ہے، ۱۹۵۴ میں شیراز کے ایک قریبی گاؤں جُنخرہ میں پیدا ہوئی۔ اس نے شیراز یونیورسٹی سے نفسیات کے مضمون میں تعلیم حاصل کی۔ منیرو کا پہلا مجموعہ "کنیزو" ۱۹۸۹ میں شائع ہوا اور اسی سال اس نے اپنا پہلا ناول "اہل غرق" بھی شائع کیا۔ اس کا دوسرا ناول "دل فولاد" ۱۹۹۰ میں شائع ہوا اور ۱۹۹۱ میں دوسرا مجموعہ "سنگہای شیطان" چھپا۔ اس کے بعد منیرو کی کہانیوں کا ایک اور مجموعہ "سیریا! سیریا!" اور ایک اور ناول "کولی کنار آتش" شائع ہو چکے ہیں۔ موجودہ شمارے میں شامل کہانی منیرو کے مجموعے "کنیزو" سے لی گئی ہے۔

آج

سالانہ خریداری

پاکستان
چار شماروں کی قیمت: ۲۰۰ روپے
آٹھ شماروں کی قیمت: ۳۵۰ روپے

بینک ڈرافٹ کے ذریعے رقم بھیجنے کے لیے پتا
B-140, Sector 11-B,
North Karachi Township, Karachi 75850

امریکا، کینیڈا، یوروپ اور مشرقِ وسطیٰ
چار شماروں کی قیمت: ۲۵ امریکی ڈالر
آٹھ شماروں کی قیمت: ۴۵ امریکی ڈالر

رقم بھیجنے کے لیے پتا
Dr Muhammad Umar Memon
5417, Regent Street,
Madison, Wisconsin 53705, USA.

Scanned with CamScanner

نیشنل بینک میں
رقم اور مُنافع
کا تحفّظ

روپے اور فارن کرنسی کے ڈپازٹس اور پُرکشش شرح منافع پر
حکومتِ پاکستان کی ضمانت۔ مستعد، ماہرانہ خدمات کے ساتھ
اندرون و بیرون ملک جدید شاخوں کا وسیع سلسلہ۔

آپ کی خدمت ہمارا افتخار

نیشنل بینک آف پاکستان

اعلیٰ خدمت مکمل تحفظ

ہیڈ آفس : آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی، پاکستان
Telephones: 2417989 - 2416781 - 10 lines Ext: 405
Fax: 2421236 - Telex: 23732 NBP PK

Scanned with CamScanner

قیمت: ساٹھ روپے

آج کی کتابیں
بی ۱۳۰، سیکٹر ۱۱ بی، نارتھ کراچی ٹاؤن شپ، کراچی ۷۵۸۵۰

تقسیم کار:
مکتبۂ دانیال صدر کراچی
تھامس اینڈ تھامس بک سیلرز صدر کراچی
کلاسیک شاہراہ قائداعظم لاہور
پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز [illegible] لاہور